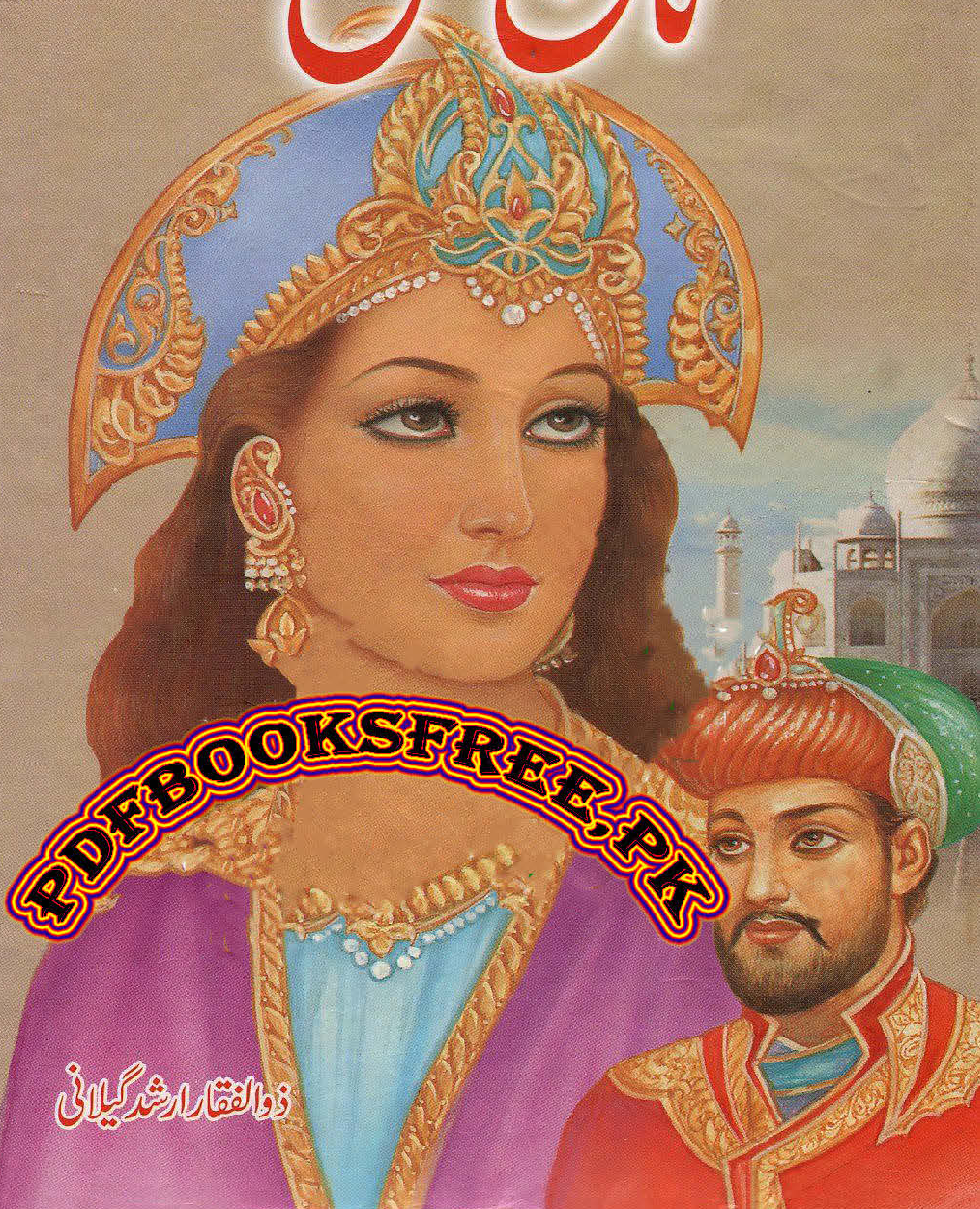


انمول چاہتوں اور بے غرض محبتوں کی حسین داستان

تاج محل

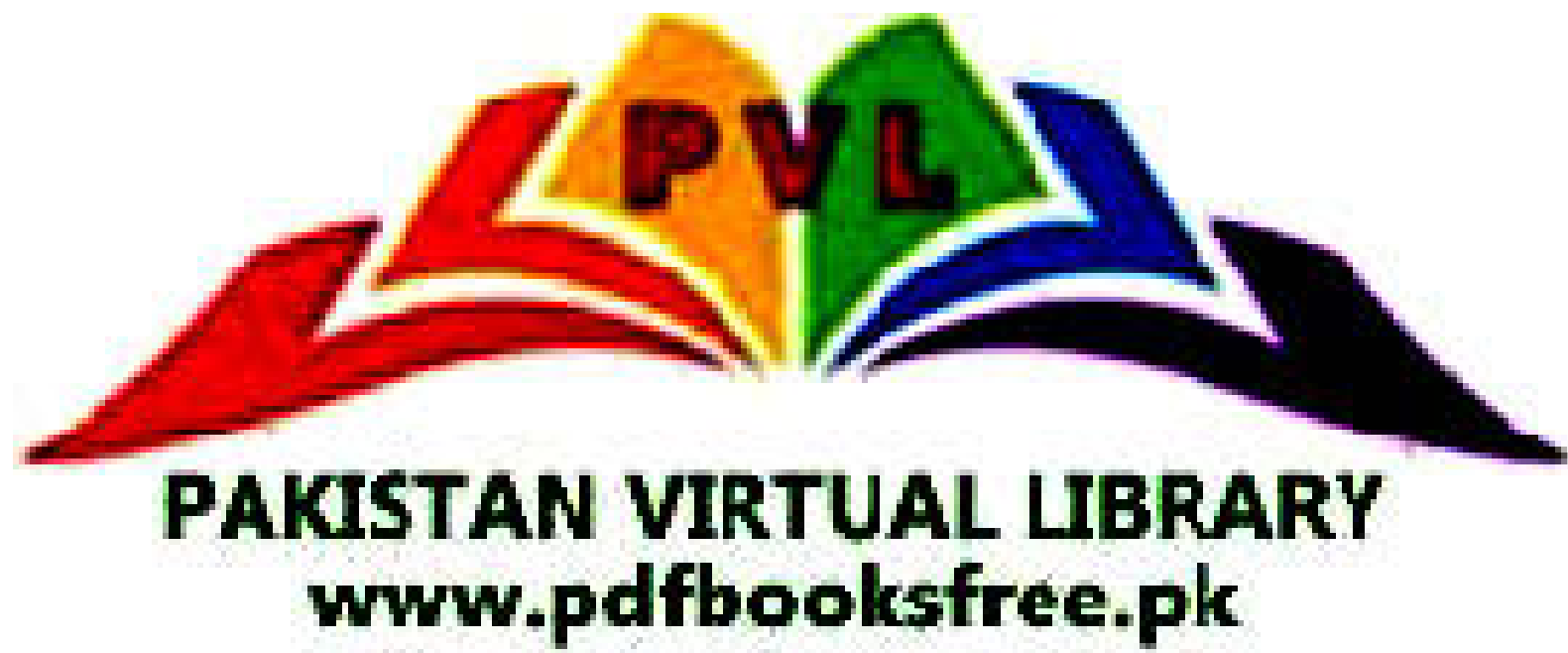


ذوالفقار ارشد گیلانی

انمول چاہتوں اور بے غرض محبتوں کی حسین داستان

سناج محل

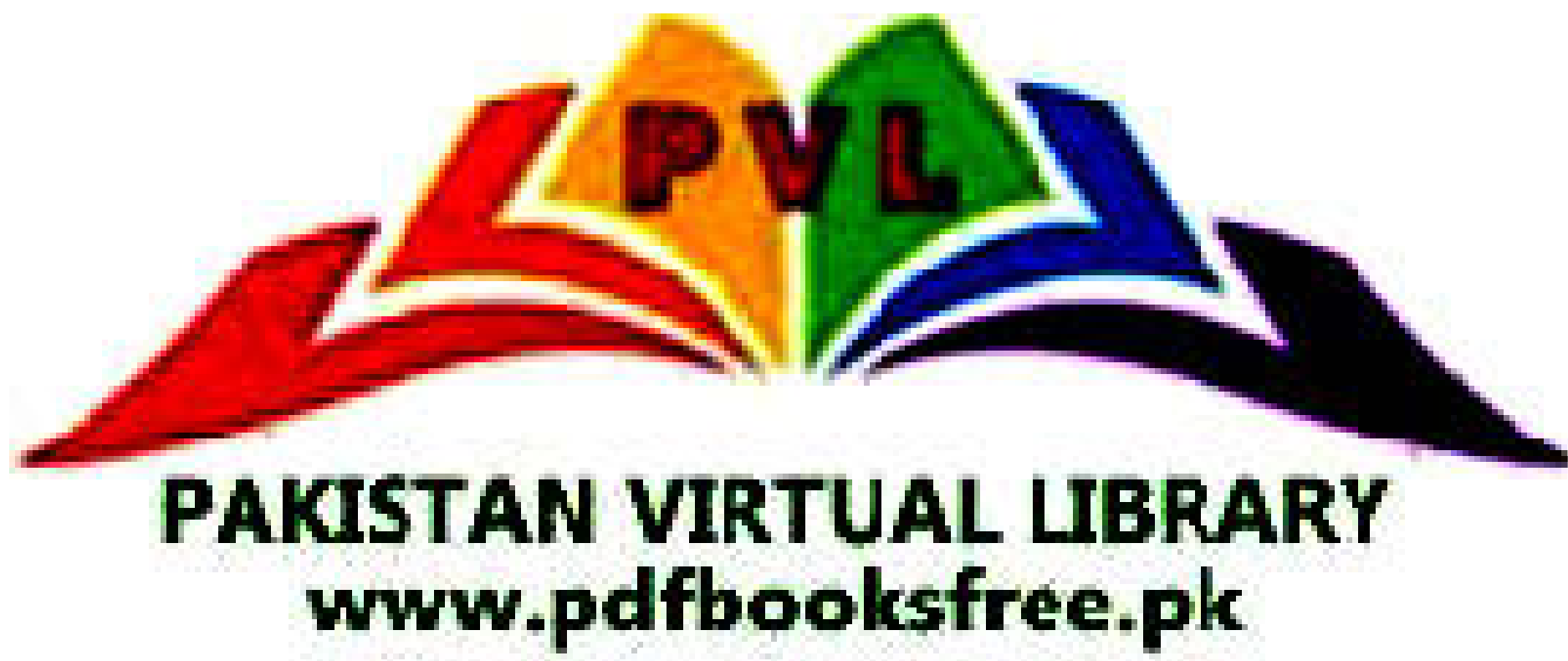
ذوالفقار ارشد گیلانی



علم دوست پبلیکیشنز

رحمن پلازہ، فرسٹ فلور، شاپ نمبر 12
اردو بازار (مچلی منڈی) لاہور 0300-4325121





انتساب
اُن محبتوں کے نام
جنہیں
”تاج محل“
نصیب نہیں!!!

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب : تاج محل
مصنف : ذوالفقار ارشد گیلانی
مطبع : نوید حفیظ پرنٹرز لاہور
اشاعت اول : اکتوبر 2008ء
قیمت : 250 روپے

رحمن پلازہ، فرسٹ فلور، شاپ نمبر 12
اردو بازار (مچلی منڈی) لاہور 4325121-0300



اللہ سب سے بڑا ہے

ناشر: خالد ڈوگر

علم دوست
پبلیکیشنز

ساحر بے شک تاج محل سے شاکی نظر آتے ہیں لیکن ان کی اپنی زندگی محبت سے خالی نہیں تھی اس لیے اُن کی اس نظم کو انقلابی شاعری کا محض ایک تسلسل قرار دیا جاتا ہے کیونکہ ساحر کے چاہنے والوں سمیت کسی نے بھی اُن کے اس مشورے پر عمل نہیں کیا جس سے بہ خوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ”تاج محل“ کی ”دنیاۓ محبت“ میں اہمیت و حیثیت کیا ہے۔

زیر نظر ناول بھی تاج محل اور اس کے کرداروں کے گرد گھومتا ہے۔ یہ 1607ء سے 1666ء تک کے انسٹھ سالوں کی کہانی ہے جس دوران اس محبت نے جنم لیا، پروان چڑھی اور پھر امر ہوئی۔ کہانی کے دو حصے اور چار راوی ہیں۔ ارجمند بانو، شہنشاہ شاہ جہاں (شہاب الدین اور شاہ جہاں) اور اُن کے ملازم خاص عیسیٰ نے اسے باری باری بیان کیا ہے۔ یہ تینوں ”محبت کے داستان گو ہیں“ جبکہ ”تاج محل“ کی تعمیر کی کہانی ”ممتاز محل“ کی روح نے سنائی ہے۔ داستان کی خوب صورتی یہ ہے کہ محبت اور اس کی یادگار کا آغاز ایک ساتھ ہوتا ہے جبکہ ایک جانب تاج محل مکمل ہوتا ہے اور دوسری جانب ملکہ ہند اپنے خالق حقیقی سے جا ملتی ہے۔

شاہ جہاں اور ممتاز محل کی محبت پر اس سے پہلے بھی درجنوں معرکتہ آراء اور ضخیم کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ ناول، زبان و بیان کے اعتبار سے اُن کا ہم سر نہ ہو لیکن یہ طے ہے کہ اسے پڑھتے ہوئے آپ خود کو اُسی عہد میں محسوس کریں گے۔

ناولوں اور کہانیوں میں چونکہ سن و سال نہیں ہوتے کیونکہ ان سے تسلسل اور روانی مجروح ہوتی ہے۔۔۔ اور میں ٹھہرا تاریخ کا طالب علم۔۔۔ سو بغیر زمانے کے۔۔۔ میری تسلی نہیں ہوتی۔ اس لیے شاہ جہاں اور ممتاز محل کے سوانحی خاکوں کے علاوہ تاج محل کا مختصر سا تعارف علیحدہ سے ناول میں شامل کر دیا گیا ہے تاکہ کہانی پڑھتے ہوئے بھی تاریخ کی قربت کا احساس رہے۔

امید ہے کہ ماضی کی طرح میرے قارئین۔۔۔ اس کوشش و کاوش کو شرف قبولیت بخشیں گے۔

یار زندہ، صحبت باقی پھر ملیں گے، اگر خدا لایا

ذوالفقار ارشد گیلانی

8۔ جون 2008ء

راولپنڈی

zulfiqargilani@gmail.com

جانب محبت ہی محبت بکھری نظر آتی ہے بس ضرورت اسے محسوس کرنے کی ہے۔ میاں محمد بخش نے اسے ”سیف الملوک“ کا نام دیا تو عبداللطیف بھٹائی نے ”سرسی اور سرسوئی کا“ پیلو نے اسے ”مرزا صاحبان“ کا عنوان دیا تو وارث شاہ نے اسے ”ہیرو سیتی“ بنا دیا۔ ہر راوی نے اسے اپنے اپنے انداز میں تحریر کیا اور امر ہو گیا۔

ایسے ہی مہمان میں سے ایک نام فخر کا بھی ہے جسے دنیا شہنشاہ شہاب الدین محمد شاہ جہاں کے نام سے جانتی ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ شاہوں کے دلوں میں محبتیں نہیں حکومتیں دھڑکتی ہیں۔ اُن کے دلوں میں محبوبائیں نہیں، سلطنتیں پنپتی ہیں لیکن شاہ جہاں نے اسے غلط کر دکھایا۔ اُس نے نہ صرف ارجمند بانو سے محبت کی اور اُسے ممتاز محل کا خطاب دے کر اپنی دل کی ملکہ بنایا بلکہ جب اُس کا انتقال ہوا تو ”تاج محل“ کی صورت اُس کی ایسی یادگار تعمیر کرائی جو چار سو سال گزرنے کے باوجود آج بھی محبت کی علامت کے طور پر قائم و دائم ہے۔

تاج محل دیکھنے اور اس کی بابت سننے اور پڑھنے والے ہر شخص نے اپنے اپنے انداز میں اس کی تعریف کی ہے۔ پاک و ہند کے نامور انقلابی شاعر ساحر لدھیانوی نے اپنی نظم تاج محل میں لکھا ہے۔

تاج ، تیرے لیے اک مظہرِ اُلفت ہی سہی
تجھ کو اس وادیِ رنگیں سے عقیدت ہی سہی
میری محبوب ! کہیں اور ملا کر مجھ سے
بزمِ شاہی میں غریبوں کا گزر کیا معنی
ثبت جس راہ پہ ہوں سطوتِ شاہی کے نشاں
اُس پہ اُلفت بھری روحوں کا سفر کیا معنی
آگے چل کر اسی نظم میں ساحر نے لکھا ہے۔

یہ چمن زار ، یہ جمننا کا کنارہ ، یہ محل
یہ منقش درودیوار، یہ محراب، یہ طاق
اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق
میری محبوب ! کہیں اور ملا کر مجھ سے

آسمان ہند۔۔۔۔۔ نے زمین کی کوکھ سے عجوبہ عالم تاج محل کا ظہور ہوتے دیکھا جسے
بانمیں ہزار سے زائد صناعتوں نے اپنی شب و روز کی محنتوں سے تراشا۔

تاج محل۔۔۔۔۔ جسے آج بھی محبتوں کی علامت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ شہنشاہ
شہاب الدین محمد شاہ جہاں اور اس کی محبوب ملکہ ارجمند بانو عالیہ ممتاز محل کی لافانی چاہتوں کی
حسین یادگار ہے۔

تاج محل۔۔۔۔۔ کو باضابطہ طور پر 2007ء میں جدید دنیا کے سات عجائبات میں شامل
کیا گیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ اپنی تعمیر کے دن سے ہی یکتائے روزگار ہے۔ اسے دیکھ کر
صرف یہ احساس ہوتا ہے کہ۔۔۔۔۔

حریم و دیر کے جھگڑے وہ سمجھے جس کو فرصت ہو

یہاں حد نظر تک صرف عنوان محبت ہے

تاج محل صرف محبت کی علامت ہی نہیں خوب صورتی اور دل کشی کا نادر نمونہ بھی ہے۔
عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اس عمارت کے جمالیاتی حسن کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔

تاج محل کے نام کے حوالے سے مختلف آرا پائی جاتی ہیں۔ عام خیال یہ ہے کہ نام
۔۔۔۔۔ شہنشاہ شاہ جہاں کی بیوی ممتاز محل سے منسوب ہے جبکہ انگریزی میں اس کا ترجمہ
Crown Palace کیا جاتا ہے۔ بنیادی طور پر یہ فارسی زبان کا لفظ ہے جو اس دور میں
مغلوں کی سرکاری اور درباری زبان تھی۔

بعض ذرائع کا کہنا ہے کہ تاج محل کا نام اس ہستی کے نام پر رکھا گیا ہے جو یہاں دفن
ہے۔ شاہ جہاں کی بیوی کا اصل نام ارجمند بانو تھا لیکن بادشاہ بننے کے بعد شاہ جہاں نے
اسے ممتاز محل کا خطاب دیا۔ لفظ۔ تاج۔ درحقیقت ممتاز کا ہی مخفف ہے جس کے ساتھ محل کا
اضافہ کر دیا گیا۔

متعصب ہندو، جو ہر مسلمان بادشاہ کے تعمیراتی شاہ کار کو ہندو ثقافت کی باقیات قرار
دینے میں ایک لحد ضائع نہیں کرتے۔ اگلے بات پر مصر ہیں کہ تاج محل کا نام بھی ہندو دیوتا شو
کے مندر تیجوماہیا کے نام سے مستعار لیا گیا ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ شاہ جہاں نے اس مندر
پر قبضہ کر کے اسے اپنی بیوی کا مقبرہ بنا دیا اور اسے تاج محل کی شکل دے دی۔

تاج محل

سرزمین ہند کے ماتھے کا جھومر

سرزمین مشرق، کرۂ ارض کا افتخار اور مرجع ضیاء و انوار ہے۔ آفرینش آدم یہاں سے
ہوئی۔ انسانی تہذیب نے اس کی کوکھ سے جنم لیا۔ تمدن نے اس کی گود میں پرورش پائی۔
پیغمبران عظام اور اولیائے کرام اسی سرزمین پر اُتارے گئے۔ بڑے بڑے باجبروت
شہنشاہوں، بادشاہوں، سربراہوں اور فرماں رواؤں کا مسکن ہونے کا شرف اسی دھرتی کو
حاصل رہا۔

اس نے انسان کے عروج کا سورج طلوع ہونے، اس کے نصف النہار پر آنے اور
پھر غروب ہونے کا عبرت ناک نظارہ بھی کیا۔ بہت سی سلطنتیں، قلم روئیں، حکومتیں اور
بادشاہتیں اس کے وقار کا باعث رہیں۔ عظیم تر مغلیہ سلطنت۔۔۔۔۔ اسی سرزمین مشرق کا
غرور اور برصغیر میں مسلمانوں کی شان دار روایات کی مظہر تھی۔

آسمان ہند۔۔۔۔۔ نے اسی سرزمین پر ساڑھے تین سو سال تک مغلیہ شہنشاہوں کو سریر
آرائے سلطنت دیکھا۔ ظہیر الدین محمد بابر، نصیر الدین محمد ہمایوں، جلال الدین محمد اکبر،
نور الدین محمد جہانگیر، شہاب الدین محمد شاہ جہاں، ابو محی الدین محمد اورنگ زیب اور ان کے
جانشینوں کا عروج و زوال دیکھا۔ انہیں دھرتی کے سینے کو اپنی محنتوں کے نذرانوں سے سجاتے
اور محبتوں سے سینچتے دیکھا۔

آسمان ہند۔۔۔۔۔ ہمایوں اور حمیدہ بیگم۔۔۔۔۔ جہانگیر اور نور جہاں۔۔۔۔۔ اور شاہ
جہاں اور ممتاز محل کی انمول چاہتوں اور بے غرض محبتوں کا گواہ بھی رہا۔

بھارتی ریاست اتر پردیش کے شہر آگرہ کے مضافات میں، دریائے جمنا کے کنارے مکمل طور پر سنگ مرمر کی شاہکار اور تاج محل کے نام سے پکاری جانے والی اس عمارت کی تعمیر کا آغاز 1631ء میں ہوا اور اس کی تکمیل میں بائیس سال سے زائد کا عرصہ لگا۔ بعض تاریخ نگاروں نے اس کا سن تعمیر 1653ء تحریر کیا ہے تاہم کہا جاتا ہے کہ تاج محل کی تعمیراتی کام اس کے بعد بھی جاری رہا۔

خالص اسلامی اور ایرانی انداز میں تعمیر ہونے والی دنیا کی اس خوب صورت ترین عمارت پر بتیس کروڑ روپے یعنی اڑسٹھ ہزار امریکی ڈالر لگاتے آئی۔ استعمال ہونے والا سنگ مرمر بھارت کے علاوہ جنوبی ایشیا کے مختلف حصوں سے منگوا یا گیا۔ بیس سے بائیس ہزار افراد نے اپنی صلاحیتیں، ایک سوچ کو مجسم شکل دینے میں دن رات کی پروا کے بغیر صرف کیے جبکہ ایک ہزار سے زائد ہاتھی عمارتی سامان کو تاج محل کی جگہ تک پہنچانے کے لیے استعمال کیے گئے۔

تاج محل کی اہمیت اور شہنشاہ شاہ جہاں کی اس سے دل چسپی کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اس کی اندرونی سجاوٹ اور تزئین و آرائش میں اٹھائیس مختلف اقسام کے زور جو اہر اور قیمتی پتھر استعمال کیے گئے۔

محبت کی یہ علامت آج سات عجائبات عالم کے علاوہ یونیسکو ورلڈ ہییریٹیج سائٹس میں شامل ہے۔

تاج محل کی مرکزی عمارت ایک وسیع و عریض باغ کے آخری سرے پر واقع ہے جبکہ تاج محل کمپلکس --- پانچ حصوں پر مشتمل ہے جنہیں دروازہ، باغیچہ، مسجد، نقار خانہ اور روضہ کے نام دیئے گئے ہیں۔

تاج محل کا داخلی دروازہ، عظیم الجثہ گنبد والی مرکزی عمارت کے ساتھ طویل نہر کے آخری سرے پر واقع ہے۔ تاج محل کی عمارت کی ایک جانب مسجد ہے جبکہ دوسری جانب غالباً عمارت میں توازن پیدا کرنے کے لیے نقار خانہ تعمیر کیا گیا ہے۔

تاج محل کی مرکزی عمارت ایک بلند چوڑے پر بنائی گئی ہے جس کے چاروں کونوں پر چوکور چھوٹے موجود ہیں۔ عمارت کو اس طرح تعمیر کیا گیا ہے کہ اس کے تمام حصے مرکزی

عمارت سے متصل اور ملحق ہونے کے باوجود الگ اور علیحدہ شناخت کے حامل نظر آئیں۔ تاج محل کے ڈیزائن، لے آؤٹ اور تعمیر میں جیومیٹری اور ریاضی کے اصولوں کو مکمل طور پر مد نظر رکھا گیا ہے۔ اس کے چاروں میناروں کی بلندی 162.5 فٹ رکھی گئی ہے تاکہ اس کا 58 فٹ قطر اور 213 فٹ کی بلندی کا حامل عظیم الشان گنبد اور اس کے ساتھ متعلقہ چار چھوٹے گنبد واضح اور منفرد نظر آئیں۔ تاج محل کے اس وسیع گنبد کے نیچے شاہ جہاں اور ممتاز محل کی قبریں ہیں۔ دونوں قبریں تہ خانے میں ہیں اور ان کے عین اوپر مرکزی دالان میں نقلی تعویذ بنائے گئے ہیں جو مغلیہ مقابر کا منفرد اور دیرینہ انداز رہا ہے۔ اس دالان میں روشنی کے لیے سنگ مرمر کی جالیاں نصب کی گئی ہیں۔

اس عمارت میں شاید ایک کے سوا کوئی سقم نہیں اور دل چسپ بات یہ ہے کہ وہ اکلوتا سقم بھی اسی شخصیت کا پیدا کردہ ہے جو اس شان دار عمارت کا معمار ہونے کے ناتے اسے روئے زمین پر سب سے منفرد اور دل کش بنانے کا خواہش مند تھا۔

تاج محل --- ایک ہستی یعنی ممتاز محل کی قبر کے لیے ڈیزائن کیا گیا تھا لیکن بعد میں شہنشاہ اورنگ زیب کے حکم پر --- شہنشاہ شاہ جہاں کو بھی اس کی محبوب بیوی کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔ گو اس تدفین میں خود شاہ جہاں کی خواہش کا کوئی عمل دخل نہ تھا لیکن یہ بھی طے ہے کہ اس سے تاج محل کی تعمیراتی حسن اور امتزاج --- عدم توازن کا شکار ہوا۔

تاج محل کی چھت کی اندرونی جانب کو سجانے کے لیے خطاطی کا سہارا لیا گیا ہے۔ قرآن مجید کی آیات کریمہ کو سنگ مرمر پر زبر جریا سنگ یشب کی مدد سے کندہ کیا گیا ہے۔ انہیں ایرانی نژاد خطاط امانت خان نے خط ثلث میں تحریر کیا ہے۔ ایسی کئی سلوں پر امانت خان نے اپنے دستخط بھی ثبت کیے ہیں۔

تاج محل میں جن سورتوں کی آیات کندہ کی گئی ہیں ان کے نام یہ ہیں۔

سورہ 91۔ سورہ الشمس

سورہ 112۔ سورہ الاخلاص

سورہ 89۔ سورہ الفجر

سورہ 93۔ النبی

کی تعمیر پر ہندوانہ رنگ غالب ہے۔

تاج محل کا دوسرا اہم ترین حصہ مسجد ہے جسے تاج کی مغربی سمت سرخ پتھر سے تعمیر کیا گیا ہے۔ اسے چونکہ نماز کے لیے بنایا گیا تھا اس لیے قدرتی طور پر اس کا رخ مغرب کی جانب ہے۔ مسجد کے کنوئیں کی نزدیکی چار دیواری کے ساتھ ایک چھوٹا سا سنگی احاطہ ہے جہاں مرکزی روضے میں تدفین سے پہلے ملکہ ممتاز محل کا جسد خاکی رکھا گیا تھا۔ مسجد کے چار ہشت پہلو مینار اور تین شان دار گنبد ہیں۔

مسجد کا چمک دار فرش ایسے مواد سے بنایا گیا ہے جو بہ ظاہر سرخ ریشم جیسا ہے اور اس میں پانچ سو انتالیس نمازیوں کی گنجائش ہے۔ مسجد کی اندرونی سمت اللہ تعالیٰ کے اسمائے ربانی اور قرآنی آیات کی خطاطی کی گئی ہے۔ اس کے عین مقابل اس مسجد کی ایک ہو بہو نقل بھی تعمیر کی گئی ہے لیکن اس میں کبھی نماز ادا نہیں کی گئی۔

اصل تاج محل ملکہ ممتاز محل کا وہ روضہ ہے جو مرکزی داخلی دروازے سے نو سو فٹ کے فاصلے پر تاج کے دل کش اور دل فریب باغ کے مقابل دو سو فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ تاج کے نیچے سرخ پتھر سے بنا وسیع و عریض چبوترہ ہے جسے ہموار زمین کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے اوپر سنگ مرمر کی ایک اور شہ نشین ہے جس پر اس عظیم الشان مقبرے کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ سنگ مرمر کے اس چبوترے کے چاروں کونوں پر 138 فٹ بلند مینار ہیں جن کے قبوں میں آٹھ آٹھ کھڑکیاں ہیں۔

تاج محل کا اندرونی حصہ بھی بیرونی حصے سے کم خوب صورت نہیں۔ تمام اندرونی ایوانوں کو بھی شان دار اور بے مثال خطاطی سے سجایا گیا ہے۔ مقبرے کے تمام اندرونی زاویے ہشت پہلو اور یکساں سائز کے ہیں۔ دیواروں کے نچلے حصوں پر علیحدہ قسم کا پلاستر کیا گیا ہے اور انہیں بھی دل کش نیل بوٹوں کے علاوہ کنول کے پھولوں سے سجایا گیا ہے۔

روضے کا وسطی کمرہ باقی کمروں سے نسبتاً بلند ہے۔ اس سے متصل لیکن اس سے قدرے نیچے چار اور ہشت پہلو کمرے موجود ہیں جو یقیناً شاہی خاندان کے دیگر افراد کی قبروں کے لیے بنائے گئے تھے۔ وسطی کمرے میں پہلو بہ پہلو دو قبریں ہیں جن میں سے ایک شہنشاہ شہاب الدین شاہ جہاں اور دوسری ملکہ ممتاز محل کی ہے۔ شاہ جہاں کی قبر اپنی محبوبہ

سورہ 95۔ سورہ التین

سورہ 94۔ سورہ الشرح

سورہ 36۔ سورہ یاسین

سورہ 81۔ سورہ التکویر

سورہ 82۔ سورہ الانفطار

سورہ 84۔ سورہ الاشفاق

سورہ 98۔ سورہ البینۃ

سورہ 67۔ سورہ الملک

سورہ 48۔ سورہ الفتح

سورہ 77۔ سورہ المرسلات

سورہ 39۔ سورہ الزمر

تاج محل کا دروازہ 93 فٹ بلند ہے اور یہ 1632ء سے 1638ء کے دوران پایہ تکمیل کو پہنچا۔ یہ تاج محل کے پانچ اہم حصوں میں سے ایک ہے۔ ہندوانہ تصورات سے متاثر یہ عظیم الشان دروازہ محراب کی صورت۔ اصل، عمارت کی نصف بلندی تک اونچا ہے۔ اسے سنگ سیاہ سے تعمیر کیا گیا ہے اور اس پر مختلف قرآنی آیات کندہ ہیں۔ دروازے کی اندرونی سمت کئی طاق ہیں جن میں پھول چٹاں اور نقش و نگار بنائے گئے ہیں۔ ان میں زیادہ تعداد کنول کے پھولوں کی ہے جنہیں سنگ مرمر پر قیمتی پتھروں کی مدد سے تراشا گیا ہے۔

دروازے کو مزید خوب صورت بنانے کے لیے بڑے طاق کی بالائی سمت آنسو کا سفید قطرہ تراشا گیا ہے جس میں سرخ رنگ کا ایک ترشول بھی بنایا گیا ہے۔ سامنے کی سمت واقع یہ بلند دروازہ۔ تاج محل کی تعمیر کے دوران بھی داخلے کا مرکزی ذریعہ تھا۔

ہندو مصنفین اور ماہرین کا دعویٰ ہے کہ دروازے میں بنے ہوئے تمام طاق ہندوانہ طرز کے ہیں۔ یہ تمام پھول، بیللیں اور چٹاں بیچ دار انداز میں محض خوب صورتی کے لیے بنائی گئیں ہیں اور ان میں جیومیٹری یا ریاضی کے اصولوں کا کوئی عمل دخل نہیں۔ سرخ رنگ کا کنول کا پھول ہندو یوتا رہا کا امتیازی نشان ہے اس لیے ان ماہرین کا کہنا ہے کہ تاج محل

کی قبر کے بائیں جانب اور قدرے بلند ہے۔ دونوں قبروں کے کتبے فارسی زبان میں تحریر کیے گئے ہیں جبکہ ممتاز محل کی قبر پر بعض قرآنی آیات بھی کندہ ہیں۔

وسطی کمرے کی چھت کے ساتھ ایک نفیس فانوس آویزاں ہے لیکن کہا جاتا ہے کہ اسے جلانے کی نوبت کبھی نہیں آئی۔ قبروں کے اطراف میں بھی سنگ مرمر کی نازک جالیاں نصب ہیں جن میں قیمتی پتھر جڑے گئے تھے۔

تاج محل کمپلکس کی ایک اور اہم عمارت نقار خانہ ہے۔۔۔۔۔ تاج محل کی مسجد کے عین سامنے، تاج کی مشرقی جانب ایک یادگار واقع ہے جسے جڑواں مسجد بھی کہا جاتا ہے۔ سرخ پتھروں سے بنی اس عمارت کو نقار خانہ، تاج محل ریٹ ہاؤس یا جواب کے ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ مسجد کے برعکس، اس کا رخ خانہ کعبہ کی طرف نہیں۔ اسے عین مسجد سے مشابہ تعمیر کیا گیا ہے لیکن آج تک اس میں کبھی نماز ادا نہیں کی گئی اور نہ ہی تاج محل کے ساتھ اس کے مصرف تعمیر کے بارے میں کوئی اندازہ لگایا جاسکا ہے۔

تاہم بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اسے محض تاج محل کی تعمیر میں یکسانیت اور توازن پیدا کرنے کے لیے تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کے در و دیوار پر بھی سنگ مرمر سے نقش و نگار بنے ہوئے ہیں۔ مسجد اور نقار خانے کے درمیانی حصے کا فرش اس قدر شفاف ہے کہ اس میں پورے تاج محل کا عکس دکھائی دیتا ہے۔

تاج محل کا پانچواں اور آخری اہم ترین جزو۔۔۔۔۔ اس کے باغات ہیں۔ ایرانی انداز میں بنے ہوئے وسیع باغ کو چار مساوی حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے جن کے وسط میں دو نہریں بہتی ہیں۔ کیاریوں کی مجموعی تعداد سولہ ہیں جن میں سدا بہار پھولوں کے علاوہ بعض پھل دار درخت بھی لگائے گئے ہیں۔

تاج محل کا باغ داخلی دروازے سے تاج کی بنیادوں تک پھیلا ہوا ہے۔ پھولوں، پھلوں، پرندوں، چوں اور توازن و یکسانیت کے ساتھ باغات لگانے کا ایرانی انداز ہندوستان میں شہنشاہ ظہر الدین بابر نے متعارف کرایا تھا۔ ان باغات کو ریاضی کے اصولوں کے تحت آباد کیا گیا اور ان میں قدرتی منظر کشی کی کوئی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ ایسے باغات کے علاوہ تاج محل کے باغ میں استعمال کیا جانے والا سب سے اہم عنصر ”چار“ کا ہندسہ ہے۔

چار کا عدد، اسلام میں بھی نہایت اہم حیثیت حاصل ہے چنانچہ تاج محل کے باغ کو بھی چار باغ کی ترکیب پر ہی لگایا گیا۔ باغ چار حصوں میں تقسیم ہے اور ان کے وسط میں سنگ مرمر کی دو نہریں ہیں جن میں جگہ جگہ فوارے نصب ہیں۔ ہر حصے کو مزید سولہ باغیچوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ انہیں ایک دوسرے سے علیحدہ کرنے کے لیے پتھر کی روشیں تعمیر کی گئی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ابتداء میں ہر باغیچے میں چار سو پودے لگائے گئے تھے۔

باغ میں لگائے جانے والے بے پھل پودے موت اور پھل دار درخت، زندگی کی علامت تھے اور انہیں لگانے میں بھی ایک خاص ترتیب کو مد نظر رکھا گیا تھا۔ تاج محل، باغ کے وسط کے بجائے، اس کے شمالی کونے پر ہے درحقیقت باغ کے وسط میں، تاج اور مرکزی داخلی دروازے کے درمیان میں، ایک بلند حوض ہے جس کے پانی میں پورے تاج محل کا عکس دکھائی دیتا ہے۔

تاج محل کو پانی کی فراہمی کا نظام بھی کسی عجوبے سے کم نہیں۔ ماہرین تعمیرات نے اس نظام کو نہایت مہارت اور ہنرمندی سے ڈیزائن کیا ہے۔ تاج محل کا پانی دریا سے کھینچا جاتا تھا اور اسے کئی زیر زمین پائپوں کے ذریعے تاج تک لایا جاتا تھا۔ دریا سے پانی کھینچنے اور وہاں سے اسے بڑے بڑے اسٹوریج ٹینکس میں منتقل کرنے کے لیے پور (بیلوں کے ذریعے رسی اور مشکیزے سے پانی بھرنا) کا استعمال کیا جاتا تھا۔ اس تالاب سے پانی نکالنے کے لیے تیرہ مزید پورا استعمال کیے جاتے تھے۔ یہاں سے ایک بالائی پائپ لائن کے ذریعے پانی کو ایک اور تالاب میں پہنچایا جاتا تھا۔

اس تالاب سے پانی نکالنے کا کام مزید چودہ پورا انجام دیتے۔ ایک اور ذیلی نہر کے ذریعے یہ پانی تین تالابوں میں منتقل کیا جاتا۔ ان میں سے آخری تالاب کے پائپ اس کی مشرقی دیوار میں نصب تھے۔ یہی پائپ زیر زمین سے تاج میں داخل ہوتے۔ ان میں سے ایک مسجد کے فواروں کو پانی فراہم کرتا جبکہ شمالاً جنوباً نہر اور کنول کے پھول سے مشابہ بڑے حوض کو تانے کے پائپوں کے ذریعے پانی پہنچایا جاتا۔

فواروں میں پانی کے دباؤ کو یکساں رکھنے کے لیے، ہر فوارے کے پائپ کے نیچے تانے کا ایک برتن لگایا گیا تھا۔ پانی پہلے اس برتن میں جمع ہوتا اور پھر ایک ساتھ فوارے کے

کھنڈرات بھی شامل کیے جاتے۔ یعنی اس کا مطلب یہ ہوا کہ دریا پار کے کھنڈرات بھی تاج محل کمپلکس کا حصہ تھے اور تاج کے باغات دریا کے دوسری جانب بھی پھیلے ہوئے تھے لیکن دیکھ بھال نہ ہونے کے باعث یہ کھنڈرات میں تبدیل ہو گئے۔

تاج محل کے بارے میں ایک اور کہانی یہ ہے کہ دنیا میں محبت کی یہ منفرد اور شان دار یادگار رفتہ رفتہ زمین میں دھنس رہی ہے۔ دریا کے جنما کے عین کنارے واقع اس بھاری بھر کم عمارت کی تعمیر میں ہر ممکن احتیاط مد نظر رکھی گئی۔ اس کے ماہرین نے تاج محل کی پائیداری کے لیے تمام اقدامات کیے تھے۔ ماہرین تعمیرات نے اس کے ہزاروں ٹن وزن کو مخصوص انداز میں نہ صرف تقسیم کیا بلکہ تعمیر کے لیے مضبوط ترین سامان بھی استعمال کیا لیکن اسے کیا کہیے کہ تمام تراحتیاط کے باوجود تعمیر کے محض چار سال بعد ہی اس میں بعض خفیف سی دراڑیں پائی گئیں۔

جب اورنگ زیب کو 1652ء میں تحریر کردہ خطوط کے ذریعے ان کی بابت بتایا گیا تو اُس نے فوری طور پر اس کی مرمت کے احکامات جاری کیے۔ 1810ء میں ایک مرتبہ پھر تاج محل میں بعض دراڑوں کا انکشاف ہوا۔ اس مرتبہ ان کی نوعیت زیادہ خطرناک اور سنجیدہ تھی۔ اس یادگار کے تحفظ اور اس کی تزئین و آرائش کے لیے باقاعدہ ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ انکشاف ہوا کہ تاج محل کی شمالی جانب۔۔۔ جنوبی جانب کی نسبت تقریباً دو انچ (3.5 سنی میٹر) دریا کی طرف جھک گئی ہے۔

تاج کا بیرونی حصہ تو محفوظ تھا لیکن اس کی دوسری منزل اور شمالی طرف کے تہ خانوں میں دراڑوں کا پتا چلا۔ ماہرین کے مطابق ان ہلکی سی دراڑوں کی دو وجوہات ہو سکتی تھیں۔ ممکن ہے کہ تاج میں استعمال ہونے والے بھاری سنگ مرمر کی وجہ سے، اس کی سلوں کو آپس میں پیوست کرنے والا چونا دب گیا ہو اور تاج دریا کی سمت جھکنے لگا ہو۔ دھنستے ہوئے تاج کو اُس وقت زیادہ شہرت ملی جب کمزور حصوں سے اس کا وزن منتقل کرنے اور بانٹنے کی تجویز پیش کی گئی۔

اسی طرح تمام تر خوب صورتی، دل کشی اور انفرادیت کے باوجود مصنفین اور محققین۔۔۔ تاج محل کے عدم توازن کو نظر انداز کرنے کے لیے تیار نہیں۔ یہ عدم توازن شاہ جہاں کی

تمام سوراخوں سے باہر نکلتا۔ ان تمام پائپوں کو زمین کے اندر بچھایا گیا تھا۔ دل چسپ امر یہ ہے کہ طویل عرصہ گزرنے کے باوجود تاج محل کو پانی فراہم کرنے والے تمام آلات نہ صرف آج بھی موجود بلکہ قابل استعمال ہیں۔

روایت ہے کہ ہر خسن، اپنے اندر درجنوں داستاںیں سموئے ہوتا ہے۔ حسین و جمیل تاج محل کے ساتھ بھی یہی صورت درپیش ہے۔ اس کے ساتھ بھی کئی افسانے اور کہانیاں وابستہ ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی تاریخی اعتبار سے درست ثابت نہیں ہو سکی۔۔۔۔۔ البتہ ان سے لوگوں کے تجسس میں اضافہ ضرور ہوا ہے۔ اور وہ ان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کی کوششوں میں مصروف رہتے ہیں۔

سب سے زیادہ زبان زد عام افسانہ سیاہ تاج محل کا ہے۔

یہ وہ تاج محل ہے جسے موجودہ تاج محل کی طرز پر، ہو بہو اس کی نقل کی صورت دریا کے جنما کے دوسرے کنارے اس کے عین مقابل تعمیر کیا جانا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ شاہ جہاں نے یہ مقبرہ اپنے لیے تعمیر کرانے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اسے سیاہ تاج محل کا نام دیا جانا تھا کیونکہ اسے موجودہ تاج محل کے سنگ سفید کے برعکس سیاہ سے تعمیر کیا جانا تھا۔ اس افسانے کو بیان کرنے والوں کا استدلال یہ ہے کہ اسے محض اس وجہ سے تعمیر نہ کیا جاسکا کیونکہ شاہ جہاں کے بیٹے اورنگ زیب عالمگیر نے اُسے معزول کر کے قید میں ڈال دیا تھا۔

بعض لوگوں نے سیاہ تاج محل کی موجودگی کی گواہی بھی دی ہے چنانچہ بہت سے ذہنوں میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا سیاہ تاج محل کا واقعی کوئی وجود تھا۔ اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ دریا کے پار سیاہ پتھروں سے بنے ہوئے ایک عمارتی ڈھانچے کے کھنڈرات پائے گئے ہیں۔ بعد کی تحقیق سے ثابت ہوا کہ یہ وہ سنگ مرمر تھا جو عمارت کی تعمیر میں استعمال نہ ہو سکا اور بے کار پڑا رہا۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس کی رنگت سیاہ ہو گئی۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ استعمال شدہ سنگ مرمر تھا لیکن اس کی رنگت سفید نہ تھی چنانچہ بعد میں گہری ہو کر یہ سیاہی میں تبدیل ہو گئی۔

کچھ ذرائع یہ تو جہیہ پیش کرتے ہیں کہ مغلیہ باغ اور ان سے متصل باغ ہمیشہ ”کراس“ کا نشان بناتے تھے اور یہ جمع کا نشان اسی صورت مکمل ہوتا تھا جبکہ اس میں دریا پار کے

اس دعوے کی وجہ یہ رہی ہو کہ تاج محل کا نام اس قدیم مندر کے نام سے مشابہ ہے۔

اس دعوے کا سب سے بڑا پرچارک بھی پروفیسر پی این اوک ہی ہے جس نے اپنی تصنیف ”تاج محل۔۔۔ دی ٹرو اسٹوری“ میں یہاں تک لکھ دیا ہے کہ ممتاز محل یہاں دفن ہی نہیں۔ اس کے مطابق تاج محل کے بارے میں زبان زد عام افسانے محض اس کی اصلیت اور حقیقت کی پردہ پوشی کے لیے گھڑے گئے ہیں۔ اپنے دعوے کو سچ ثابت کرنے کے لیے اُس نے عدالت میں درخواست دائر کی کہ تابوت کھولا جائے اور تاج محل کی پٹلی بنیادوں کی کھدائی کرائی جائے۔۔۔ لیکن عدالت نے اس کی درخواست مسترد کر دی۔

جس دور میں برصغیر پر انگریزوں کی حکمرانی تھی، ایک افواہ زور و شور سے پھیلانی گئی کہ تاج محل کو منہدم کیا جا رہا ہے۔ اکثر و بیشتر انگریز گورنر لارڈ ولیم بنٹی نک کے حوالے سے کہا گیا کہ وہ تاج محل گرانے کا منصوبہ بنائے بیٹھا ہے۔ اُس کی خواہش تھی کہ مقبرے میں استعمال ہونے والے سنگ مرمر کو نکال کر نیلام کر دیا جائے۔ یہاں تک کہا گیا کہ تاج محل کے انہدام کے لیے ایک مخصوص گروہ بھی تیار کر لیا گیا۔

لیکن بعد ازاں یہ منصوبہ ترک کر دیا گیا اور اس کی وجوہات یہ بیان کی گئیں کہ گورنر آف انڈیا لارڈ ولیم بنٹی نک کے پاس اس مقصد کے لیے وافر فنڈ دستیاب نہ تھے۔۔۔ ان افواہوں کے برعکس لارڈ بنٹی نک کے سوانح نگار جان روسلی کا کہنا ہے کہ یہ کہانی محض اس لیے گھڑی گئی کہ لارڈ بنٹی نک، قلعہ آگرہ کے فالتو سنگ مرمر کو فروخت کرنے کا خواہاں تھا۔۔۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انگریزوں کی جانب سے تاج محل گرائے جانے کے منصوبے کی کبھی واضح طور پر تردید نہیں کی گئی۔

تاج محل سے منسوب افسانوں کے برعکس اس کہانی میں حقیقت بہر حال موجود ہے کہ تاج محل میں بڑے پیمانے پر چوری کی وارداتیں ہوئی ہیں اور بہت سی ایسی اشیاء اب وہاں موجود نہیں جو کبھی اس نابغہ روزگار عمارت کا حصہ ہوا کرتی تھیں۔ یہ درست ہے کہ بہت سی قیمتی اشیاء وہاں سے ہٹائی گئی تھیں لیکن چوریوں کا معمار اب تک حل نہیں ہو سکا۔ تاج محل کی وہ اشیاء جن کے بارے میں شبہ ہے کہ انہیں چرایا جا چکا ہے ان میں درج ذیل قیمتی زرد جواہر بھی شامل تھے۔

قبر کے بعث پیدا ہوا۔ عدم توازن کا یہ افسانہ شاہ جہاں کی موت اور اورنگ زیب کے احکامات پر تاج محل میں اس کی تدفین سے منسلک کیا جاتا ہے۔

کہنے والے کہتے ہیں کہ اورنگ زیب نے شاہ جہاں کا علیحدہ مقبرہ تعمیر کرانے کے بجائے جان بوجھ کر اسے تاج محل میں ارجند بانو کے پہلو میں سپرد خاک کر دیا اور یہ صرف اور صرف تاج محل کی خوب صورتی کو داغ دار کرنے اور اس کے توازن کو بگاڑنے کے لیے کیا گیا۔

اس بارے میں یہ استدلال پیش کیا جاتا ہے کہ اسلام میں زندگی اور موت کے حوالے سے نمود و نمائش کی سختی سے ممانعت کی گئی ہے۔ اورنگ زیب چونکہ ایک کٹرنڈ ہی شخص تھا اس لیے اُس نے قرآنی تعلیمات کے عین مطابق جاہ و حشم کی حوصلہ شکنی کی۔ اسی وجہ سے اپنے والد کی طرف سے اپنی محبوب ماں کا مقبرہ تعمیر کیے جانے کو اُس نے کبھی پسندیدگی کی نگاہ سے نہ دیکھا۔۔۔ چنانچہ جب شاہ جہاں کا انتقال ہوا تو اُس نے یہ سوچے بغیر کہ اس سے مقبرے کی خوب صورتی متاثر ہوگی۔۔۔ بادشاہ کی یہیں تدفین کے احکامات دیے۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ تاج محل کا اندرونی حصہ قدرے غیر متوازن ہے۔

تاج محل سے وابستہ کہانیوں میں سے ایک، اس کے راجپوت محل ہونے سے متعلق بھی ہے۔ بہت سے لوگ خصوصاً ہندو بنیاد پرست، اس امر پر یقین رکھتے ہیں کہ تاج محل، شاہ جہاں نے تعمیر نہیں کرایا۔

اُن کا پختہ خیال ہے کہ یہ ایک راجپوت محل تھا جسے چوتھی صدی عیسوی میں تعمیر کرایا گیا تھا۔ شاہ جہاں نے اس پر قبضہ کر لیا اور ضروری تبدیلیوں کے ساتھ اسے تاج محل میں تبدیل کر دیا۔ ان میں سے ایک نئی دہلی کا پروفیسر پی این اوک ہے جس نے اپنی کتاب میں اس خود ساختہ دعوے کا باقاعدہ تذکرہ کیا ہے۔۔۔ لیکن اس امر کے تاریخی شواہد دستیاب نہیں کہ تاج محل کبھی کوئی راجپوت محل تھا۔

اسی طرح متعصب ہندوؤں کا ایک ٹولہ۔۔۔ تاج محل کو ہندو دیوتا کا قدیم مندر قرار دیتا ہے۔ ان کے مطابق آج کا تاج محل۔۔۔ عہد قدیم میں شودیوتا کا مندر تھا۔ اس کا نام ”تیجوبھلا“ تھا لیکن شاہ جہاں نے اس پر قبضہ کر کے اسے تاج محل کی شکل دے ڈالی۔ شاید

یادگار عمارتیں تعمیر کرائیں جن میں سے اپنی بیوی ارجمند بانو بیگم (ممتاز محل) کے لیے تعمیر کرائے جانے والے تاج محل نے عالمی شہرت حاصل کی۔ آگرہ کی موتی مسجد، دہلی کی جامع مسجد اور محل کا شمار بھی اس کے عہد کی نادر تعمیرات میں ہوتا ہے۔ تخت طاؤس، جس کی مالیت عہد جدید میں کروڑوں ڈالر بتائی جاتی ہے، بھی اسی سے منسوب ہے۔ اس نے شاہ جہاں آباد کی بنیاد رکھی جسے فی زمانہ پردلی کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے دہلی کے قلعے میں دیوان عام، دیوان خاص اور لاہور میں شالا مار باغ بھی تعمیر کرایا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے ہاتھوں تعمیر ہونے والے دہلی محل کا شمار اپنے دور کی خوب صورت ترین عمارتوں میں ہوتا تھا۔

شاہ جہاں 5 جنوری 1592ء کو شہاب الدین محمد خرم کی حیثیت سے لاہور میں پیدا ہوا۔ وہ شہنشاہ نور الدین محمد جہانگیر کا تیسرا اور چھٹا بیٹا تھا۔ اس کی ماں ملکہ مان متی، ایک رائٹھور راجپوت شہزادی تھی۔ اس کا نام خرم، دادا شہنشاہ اکبر نے تجویز کیا، جس کے فارسی میں معانی، خوشی سے بھرپور، کے ہیں۔

ابتدائی عمر میں ہی اس کے جوہر کھل کر سامنے آنے شروع ہو گئے اور اس نے ماہر اساتذہ کی زیر نگرانی تعلیم کے ساتھ ساتھ فن حرب میں بھی کمال حاصل کیا۔ بعد ازاں اس نے مختلف مہمات میں اپنے والد کی فوجوں کی کمان کی اور ایک زیرک سپہ سالار کی حیثیت سے اپنی شجاعت اور مہارت کا لوہا منوایا۔ اس نے 1615ء میں میواڑ، 1617ء اور 1621ء میں دکن اور 1618ء میں کانگڑہ کی جنگوں میں نمایاں کامیابیاں حاصل کیں۔ اپنے والد کے عہد میں بیشتر سرحدی معاملات اسی نے طے کیے۔ سولہ برس کی عمر میں ہی اس نے فن تعمیر کے حوالے سے اس وقت اپنا شہرہ منوایا جب اس نے بابر کے قلعہ کابل میں اپنی رہائش گاہ تعمیر کرائی اور آگرہ قلعہ کی بعض عمارتوں کو از سر نو ڈیزائن کیا۔

1607ء میں اس کی منگنی ایک ایرانی امیر کی چودہ سالہ بیٹی ارجمند بانو بیگم سے کر دی گئی جس کے بعد یہی دل کش اور نازک اندام لڑکی اس کی زندگی کی پہلی اور آخری خواہش بن گئی۔ ایک دوسرے کو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے چاہنے کے باوجود دونوں کو ایک ہونے میں پانچ سال لگے اور 1612ء میں ان کی شادی ہوئی۔ شادی کے بعد شہزادہ خرم کو اندازہ ہوا کہ ارجمند اپنی نوعیت کی ایک ہی لڑکی اور اپنی ہم عمر امیرزادیوں سے قطعی مختلف اور منفرد

شاہ جہاں

تاج محل کا معمار

1628ء سے 1658ء تک السلطان الاعظم والٹا قان المکرم ابو المظفر شہاب الدین محمد، صاحب القرآن ثانی، شاہ جہاں اول،، پادشاہ غازی ظل اللہ، فردوس آشیانی کی حیثیت سے بلا شرکت غیرے ہندوستان پر حکومت کرنے والے۔ شہاب الدین محمد شاہ جہاں کا شمار۔۔۔ عظیم مغل فرماں رواؤں میں ہوتا ہے۔ شاہ جہاں، فارسی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی، پوری دنیا کے بادشاہ، کے ہیں۔ ظہیر الدین محمد بابر، نصیر الدین محمد ہمایوں، جلال الدین محمد اکبر اور نور الدین محمد جہانگیر کے بعد مغلیہ سلسلے کا یہ پانچواں بادشاہ۔۔۔ نو عمری میں اپنے دادا اکبر اعظم کا بے حد چہیتا تھا۔

شاہ جہاں کی صلاحیتوں کی وجہ سے اوائل شباب میں ہی اسے جہانگیر کا جانشین سمجھ لیا گیا تھا چنانچہ 1627ء میں اپنے والد کے انتقال پر وہی تخت نشین ہوا۔ اس کا شمار بلا مبالغہ عظیم مغلوں میں کیا جاتا ہے جبکہ اس کے عہد کو مغلوں کا سنہرا دور کہا جاتا ہے۔ اپنے دادا اکبر کی طرح وہ بھی اپنی سلطنت کو وسعت دینے کا خواہش مند تھا۔ اس کے عہد کی اہم فوجی مہمات میں سلطنت احمد آباد کی تباہی 1636ء، قندھار میں ایرانیوں کے ہاتھوں شکست 1653ء اور دکن کے شہزادوں کے خالف دوسری جنگ 1655ء شامل ہیں۔ 1658ء میں وہ بیمار ہو گیا تو اس کے بیٹے اورنگ زیب نے اسے قلعہ آگرہ میں نظر بند کر دیا جہاں وہ 1666ء میں اپنی موت تک قید رہا۔

اس کے عہد کو مغلیہ طرز تعمیر کا عہد زریں بھی کہا جاتا ہے۔ اس نے کئی شان دار اور

ہے چنانچہ اس نے اپنی نو بیاہتا کو ممتاز محل یعنی محل میں سب سے اعلیٰ کا خطاب دیا۔
خرم نے اکبر آبادی محل اور قندھاری محل نامی دو خواتین سے بھی شادیاں کیں لیکن ان
میں سے کوئی بھی عورت ممتاز محل جیسی عزت اور محبت حاصل نہ کر سکی۔ تمام سوانح نگار اور
مورخین اس امر پر متفق ہیں کہ خرم۔۔۔ کچھ اس طرح ارجمند کی محبت میں گرفتار تھا کہ اس
نے سوائے ایک ایک بچہ پیدا کرنے کے، اپنی پہلی دو بیویوں سے ازدواجی تعلقات جاری
رکھنے میں کسی رغبت کا اظہار نہ کیا۔

مغلیہ دربار کا سرکاری مورخ قزوینی تصدیق کرتا ہے کہ خرم کو دوسری بیویوں سے
سوائے اس کے اور کوئی دل چسپی نہ تھی کہ وہ اس کے نکاح میں تھیں۔ شہزادی حضور، ارجمند
بانو کے لیے شہزادہ حضور۔۔۔ جو شدید محبت، لگاؤ، توجہ اور حمایت رکھتے تھے وہ دنیا کی کسی اور
عورت کے لیے نہیں تھی۔

مغل بادشاہت میں چونکہ ولی عہدی صرف کسی بادشاہ کا بیٹا ہونے سے مشروط نہیں تھی
اور نہ ہی دولت و قوت کسی کو ورثے میں ملتی تھی اس لیے مغل شاہ زادے، دربار میں اپنی اہمیت
ثابت کرنے کے لیے جنگی مہمات کا سہارا لیتے تھے۔ اس سے اکثر نہ صرف بغاوتیں جنم لیتی
تھیں بلکہ تخت نشینی کے لیے جنگیں بھی ہوتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ شہزادہ خرم کے ابتدائی دنوں
میں مغل دربار کی سیاسی صورت حال نہایت پے چیدہ اور گھمبیر تھی۔

1611ء میں اس کے والد یعنی شہنشاہ جہانگیر نے ایرانی امیر اور بنگال کے صوبے دار
علی قلی خان کی بیوہ نور جہاں سے شادی کر لی جو بے حد تیزی سے نہ صرف جہانگیر کے دل و
دماغ پر حاوی ہو گئی بلکہ دربار پر اس کا اثر و رسوخ یہاں تک بڑھ گیا کہ اپنے بھائی آصف
خان کے ساتھ مل کر وہ سلطنت کے معاملات بھی چلانے لگی۔ ارجمند بانو، آصف خان کی بیٹی
تھی چنانچہ شہزادہ خرم سے اس کی شادی سے دربار میں اس کی حیثیت مزید مضبوط ہو گئی۔

1617ء میں دکن کے لودھیوں کے خلاف مہم نے ایک جانب مغل بادشاہت کی
جنوبی سرحدوں کو مضبوط کر دیا تو دوسری جانب مشکور باپ نے اپنے بہادر بیٹے کو۔۔۔ شاہ
جہاں بہادر یعنی آقائے ارض کا خطاب عطا کیا جس سے اس کی ولی عہدی کی توثیق ہو گئی۔ مگر
دوسری جانب درباری سازشوں میں اس وقت تیزی آ گئی جب نور جہاں نے اپنے پہلے

شوہر سے پیدا ہونے والی بیٹی لاڈلی کی شادی خرم کے چھوٹے بھائی سے کر کے تخت کے دعویٰ
دار کی حیثیت سے اپنے داماد کی حمایت شروع کر دی۔ آصف خان نے بہن کی حمایت کی جس
کے نتیجے میں 1612ء میں خرم نے اپنے والد کے خلاف کھلی بغاوت کر دی۔
1626ء میں جہانگیر کی فوجوں نے بغاوت کچل دی اور خرم کو غیر مشروط ہتھیار ڈالنے
پڑے۔ لیکن 1627ء میں جہانگیر کے انتقال پر خرم ہی شاہ جہاں کے لقب سے مغل سلطنت
کے تخت پر بیٹھا۔

ممتاز محل نے اپنے شوہر سے محبت اور وفاداری کا ثبوت اس طرح دیا کہ تو اتر سے ماں
بننے کے باوجود اس نے اپنے شوہر کی تمام ابتدائی جنگی مہمات میں اس کے ساتھ ہندوستان
کے طول و عرض کا سفر کیا۔ مورخین کا کہنا ہے کہ ممتاز اپنے شوہر کی انتہائی وفادار، قابل اعتماد
ساتھی اور مستقل ہمراہی تھی۔ مورخین نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ ایک ایسی مکمل بیوی تھی جسے اپنے
شوہر کی طاقت و قوت سے کوئی غرض تھی نہ اس کے اپنے کوئی سیاسی مفادات تھے۔ یہ الفاظ
دیگر وہ ان معاملات میں اپنی پھوپھو نور جہاں کے مکمل برعکس تھی۔

تاریخ نگار اس کے والد جہانگیر کے عہد کو پُر امن قرار دیتے ہیں لیکن اس کے آخری
دنوں میں مغل سلطنت کو کئی خطرات کا سامنا کرنا پڑا۔ شاہ جہاں کا عہد اس کے بالکل برعکس
تھا۔ اس نے احمد نگر میں ایک بغاوت کو کچلا جسے بعض لوگ اسلامی بغاوت کا نام بھی دیتے
ہیں۔ اسی طرح اس نے بنگال میں پرتگیزیوں کا زور توڑا، مغرب اور شمال مغرب میں درہ خیبر
کے پار بنگلانہ اور بندیل کھنڈ کی راجپوت بادشاہتوں کا خاتمہ کیا۔ شاہ جہاں کی فوجی مہمات
کے نتیجے میں شاہی خزانے کو بھاری بوجھ برداشت کرنا پڑا اور اس کے عہد میں سلطنت ایک
بہت بڑی فوجی مشین بن کر رہ گئی۔ اس کے امراء اور فوجی سپہ سالار عوام سے زیادہ سے زیادہ
ٹیکس لینے میں لگے رہے تاکہ بڑھتے ہوئے جنگی اخراجات سے نمٹا جاسکے لیکن دوسری طرف
اس کا دور عام طور پر استحکام کا زمانہ بھی تھا۔ انتظامیہ کو مرکزیت دی گئی اور درباری امور کو
باضابطہ بنایا گیا۔ تاریخ نویسی اور دیگر فنون لطیفہ کو ترقی دی گئی۔ اس میں شک نہیں کہ مغل
سلطنت نے اپنی وسعت و ترقی کا سفر جاری رکھا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ شاہ جہاں کے
آخری دنوں میں شاہی زوال کے آثار بھی دیکھے گئے۔

اس کے سیاسی اقدامات کی بدولت لاہور، دہلی، آگرہ اور احمد آباد بڑے تجارتی مراکز کی حیثیت سے ابھرے جو سڑکوں اور آبی راستوں کے ذریعے بندرگاہوں اور ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ اس نے 1640ء میں دارالسلطنت آگرہ سے دہلی منتقل کیا اور شاہ جہاں آباد نام کا نیا شہر بھی آباد کیا۔ یہیں اس کی بیٹی جہاں آرا بیگم نے چاندنی چوک کی بنیاد رکھی جسے آج بھی دہلی شہر میں بے حد اہمیت حاصل ہے۔

شاہ جہاں کے عہد میں مغلوں کا فن تعمیر بھی اپنے بام عروج کو پہنچا۔ اس میں دورائے نہیں کہ شاہ جہاں، شان دار عمارتوں کی تعمیر کا بے حد شوقین تھا۔ اس نے آگرہ میں اپنی محبوب بیوی ممتاز محل کے لیے افسانوی تاج محل تعمیر کرایا۔ اس کے عہد کی دوسری تعمیرات میں دہلی کی جامع مسجد اور لال قلعہ، آگرہ قلعے کے کچھ حصے لاہور کی مسجد وزیر خان، موتی مسجد، لاہور کا شالامار باغ، لاہور قلعے کے بعض حصے (خاص طور پر شیش محل اور نو لکھا پولین) ٹھہرے کی شاہ جہاں مسجد اور اس کے والد یعنی جہانگیر کا مقبرہ، جس کی تعمیر کی نگرانی اس کی سوتیلی والدہ ملکہ نور جہاں نے کی، شامل ہیں۔

روایات میں ہے کہ شاہ جہاں، تاج محل کے مقابل، دریائے جمنا کے دوسرے کنارے اپنے لیے سنگ سیاہ سے اسی طرح کا ایک شان دار مقبرہ تعمیر کرانے کا خواہش مند تھا۔۔۔ لیکن اس کے تاریخی شواہد دستیاب نہیں۔

جانشینی کے سلسلے میں شاہ جہاں کو اس وقت مکافات عمل کا سامنا کرنا پڑا جب 1657ء میں وہ بیمار ہوا اور اس کے بیٹے اورنگ زیب نے اس کے خلاف بغاوت کر دی۔ اس نے ولی عہد سلطنت اور اپنے بھائی شہزادہ داراشکوہ کو سرعام پھانسی دے دی۔ اس کے باوجود کہ شاہ جہاں مکمل طور پر صحت یاب ہو گیا، اورنگ زیب نے اسے حکمرانی کے لیے نااہل قرار دے کر آگرہ کے قلعے میں نظر بند کر دیا۔

شاہ جہاں کی بڑی بیٹی اور اورنگ زیب کی بہن شاہ زادی جہاں آرا بیگم صاحبہ نے آٹھ سالہ نظر بندی میں رضا کارانہ طور پر اپنے والد کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا۔ جنوری 1666ء میں شاہ جہاں شدید بیمار ہو گیا۔ سخت قسم کے ڈائیریا کی وجہ سے وہ اس قدر کمزور ہو گیا کہ بستر سے اٹھنے کے قابل بھی نہ رہ گیا۔ 22 جنوری کو اس نے حرم کی خواتین بہ طور خاص

اپنی بیوی ملکہ اکبر آبادی محل کو۔۔۔ جہاں آرا کا خیال کرنے کی وصیت کی۔ 31 جنوری 1666ء کو اس نے کلمہ طیبہ اور چند قرآنی آیات کی تلاوت کی اور اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کر دی۔ جہاں آرا کی خواہش تھی کہ شاہ جہاں کا جلوس جنازہ شاہانہ انداز میں نکالا جائے جس میں شاہ کی میت امرائے سلطنت نے اٹھا رکھی ہو جبکہ آگرہ کے معزز شہری اس کے ہمراہ ہوں اور غریبوں اور ضرورت مندوں میں طلائی اور نقرئی سکے تقسیم کیے جائیں لیکن اورنگ زیب نے اس کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ میت کو اسلامی طریقے سے غسل دیا گیا۔ صندل کی لکڑی سے بنے تابوت میں اسے تاج محل لے جایا گیا اور۔۔۔ اس کی محبوب بیوی ممتاز محل کے پہلو میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

مغربی مصنفین نے شاہ جہاں کی نجی زندگی کے کئی پہلوؤں کو متنازعہ قرار دیا ہے۔ اپنے آباؤ اجداد کی طرح شاہ جہاں کے حرم میں کئی بیویاں، داشتائیں اور رقاصائیں شامل تھیں۔ کئی مغربی مصنفین نے اس کا بہ طور خاص تذکرہ کیا ہے۔ نکولا و مینوکی نے لکھا ہے کہ ایسا لگتا ہے کہ شاہ جہاں کا واحد شوق اپنے جذبات کی تسکین کے لیے خوب صورت عورتیں جمع کرنا تھا اور اس مقصد کے لیے اس نے اپنے دربار میں مستقل بنیادوں پر ایک میلے کے انعقاد کا سلسلہ شروع کیا۔ اس میلے میں خواتین کے علاوہ کسی کو شرکت کی اجازت نہیں تھی۔ میلے میں شمولیت کے لیے امیر یا غریب خواتین کی کوئی قید نہیں تھی تاہم ان کا خوب صورت ہونا بے حد ضروری تھا۔ جب اسے آگرہ قلعے میں قید کیا گیا تو اورنگ زیب نے اسے اپنی تمام رقاصائیں اور گلوکارائیں ساتھ رکھنے کی اجازت دے دی۔ شاہ جہاں کو پرلے درجے کا افیونچی بھی قرار دیا گیا ہے۔ مینوکی یہ بھی لکھتا ہے کہ بہت زیادہ بوڑھا ہونے کے باوجود بھی۔۔۔ جسم کے لیے شاہ جہاں کی بھوک اور رغبت کبھی کم نہ ہوئی۔ ایک فرانسیسی سیاح، ڈاکٹر برنیر نے الزام عائد کیا کہ شاہ جہاں کے اپنی بیٹی جہاں آرا بیگم سے ناجائز تعلقات تھے۔۔۔ تاہم ڈاکٹر برنیر سمیت تمام یورپی مصنفین کے الزامات کو مستند تسلیم نہیں کیا جاتا کیونکہ انہوں نے بازاروں میں ہونے والی گپ شپ اور گفتگو کو اپنی معلومات کی بنیاد بنایا۔

بعض ذرائع کے مطابق شاہ جہاں نے مجموعی طور پر نو شادیاں کیں۔ اس کی بیویوں کے نام اکبر آبادی محل (وفات 1677ء) قندھاری محل (پیدائش 1594ء شادی

1606ء) ارجمند بانو، ممتاز محل (پیدائش 1593ء شادی 1612ء وفات 1631ء)
 حسینہ بیگم صاحبہ (شادی 1617ء) موتی بیگم صاحبہ، قدسیہ بیگم صاحبہ، فتح پوری محل صاحبہ
 (وفات بعد از 1666ء) سرہندی بیگم (وفات بعد از 1650ء) شریعتی من بھاوتی بانی جی
 لال صاحبہ (شادی 1626ء) بتائے جاتے ہیں۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کی تمام اولادوں نے ارجمند بانو کے بطن سے جنم لیا جن کی
 تعداد چودہ تھی تاہم ان میں سے سات بچے زندہ رہ سکے۔ ان میں جہان آرا بیگم، داراشکوہ
 (پیدائش 1615ء) شاہ شجاع، روشن آرا بیگم، اورنگ زیب (پیدائش 23 اکتوبر
 1618ء) مراد بخش اور گوہر آرا بیگم شامل تھے۔

ooo

حمیدی

ممتاز محل تاج محل کی مکین

مغل فرماں روا شہاب الدین محمد شاہ جہاں کی چہیتی بیوی۔۔۔ ارجمند بانو کو تاریخ میں
 ۔۔۔ ممتاز محل کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ممتاز محل کے معنی۔۔۔ محل کی محبوب اور قیمتی کے
 ہیں۔

ممتاز محل۔۔۔ اپریل 1593ء میں آگرہ میں پیدا ہوئی۔ وہ ایک ایرانی امیر اور
 شہنشاہ نور الدین محمد جہانگیر کی ملکہ بننے والی نور جہاں کے بھائی ابوالحسن آصف خان کی بیٹی
 تھی۔

10 مئی 1612ء کو انیس سال کی عمر میں اس کی شادی شہزادہ خرم سے کردی گئی جو بعد
 میں شاہ جہاں اول کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ وہ اپنے شوہر کی تیسری لیکن سب سے چہیتی
 بیوی تھی۔ ممتاز محل کا انتقال 17 جون 1631ء کو دکن میں برہان پور، موجودہ مدھیہ پردیش
 کے مقام پر، اپنے چودھویں بچے، گوہر آرا بیگم نامی بیٹی کی پیدائش کے دوران ہوا۔

بعض مورخین کے مطابق 1607ء میں، جب وہ محض چودہ سال کی تھی، اس کی منگنی
 شہزادہ خرم سے کردی گئی تاہم کچھ تاریخ نگار اس منگنی کی تصدیق نہیں کرتے۔ منگنی کے بعد ہی
 وہ اس کی واحد اور زندگی کی اکلوتی محبت کی حیثیت اختیار کر گئی لیکن شادی کے لیے انہیں پانچ
 سال انتظار کرنا پڑا بالآخر شاہی جوتشیوں کی جانب سے ایک سعد تاریخ کے انتخاب کے بعد
 1612ء میں ان کی شادی کردی گئی۔ انہوں نے ایک خوش گوار زندگی کا آغاز کیا۔ مورخین
 کے مطابق، شہزادہ خرم نے ارجمند بانو کو اپنے عہد کی تمام خواتین میں محبوب اور ممتاز پایا اور

تعمیر کرایا تھا۔ ممتاز محل نے انیس سال شاہ جہاں کے ساتھ گزارے اور اس کے سولہ میں سے چودہ بچوں کی ماں بنی۔

اس کے بطن سے جن بچوں نے جنم لیا ان کے نام یہ ہیں۔

حور النساء بیگم۔ 1613ء بہ مطابق 1022ھ

جہاں آرا بیگم۔ 2 اپریل 1614ء بہ مطابق صفر 1023ھ

داراشکوہ۔ 30 مارچ 1615ء بہ مطابق 29 صفر 1024ھ

شاہ شجاع۔ 3 جولائی 1616ء بہ مطابق 18 جمادی الثانی 1025ھ

روشن آرا بیگم۔ 3 ستمبر 1617ء بہ مطابق 2 رمضان 1026ھ

اورنگ زیب۔ 3 نومبر 1618ء بہ مطابق 15 ذی قعد 1027ھ

سلطان امید بخش۔ اکتوبر 1619ء بہ مطابق شوال 1028ھ

شہزادی ثریا بیگم۔ 10 جون 1621ء بہ مطابق 20 رجب 1030ھ

بیٹا۔ 25 اگست 1623ء بہ مطابق 1032ھ

مراد بخش۔ 8 اکتوبر 1624ء بہ مطابق 25 ذی الحجہ 1033ھ

لطف اللہ۔ 4 نومبر 1626ء بہ مطابق 14 صفر 1036ھ

سلطان دولت افزا۔ 9 مئی 1628ء بہ مطابق 5 رمضان 1037ھ

حسن آرا بیگم۔ 23 اپریل 1630ء بہ مطابق 10 رمضان 1039ھ

بیٹی۔ 17 جون 1631ء بہ مطابق 17 ذی قعد 1040ھ

کہا جاتا ہے کہ ممتاز محل نے بستر مرگ پر اپنے شوہر سے اس آخری خواہش کا اظہار کیا تھا کہ اس کی موت کے بعد ان کی محبت کی شان دار یادگار تعمیر کی جائے۔ اس نے اپنے شوہر سے یہ فرمائش بھی کی کہ وہ اس کے بعد کوئی اور شادی نہ کرے۔ اور محبت سے معمور اور جذبات سے سرشار بادشاہ نے وعدہ کرنے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کی۔ مورخین نے ملکہ ممتاز محل کے انتقال پر شہنشاہ شاہ جہاں کے غیر معمولی رد عمل اور سوگ کا بہ طور خاص ذکر کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ملکہ کی موت پر بادشاہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا جبکہ کتابوں میں ہے کہ شاہ نے ملکہ کی موت کا ایک سال تک گوشہ تہائی میں سوگ منایا تھا۔ جب وہ دوبارہ نمودار

ٹوٹ کر اس سے محبت کی۔ جس کا ارجمند نے بھی بھرپور جواب دیا۔ اسی لیے شاہ جہاں نے، اسے ممتاز محل کے خطاب سے نوازا۔ تواریخ میں شہزادہ خرم کی مزید بیویوں کا ذکر بھی ہے لیکن جودل چھپی اسے ممتاز سے تھی وہ دنیا کی کسی اور عورت میں نہیں تھی۔

ممتاز محل نے اپنے شوہر کے ساتھ محبتوں سے بھرپور ازدواجی زندگی گزاری۔ کہتے ہیں کہ وہ بے حد و حساب خوب صورت تھی چنانچہ شاعروں نے اس کی حیات میں بھی اس کے حسن جہاں سوز، رحم دلی اور عزت و وقار کے بارے میں ان گنت قصائد لکھے۔ ممتاز، شاہ جہاں کی نہایت قابل اعتماد رفیق تھی اور اس نے اپنے شوہر کے ساتھ تمام مغل سلطنت کا دورہ کیا۔ وہ اس پر اس قدر اعتماد کرتا تھا کہ شاہی مہر۔ مہراز بھی اس کے پاس ہوتی تھی۔

اپنی پھوپھی، سوتیلی ساس اور شہنشاہ جہانگیر کی ملکہ نور جہاں کے برعکس اس کے نہ تو کوئی سیاسی مفادات تھے اور نہ ہی اس نے کبھی درباری معاملات میں اپنے شوہر پر اثر انداز ہونے کی کوشش کی۔ اس کا شوہر اس کی تمام خواہشات پوری کرتا لیکن اس نے سوائے غریبوں کی مدد کے، کبھی اپنی اس حیثیت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ہاتھیوں کی لڑائی اور جنگی کھیل تماشے دیکھنے کی بے حد شوقین تھی۔ مغلوں کے ہاں یہ عام تھا کہ طبقہ امراء کی خواتین، تعمیرات میں بھی دل چھپی رکھتی تھیں چنانچہ ممتاز محل نے بھی آگرہ میں لب دریا واقع باغ میں کچھ وقت گزارا۔

تواتر کے ساتھ حاملہ ہونے کے باوجود وہ مغلیہ سلطنت کے طول و عرض میں جنگی مہمات اور شہنشاہ جہانگیر کے خلاف بغاوت کے دوران اپنے شوہر کے ہم رکاب رہی۔ وہ اس کی مستقل ساتھی، با اعتماد دوست تھی جبکہ ان کا باہمی رشتہ کسی بھی قسم کے کھنچاؤ اور شکوک و شبہات سے پاک تھا۔ درباری مورخین نے ان کے پر جوش ازدواجی تعلق کا بہ طور خاص تذکرہ کیا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ انیس سالوں میں شاہ جہاں کے تیرہ بچوں کی ماں بنی جبکہ چودھویں بچے کی پیدائش کے دوران عین عالم شباب میں اس کی موت واقع ہو گئی۔

1631ء میں اپنے انتقال کے وقت بھی وہ اپنے شوہر کے ہمراہ تھی جو ان دنوں سطح مرتفع دکن میں باغیوں کے خلاف ایک مہم میں مصروف تھا۔ ممتاز محل کو عارضی طور پر زین آباد نامی ایک باغ میں دفن کیا گیا جسے شاہ جہاں کے چچا دانیال نے دریائے تپتی کے کنارے

1017ھ 1607ء

ارجمند بانو

شاید وہ کوئی طوفان ہی تھا جو میری بیداری کا باعث بن گیا تھا۔ میں مسہری پر اٹھ کر بیٹھ گئی اور پھر اچانک مجھے احساس ہوا کہ ابھی تو برسات کی رت بھی نہیں آئی پھر یہ طوفانی اور مہلے زور ہوا کیسی؟ لیکن ہوا کا بوجھل پن بدستور تھا۔ میرے کانوں میں اُن کا شور یوں گونج رہا تھا جیسے بہت سی بدزدیں مل کر غل غپاڑا مچا رہی ہوں اور پھر یہ سارا منظر جیسے ڈھل گیا۔ اُس کینوس کی طرح بالکل صاف ہو گیا جس پر کچے رنگوں سے تصویر بنا کر اسے موسلا دھار بارش میں رکھ دیا جائے۔۔۔ اور پھر میرے کان، کوؤں کی کانیں، کونل کی گونگ اور بلبل کی چہچہاہٹ سے آشنا ہونے لگے۔ میں نے جھروکے سے باہر دیکھا۔ وہاں پھیلی ہوئی روشنی بتا رہی تھی کہ مغلوں کی عظیم الشان سلطنت میں سورج طلوع ہو گیا ہے۔ سامنے نظر آنے والے آم اور پتیل کے پیڑ، یوں محسوس رہے تھے جیسے ثروتِ سلطانی کا نشہ اُن پر بھی غالب آنے لگا ہو۔

لیکن چاروں طرف وحشیوں کی طرح نظریں گھمانے کے باوجود، میں یہ نہ سمجھ سکی کہ میں خود سے کیوں کر بیدار ہو گئی۔ کہیں میرا وہ ہڈا پنا۔۔۔ ہاں وہ میرا پنا ہی تھا، جس نے میری پلکوں سے نیند کا سہانا تصور چھین لیا تھا۔ میں نے ذہن پر زور دیا لیکن پنا تو یوں پر لگا کر اڑا تھا جیسے کوہِ قاف کی کوئی پری رہی ہو۔ میں نے دل پر ہاتھ رکھا۔ بے ترتیب دھڑکنیں میرے شہے کی تصدیق کر رہی تھیں۔

میری خوابیدہ آنکھوں میں پھر وہ منظر کھوم گیا۔ وہی نیلا اور بحر بیکراں جیسا لامحدود آسمان۔۔۔ وہ جگہ جہاں وہ زمین سے گلے ملتا ہے۔۔۔ نہیں بلکہ وہ میری نگاہوں کا سراب

ہوا تو اس کے سر کے تمام بال سفید ہو چکے تھے، کمر جھک گئی تھی اور چہرہ سو جا ہوا تھا۔ شاہ جہاں اور ملکہ ممتاز محل کی بڑی بیٹی شہزادی جہاں آرا بیگم نے اپنے والد کو اس کیفیت سے باہر نکالنے میں اہم کردار ادا کیا۔

ملکہ ممتاز محل کے ذاتی خزانے کی مالیت ایک کروڑ روپے تھی جس کا نصف شاہ جہاں نے شہزادی جہاں آرا اور باقی دیگر بچوں کو دیا۔ ملکہ ممتاز محل کو برہان پور میں عارضی طور پر سپرد خاک کیا گیا لیکن شاہ جہاں نے اس شہر کو کبھی اپنی چہیتی بیوی کی آخری آرام گاہ کے طور پر قبول نہ کیا۔ دسمبر 1631ء میں ملکہ ممتاز محل کے جسدِ خاکی کو ایک طلائی تابوت میں آگرہ منتقل کر دیا گیا۔ اس شاہی جنازے کے جلوس کی نگرانی کے فرائض ملکہ ممتاز کے بیٹے شاہ شجاع کے ذمے تھے۔

آگرہ میں دریائے جمنا کے کنارے اسے ایک چھوٹی سی عمارت میں دفن کیا گیا۔ شاہ جہاں اپنی مہم کی تکمیل کے لیے برہان پور میں ہی رکا رہا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے وہیں اپنی بیوی کے لیے ایک شان دار مقبرہ اور اس سے ملحق باغ تعمیر کرنے کی منصوبہ بندی کر لی تھی لیکن اس کی چہیتی ملکہ کی آخری آرام گاہ مکمل ہونے اور اس کی مستقل تدفین میں مزید بیس برس لگ گئے۔

آج تاج محل صرف ملکہ ممتاز محل کی ابدی آرام گاہ ہی نہیں بلکہ روئے زمین پر انمول محبتوں اور بے لوث چاہتوں کی نشانی بھی ہے۔

000

تھا۔ وہ میرا تصور تھا کہ میں نے آسمان کی بلندی کو زمین کی پستی سے ہم آغوش ہوتے دیکھا تھا۔ اسی حد اتصال پر، چاندی کی طرح سفید تخت مجھے نظر آیا تھا۔ خون میں ڈوبا ہوا، جس پر میں خود براجمان تھی اور دور بہت دور۔۔۔ جہاں آنکھوں کی روشنی، فاصلوں سے شکست تسلیم کر لیتی تھی ایک سایہ تھا۔۔۔ میں یہ نہیں سمجھ سکتی تھی کہ وہ سایہ کسی انسان کا تھا یا میرے خوابوں کی پراگندگی، ہیولے کی صورت، میرے سامنے آگئی تھی۔ میں اُس ہیولے کو دیکھتی رہی تھی۔۔۔ دیکھتی رہی تھی۔۔۔ حتیٰ کہ میرا تخت اور وہ ہیولیٰ یک جان دو قالب ہو گئے تھے۔

سننے کی سرور انگیز کیفیت یاد آئی تو میں نے چوروں کی مانند ادھر ادھر دیکھا۔ زنان خانہ ہنوز اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا لیکن باہر دن کا آغاز ہو چکا تھا۔ دور کہیں سے گلیوں میں پھیری لگا کر چیزیں بیچنے والوں اور کھیتوں کی جانب رواں، بیلوں کے گلے میں بندھی گھنٹیوں کی سریلی آوازیں میرے کانوں میں رس گھول رہی تھیں اور ان سے بھی دور، ڈھنڈورچی عظیم مغل شہنشاہ نورالدین محمد جہانگیر کے دریاغے دیدار میں رونق افروز ہونے کا اعلان کر رہا تھا۔

ہرج، عظیم مغل بادشاہ، سورج طلوع ہونے سے ایک گھڑی پہلے لال قلعے کی بلند یوں سے شہر کے ذی حیثیت اور اپنی دید کے مشتاق لوگوں کو درشن دیا کرتا تھا۔ میں چشم تصور سے اُسے اپنے نقرئی تخت پر جلوہ افروز مشرق کی سمت، نگاہیں گاڑے افق کو گمراہ دیکھ رہی تھی جہاں اُس کی سلطنت کی سرحدیں ختم ہوتی تھیں۔ اُس زمانے میں یہ بات زبان زد عام تھی کہ اگر ایک اونٹ پر سفر کیا جائے تو بنگال سے فارس تک پھیلی ہوئی، اُس کی عظیم بادشاہت کو پار کرنے میں ساٹھ دن لگیں گے اور اگر شمال میں ہمالیہ کی بلندیوں سے دکن کی ترائیوں کی جانب سفر کیا جائے تو مزید ساٹھ دن درکار ہوں گے اور انسان کی چشم تصور سے بھی کہیں دور تک پھیلی ہوئی اس سلطنت کا درمیانی مقام آگرہ تھا جو ہندوستان کے مغل بادشاہوں کا پایہ تخت تھا۔

نقارے کی چوٹ، ہماری حویلی میں بھی دن کے آغاز کا اعلان ہوا کرتی تھی۔ میں ہر صبح نقارہ سنتی اور پھر اُس کے ساتھ ہی برتنوں کے بجنے، غلام گردشوں میں لونڈیوں اور خواجہ

سراؤں کی بھاگ دوڑ اور باقی اہل خانہ کی آوازیں سنائی دینے لگتیں۔ آج بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ اپنی والدہ اور پھوپھی کی سرگوشیاں مجھے قریب ہی سنائی دے رہی تھیں لیکن جانے کیوں آج مجھے اُن کی آواز میں کوئی نئی ترنگ محسوس ہو رہی تھی، کوئی دبا دبا سا جوش تھا۔

”کیا تم جاگ گئیں، ارجمند“ ماں کی آواز نے مجھے خیالات سے چونکا دیا۔ عام حالت میں حرم، بچوں کی رفتار سے بیدار ہوتا تھا اور عورتوں کے بناؤ سنگھار میں آدھا دن بیت جایا کرتا تھا لیکن آج جانے کیا بات تھی کہ ہر جانب تیز رفتاری کا سماں تھا۔ غلام، خواجہ سرا اور لونڈیاں ادھر سے ادھر تیلیوں کی مانند اڑتے پھر رہے تھے۔ زیورات کے صندوقے، ریشم کے تھان، کم خواب کے جوڑے، ہاتھی دانت کے ڈبے، چاندی کے کنگن اور ہیرے جواہرات ایک جگہ جمع کیے جا رہے تھے اور یہ سب اس لیے تھا کہ آج رات شاہی مینا بازار منعقد ہونے والا تھا۔ شاہی مینا بازار موسم بہار کے آخری دنوں میں ہر سال برپا ہوتا تھا جس میں شاہی خانوادے اور اُس سے منسلک امراء اور مصاحبین کی خواتین کے ٹھہر مٹ کے ٹھہر مٹ شریک ہوا کرتے تھے۔

”کیا تم تیار نہیں ہوگی؟“ پھوپھی مہر النساء نے دریافت کیا۔

”کیا میں بھی جاؤں گی؟“ میں نے اُلٹا سوال کیا۔

”کیوں نہیں؟ اب تم بڑی ہو گئی ہو، اتنی بڑی کہ کوئی تمہیں پسند کر کے شادی کا پیام بھیج سکتا ہے۔“

میرے دہکتے عارض ہلکوں ہو گئے۔ مارے لاج کے میرا سر جھک گیا۔ میں بارہ برس کی تھی اور بقول میری والدہ کے اب شادی کی عمر کے قریب تھی۔ میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی لیکن میری زندگی کسی قسم کے جوش سے عاری تھی۔ میری تعلیم۔۔۔ لکھنا پڑھنا، مصوری، موسیقی، تاریخ اور قرآن۔۔۔ بس اتنا تھا جو کسی امیر کی بیوی کے لیے ضروری ہو سکتا تھا۔ شادی کے سلسلے میں بھی مجھے اُمید تھی کہ وہ محض دولت اور دو انسانوں کے ملاپ کے خشک سے بندھن کے سوا کچھ نہیں ہوتی اس کے باوجود کہ اپنی عمر کی لڑکیوں کی طرح میں بھی پیار محبت کے سننے دیکھا کرتی تھی۔ مجھے اپنے مستقبل کا خوب اندازہ تھا۔

”لیکن میرے پاس تو بیچنے کے لیے کچھ بھی نہیں۔“ میں نے اپنی پھوپھی کو بتایا۔

”میں نے تو یونہی ایک بات کہی تھی۔“ پھوپھو نے موضوع بدلا۔ ”لاڈلی کہاں ہے؟“
 ”ابھی تک سو رہی ہے۔“

پھوپھو کی ایک ہی بیٹی تھی، لاڈلی، جو میری ہم عمر تھی۔ وہ میری قریبی ہم جولی، شرمیلی، دش اور کھوئی کھوئی رہنے والی لڑکی تھی۔

میرے پاس اپنے کھپے پر رکھنے کے لیے پھوپھو کے مقابلے میں کچھ نہیں تھا۔ میں ابھی کم عمر اور غیر شادی شدہ تھی اس لیے میرے خزانے میں سونے کی ایک بھاری زنجیر، کچھ کڑوں اور چاندی کی چند چیزوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ میں نے اپنی ساری پازیبیں، جھمکے، پہنچیاں، ہار اور انگشتریاں وغیرہ جمع کیں لیکن وہ نہ ہونے کے برابر تھیں، زیادہ سے زیادہ اُن کی قیمت ایک ہزار روپے بنتی۔

”تم بہت مایوس نظر آتی ہو آغاچی۔“ عیسیٰ کی آواز سنائی دی۔ ”تمہارے چہرے پر دوسری بیگمات کی طرح خوشی کی کوئی جھلک دکھائی نہیں دیتی۔“

میں نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا، وہ ایک خواجہ سرا تھا جسے میرے دادا غیاث بیگ نے خرید کر تین سال پہلے آزاد کر دیا تھا۔ وہ مجھ سے چند سال بڑا لیکن قد و قامت میں چھوٹا اور منحنی سا تھا۔ وہ میرا بے حد خیال رکھتا تھا میں نے اُسے اجازت دے رکھی تھی کہ وہ تنہائی میں مجھ سے دوستوں کی طرح بات کر سکتا ہے۔ اُس نے ہمیں بتایا تھا کہ ایک جادوگر نے اُسے گول کنڈا کے علاقے سے لڑکپن میں اغوا کر لیا تھا۔ وہ اسے ساتھ لے کر سالوں سفر کرتا رہا۔ ایک آدھ بار اُس نے اپنے آقا کے پاس سے فرار ہونے کی کوشش کی لیکن پکڑا گیا حتیٰ کہ دادا حضور نے اُسے خرید لیا۔ اُسے حرم میں آمد و رفت کی اجازت دے دی گئی کیوں کہ اُس نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ خواجہ سرا ہے۔ پھوپھو مہر النساء کے ذاتی خواجہ سرانمیر نے اس کی تصدیق کی تھی۔ کبھی کبھی مجھے عیسیٰ کی اس کہانی پر شک گزرتا لیکن وہ اتنی تندہی اور وفاداری سے میری خدمت کرتا تھا کہ شاید کوئی اور کبھی نہ کر سکتا۔

”میں نے ایک خواب دیکھا ہے عیسیٰ، میری کوشش ہے کہ وہ سہانا سپنا لوٹ آئے۔“

”جب تم سوؤ گی تو وہ لوٹ آئے گا، آغاچی۔“ اُس نے معصومیت سے کہا۔

”اللہ کرے!“ میری زبان سے بے اختیار نکلا۔ ”تم یہ اٹھالو۔“ میں نے اُسے چاندی

”تم کچھ بھی سچ سچ کر سکتی ہو۔ پھل، مسالے، منقش بجسے۔۔۔“ پھوپھو نے اپنے صندوقچے میں ہاتھ ڈال کر زمرہ اور ہیروں کی پہنچیاں، جڑاؤ ہار، یا قوتی انگشتریاں اور نیلم اچھالتے ہوئے جواب دیا۔

”کیا آپ کے خیال میں وہ شاعی مینا بازار کے شایان شان ہوں گے؟“

”کیوں نہیں؟“ پھوپھو نے تیوریاں چڑھاتے ہوئے کہا۔

میں نے نظریں اٹھا کر پھوپھو کو دیکھا، وہ بھی میری طرف متوجہ تھیں۔ پھوپھو مہر النساء غیر معمولی خاتون اور حسن و شباب کا مہکتا مجسمہ تھیں۔ انہیں اپنی اس خصوصیت کا اتنی شدت سے احساس تھا کہ وہ دوسروں کے ساتھ ساتھ اپنے شوہر شیر آقلن جیسے دہنگ سردار کو بھی خاطر میں نہیں لاتی تھیں جن کی بہادری بے مثل اور یکتا تھی۔ میں نے خود کئی بار سردار شیر آقلن کو اُن کے سامنے سر جھکائے دیکھا تھا۔ پھوپھو اپنی زندگی کو سب سے بلند دیکھنے کی خواہش مند تھیں۔ اگر اُن کا بس چلتا تو وہ آسمان سے چاند اور ستارے توڑ کر انہیں بھی اپنے آنچل کی زینت یا خزانے کا حصہ بنا لیتیں۔

”لیکن پھوپھو، وہاں آنے والے صرف خریداری کرنے ہی تو نہیں آئیں گے۔“ میں نے دبے دبے انداز میں کہا۔ ”وہ زیورات کو کم اور بیگمات کو زیادہ دیکھیں گے، اُن کے سامنے رکھی چیزوں سے ہی تو اُن کی حیثیت کا اندازہ ہوگا۔“

”انہیں ہمارے حسن سے آنکھیں سیر کرنے کا اور موقع ہی کون سا ملتا ہے؟“ پھوپھو نے تیکھے انداز میں کہا ”عام عورتیں جہاں چاہیں جاسکتی ہیں اور جسے چاہیں دیکھ سکتی ہیں لیکن ہم تو اپنی عمر، پردے کے سنہرے جال کے پیچھے گزاردیتے ہیں۔“ پھوپھو کے انداز میں شکوہ پایا جاتا تھا ”ہم تو وہ خواب ہیں جن کی تعبیریں نہیں ہوتیں۔“

”ظن الہی کے علاوہ بازار میں اور کون ہوگا پھوپھو؟“ میں نے پُراشتیاق لہجے میں پوچھا، مجھ پر پھوپھو کے فلسفیانہ جواب کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

”بہت سے امراء اور مصاحبین۔“ پھوپھو نے اپنی آواز دھیمی کر لی۔ ”ہو سکتا ہے شہزادہ

عالم خرم بھی آئیں، کون جانتا ہے کہ آج لہراتے آنچلوں سے کیا کیا فسانے جنم لیں گے؟“

”کیسے فسانے پھوپھو؟“ میری نظریں اُن کے حسین چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔

کے زیورات تمہاری جو ایک ریشمی کپڑے میں لپٹے ہوئے تھے۔ ”کیا باقی بیگمات تیار ہو چکیں؟“

”ہاں آغا جی۔“

شاہی مینا بازار، شاہی محل کے وسیع و عریض سبزہ زار پر آراستہ ہوتا تھا۔ یہ خوب صورت باغ جمنا کے کنارے بنے ہوئے عظیم الشان لال قلعے کے اندرونی حصے میں واقع تھا جسے ظل الہی کے والد بادشاہ ہند، اکبر اعظم نے تعمیر کرایا تھا۔ انہوں نے ہی میرے دادا حضور کو ایران سے ہندوستان تشریف لانے پر ملازمت دی تھی۔ دادا حضور نے اکبر اعظم کی بہت خدمت کی لیکن بعض معاملات میں وہ رموز سلطنت سمجھنے میں ناکام رہے۔ دادا حضور تحفے قبول کرنے اور دینے میں بڑے فراخ دل واقع ہوئے تھے کیوں کہ ہمارے ہاں یعنی ایران میں اسے خیر سگالی کی علامت سمجھا جاتا تھا لیکن اکبر اعظم اپنے وزراء کے لیے یہ چیز پسند نہیں کرتے تھے چنانچہ انہوں نے دادا حضور کو برطرف کر دیا۔

اکبر اعظم کے انتقال کو دو سال ہو گئے تھے اور دادا حضور آب ظل الہی شہنشاہ جہانگیر کی خدمت کرنے کے خواہش مند تھے۔ شاہی مینار بازار میں ہمارے خانوادے کو شرکت کی دعوت دینے سے اُمید ہو چلی تھی کہ اب دادا حضور اپنی خواہش پوری کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

حویلی سے شاہی محل کا فاصلہ تین کوس تھا۔ منیر لائھی لے کر آگے آگے چل رہا تھا، وہ لوگوں کو راستے سے ہٹانے کے لیے بڑی بے دردی سے لائھیاں برساتا تھا۔ مجھے اُس روز آگرے میں بہت سے لوگ نظر آئے۔ مرد اور عورتیں، بنگال، ایران، یونان، ازبکستان، کیتھی، فرنگی، افغان اور ہندوستان بھر کے باشندے وہاں جمع تھے۔ آگرے کے مصروف بازاروں اور بھانت بھانت کے علاقوں سے گزرتے ہم بالآخر لال قلعے میں داخل ہو گئے۔

یہ امر سنگھ دروازہ تھا۔ دہلی دروازہ اور ہاتھی پل دروازہ مغل سپاہ کے لیے مخصوص تھے جو قلعے کے نصف سے زیادہ حصے پر بکھری ہوئی تھیں۔ ہم شاہی جوانوں کے پاس سے گزرے جن کی کلف لگی وردیاں، تیز دھار تلواریں اور ڈھالیں دیکھ کر خیال گزرتا تھا کہ شاید ہم کسی دوسری دنیا میں آگئے ہیں۔

قلعہ کسی کمان کی طرح خمیدہ انداز میں تعمیر کیا گیا تھا اس کی فصلیں ستر فٹ بلند اور دس فٹ چوڑی تھیں جن کے اوپر آگرے کی طرح کے دندا بنے ہوئے تھے۔ فصیل پر جا بجا برجیاں تھیں جن میں شاہی محافظ ہر وقت پہرہ دیتے تھے۔ محل کو جانے والی سرنگ میں داخلے سے قبل ہمیں لا تعداد دوسرے لوگوں کے ہمراہ امر سنگھ دروازے کے پاس انتظار کرنا پڑا۔ قلعہ دار ایک بڑے چبوترے پر بیٹھا آنے والوں کے بارے میں اپنا اطمینان کر رہا تھا۔ جس گلی میں ہم داخل ہوئے وہ دو بلند دیواروں کے درمیان رفتہ رفتہ بلند ہو جاتی تھی۔ ہمارے سامنے کٹڑی کی چھت والا دیوان عام تھا جبکہ شاہی محل، قلعے کی مشرقی دیوار کے ساتھ باغ کی دوسری جانب واقع تھا۔ محل سرخ پتھر سے تعمیر کیا گیا تھا جس کی دیواروں اور ستونوں پر مینا کاری کی گئی تھی۔

اس کے باوجود کہ ظل الہی قلعہ استعمال کرنے میں مکمل طور پر آزاد تھے لیکن وہ باغ سے متصل بارگاہ میں اقامت فرماتے تھے۔ یہ ایک خیمہ نما عمارت تھی جو بہت سے خوب صورت کمروں اور دیدہ زیب ساز و سامان سے آراستہ تھی۔ اس میں بچھے ہوئے قالین خصوصی طور پر کشمیر اور ایران سے منگوائے گئے تھے۔ پہلے مغل فاتح تیمور لنگ نے وصیت کی تھی کہ اُس کا کوئی جانشین کسی عمارت کی چھت کے نیچے نہیں سوئے گا اور ہر مغل شہنشاہ اپنے جد امجد کی وصیت پر پوری طرح عمل کرتا تھا۔ قلعے کے باقی حصوں میں باغات، بازار اور انتظامی محکموں کے دفاتر تھے۔

تین سال تک قلعے سے باہر رہنے کے دوران یہاں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں۔ مجھے ہر شے نئی لگ رہی تھی، محل، فوارے، باغوں کی روشیں، فصیل کے بلند و بالا کنکرے، ہاتھی گھوڑے، حتیٰ کہ یہاں کی ہوا بھی مجھے گاتی اور گنگناتی محسوس ہو رہی تھی۔ ہم اس وقت مغل سلطنت کے دل کے قریب تھے۔ ہمارے سامنے شاہی حرم کی عمارت تھی جس میں داخلہ شاید دنیا کا سب سے مشکل ترین کام تھا۔

سب سے پہلے ہمیں شاہی محافظوں کے جھمکے سے گزرنا پڑا۔ وہ تمام کے تمام نیزوں سے مسلح تھے۔ انہوں نے عورتوں کی تلاشی نہیں لی لیکن ہمارے قافلے میں شریک ملازمین اُن کی زد سے نہ بچ سکے۔ محافظوں کا اگلا دستہ محل کی غلام گردشوں میں متعین ازبک لونڈیوں کا

تھا۔ یہ بھی شاہی محافظوں کی طرح مسلح تھیں۔ وہ قد و قامت میں مضبوط مردوں سے کسی طور بھی کم نہ تھیں۔ انہوں نے عورتوں کو ٹٹول کر ان کے غیر مسلح ہونے کا یقین کیا۔ ان کے بعد خواجہ سرا موجود تھے۔ وہ اس بات کی تسلی کر رہے تھے کہ کوئی ایسا شخص جسے مردوں کے زمرے میں شمار کیا جاسکتا ہو، حرم کی حدود میں داخل نہ ہو سکے۔

ہمارے ساتھ بہت سی عورتیں اندر داخل ہوئی تھیں لیکن وہاں پہلے سے ہی لاتعداد جیمات موجود تھیں۔ میں نے اُس دن سے پہلے اتنی بڑی تعداد میں ایک جگہ اتنی بہت ساری حسین اور زرق برق پوشاکوں میں ملبوس عورتیں نہیں دیکھیں۔ عیسیٰ نے مجھے بتایا کہ وہاں اس وقت آٹھ ہزار سے زائد خواتین موجود تھیں۔ یہ ممکن تھا، کیوں کہ اکبر اعظم کی چار سو بیویاں اور پانچ ہزار لونڈیاں تھیں جن میں سے زیادہ تر اب بھی محل میں رہتی تھیں۔ جہانگیر کی طرح اُس کی بھی بہت سی شادیاں سیاسی اتحاد کا ذریعہ بنی تھیں۔ یہ مخصوص شادیاں ایک مقررہ وقت کے لیے ہوتی تھیں جس کے اختتام پر عورت کو بہت سے قیمتی تحائف کے ساتھ علیحدہ کر دیا جاتا تھا اور جو خواتین آخر وقت تک شادی کے بندھنوں میں جکڑے رہنے کی خواہش مند ہوتی تھیں انہیں شاہ وقت کی جانب سے وظائف اور بڑی بڑی جاگیریں عطا کی جاتی تھیں۔ ان دنوں حرم میں جو خواتین موجود تھیں ان میں راجپوت، کشمیری، ایرانی، بنگالی، تاتاری، منگول، تبتی اور روسی عورتیں شامل تھیں۔

محل میں بے شمار کمرے، دالان اور دیوان تھے۔ ان کی کشادگی، رہنے والے کے مقام کو مد نظر رکھ کر ترتیب دی گئی تھی۔ پورا محل ہوادار تھا لیکن پھر بھی بھاری بھر کم لباسوں میں ملبوس خواتین کی وجہ سے فضا کچھ بوجھل ہو رہی تھی۔ ہم نہایت سست رفتاری سے آگے بڑھ رہے تھے کیوں کہ وہاں موجود بہت سی خواتین پھوپھو کی واقف کار تھیں اور پھوپھو دو قدم چلنے کے بعد کسی نہ کسی کے پاس رک جاتی تھیں۔ انہوں نے بہت سی عورتوں کے کانوں میں سرگوشیاں بھی کی تھیں جو مجھے بہر حال سنائی نہیں دی تھیں۔

میں جلد ہی اس شور شرابے سے گھبرا گئی۔ سکون کی جگہ مجھے بالکونی نظر آئی اور میں وہاں جا کر باغ کا نظارہ کرنے لگی۔ مغلوں کا یہ وصف قابلِ تعریف تھا کہ انہوں نے ہر شے کو خوب صورتی عطا کر دی تھی۔ باغوں میں درخت مختلف پھلوں کے بوجھ سے جھکے ہوئے تھے،

ہر جانب رنگوں کی برسات اور پھولوں کی بہار تھی۔ گلاب، گل داؤدی، گل یاسمین، گل بنفشہ، گل عنبر اور ایسے پھولوں کے پودے تھے جن کا کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ باغ میں مصنوعی جھرنے بنائے گئے تھے جن سے پانی گرنے کی آواز موسیقی سے مشابہ تھی۔ انہیں مخصوص کنوؤں سے پانی فراہم کیا جاتا تھا جن کے لیے بیلوں کی چھتیں جوڑیاں دن رات مصروف رہتی تھیں۔

”ارے تم یہاں ہو؟“ پھوپھو کی آواز سن کر میں پلٹی۔ ”میں تمہیں ہر جگہ تلاش کرتی پھری ہوں۔“ پھوپھو کے ساتھ ایک چھوٹے قد کی خاتون بھی تھیں جو اپنے ریشمی لباس کی طرح نرم و نازک اور چھوٹی موٹی سی تھیں۔

”ملکہ عالیہ، یہ ہے میری بھتیجی، ارجمند۔“ پھوپھو نے نہایت ادب سے ملکہ عالیہ، کشور ہندوستان سے میرا تعارف کرایا۔

میں فوراً ملکہ ہند کے حضور کورنش بجالائی۔ ملکہ کے چہرے پر کچھ ایسے تاثرات تھے جیسے وہ میری خاموشی سے نالاں ہوں۔ وہ مجھے ملکہ ہو کر بھی بے حد اداس اور کھوئی کھوئی سی لگیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں عظیم سلطنت کی عظیم لیکن مغموں ملکہ سے کیا کلام کروں۔ پھوپھو کی زبان البتہ اس عرصے میں مسلسل چلتی رہی، وہ ملکہ سے مینار بازار کے بارے میں باتیں کر رہی تھیں۔

مہارانی مان متی، ہندو راجپوت تھیں اور ولی عہد سلطنت شہزادہ شہاب الدین محمد خرم کی والدہ تھیں۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ پھوپھو کے ملکہ سے بھی دوستانہ مراسم ہوں گے۔ اس دوستی نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا لیکن میں اس سوچ کو الفاظ کا جامہ کبھی نہ پہنا سکی۔

”بے وقوف۔“ ملکہ جونہی روائی کے لیے پلٹیں، پھوپھو کی سرگوشی سنائی دی۔

میں نے چونک کر انہیں دیکھا۔

”تو پھر آپ ان سے ہنس کر باتیں کیوں کر رہی تھیں؟“ مجھے پھوپھو کا تبصرہ ایک

آنکھ نہ بھایا تھا۔

”کیوں کہ میں ظلِ الہی کی محبوب ملکہ سے الگ تھلک نہیں رہ سکتی تھی۔“ پھوپھو نے

بندھا ہوا تھا۔ گردن کے گرد سونے کے تین جڑاؤ اور بھاری ہاتھ جو مرویدار کے تھے۔ بازو پر ہیروں جڑے امام خامن اور کلائیوں میں لعل لگے تین بازو بند تھے۔ انگلیوں میں قیمتی پتھروں کی انگوٹھیاں جگمگاتی تھیں، پیروں کی نقیس جوتیوں پر سونے کی تاروں کا کام تھا۔

شہنشاہ کے پیچھے دو آدمی چل رہے تھے، اُن میں سے ایک نے ترکش اور کمان اٹھارکھی تھی جبکہ دوسرے کے ہاتھ میں ایک پستک تھی۔ پستک (کتاب) بردار کے پیچھے ایک غلام قلم دوات لیے چل رہا تھا۔ یہ پستک صرف ظل الہی کے لیے مخصوص تھی جس میں وہ اپنے تجربات رقم کیا کرتے تھے۔

میرا چھوٹا سا کلبہ (دکان) داخلی دروازے سے کچھ فاصلے پر نیم کے ایک پیڑ کے نیچے تھا۔ جبکہ پھوپھو نے اپنی دکان فوارے کے قریب روشنیوں کی جگمگاہٹ میں سجائی تھی۔ میں بار بار اپنے زیورات کی ترتیب بدل رہی تھی لیکن ظاہر ہے میرے ہاتھ کوئی جادو کی چھڑی تو تھے نہیں کہ اُن کی مالیت و ماہیت میں اضافہ ہو جاتا۔

”انہیں کون خریدے گا عیسیٰ“۔ میں نے اپنے ہم راز و دمساز غلام کو مخاطب کیا۔

”کوئی بہت ہی خوش قسمت شخص آغاچی۔“

”وہ کوئی بے وقوف ہی ہوگا، بازار میں اس سے کہیں زیادہ اچھی اور خوب صورت چیزیں موجود ہیں۔“

امراء سلطنت بھی اب شہنشاہ کے عقب میں پہنچ گئے تھے، جن میں سے کچھ بازار میں ادھر ادھر پھیل گئے تھے۔ میں اتنے سارے لوگوں میں اپنے نقاب کے بغیر، بڑی بے چینی محسوس کر رہی تھی۔ میں جانے کیا کیا سوچتی رہی کہ دادا حضور کی شناسا آواز نے مجھے چونکا دیا۔

”تم تو پوشیدہ ہو کر بیٹھی ہو، ارجمند“

میں نے ماتھے تک ہاتھ لے جا کر انہیں آداب کیا تو وہ مسکرائے۔ میں نے بھی مسکرانے میں اُن کا ساتھ دیا۔ میں انہیں بے تحاشا چاہتی تھی کیونکہ ان کی بلند و بالا شخصیت چاہے جانے کے قابل تھی۔ اُن کی آنکھیں بھی میری طرح ڈوبے سورج کی شعاعوں جیسی شریقی تھیں۔

عورتوں سے آئے ہوئے کمرے کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”اور پھر میں یہ بھی جانتا چاہتی تھی کہ وہ کن عادات و خصائل کی حامل ہے، کیا ملکہ ہے؟ اُسے دیکھ کر مجھے جہانگیر کی شراب نوشی پر کوئی حیرت نہیں ہوئی۔“ پھوپھو نے تنہائی میں تمام حفظ مراتب کو پس پشت ڈال دیا تھا۔

”میں نے سنا ہے کہ ظل الہی، مہارانی سے شادی سے قبل بھی شراب نوشی کرتے تھے۔“ میں نے کہا۔ ”اُن کے دونوں بھائیوں کا انتقال بھی اسی باعث ہوا تھا۔“

”اور اگر وہ اس عورت کے ساتھ رہا تو زیادہ عرصہ نہیں جی سکے گا۔“ پھوپھو نے ناک سکوڑ کر کہا۔

”آپ اس سلسلے میں کیا کر سکتی ہیں؟“

”یہ سوچنا تمہارا کام نہیں۔“

وہ اچانک روانہ ہو گئیں اور پھر ہواؤں کے دوش پر پرواز کرنے والی خوب صورت چڑیا کی طرح زرق برق خواتین کے ٹھرمٹ میں کھو گئیں۔ میں نے تھوڑی دیر تو پھوپھو کی باتوں پر غور کیا لیکن پھر میرا سر دُکھنے لگا۔۔۔ تو میں شانے اُچکا کر دوبارہ باغ کی رنگینیوں میں کھو گئی۔ نصف شب سے ذرا قبل مینا بازار کا گوشہ گوشہ، چوب داروں کی پاٹ دار آوازوں سے گونج اٹھا۔

”سجدے میں نگاہ رہے۔۔۔ تمام ہوش و خرد پیش بادشاہ رہے۔۔۔ ظل اللہ، عالم پناہ شہنشاہ نورالدین محمد جہانگیر تشریف لاتے ہیں۔۔۔“

میں نے نگاہیں اٹھا کر دیکھا۔ ظل الہی اپنے لیے بچائے ہوئے خصوصی سُرخ قالین پر اپنے تلیے قدم اٹھاتے آگے بڑھ رہے تھے۔ دادا حضور، غیاث بیگ اُن کے ہمراہ تھے۔ بادشاہ نے ایک ریشمی پگڑی باندھ رکھی تھی جس کے وسط میں مور کا ایک خوب صورت بر لگا ہوا تھا۔ پر کے دونوں جانب اخروٹ کے برابر دو بڑے بڑے ہیروں تھے جو سونے کی زنجیروں سے لگے ہوئے تھے۔ اور دونوں ہیروں کے درمیان ایک بڑا سا مرد آویزاں تھا۔ شہنشاہ کی کمر کے گرد سونے کا ایک پتکا بندھا ہوا تھا جس پر یاقوت اور نیلم جڑے ہوئے تھے۔ حضرت ہمایوں کی تلوار، سنہری میان میں بائیں جانب اور منقش طلائی دستے والا خنجر دائیں جانب

”کیا آپ کچھ خریداری فرمائیں گے دادا حضور۔“ میں نے خالصتاً دکان داروں کے اعداد میں پوچھا۔ ”ورنہ اس دکان دار سے کوئی کچھ نہیں خریدے گا۔“

انہوں نے مجھے قریب کھینچ لیا۔ ”ابھی تو بازار شروع ہوا ہے جان پدر! لیکن اگر یہاں سارے ہی بے وقوف آئے ہیں تو فکر مت کرنا، میں واپس آ کر تمہارا سارا خزانہ خرید لوں گا، لیکن مجھے مناسب داموں دینا۔“ انہوں نے میری پیشانی کو بوسہ دیا اور آگے بڑھ گئے۔

پھر لوگوں کے پرے کے پرے آنے شروع ہو گئے۔ کہنے کو وہ امراء سلطنت تھے، لیکن فطرتاً ہی بے اور طمع زدہ لوگ! وہ مجھے دیکھ کر جھٹے اور پھر سرگوشیوں میں مصروف ہو جاتے۔ ان میں سے کسی کو میرے قریب آنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں ایک ایک کا منہ فوج لوں، ان کی بے باک آنکھیں نکال ڈالوں، لیکن میرے علاوہ بازار میں موجود دوسری خواتین ہنس ہنس کر ان سے باتیں کر رہی تھیں۔

میں تھوڑی دیر اس تماشے سے لطف اندوز ہوتی رہی اور پھر میں نے شہنشاہ کو پھوپھو کی دکان پر رکھ دیکھا۔ شاہ نے کچھ خریدا، اُن سے کوئی سرگوشی کی اور آگے بڑھ گئے۔ وہ بہت خوش نظر آ رہی تھیں۔ اُن کی نگاہیں کچھ دور تک بادشاہ کا تعاقب کرتی رہیں لیکن پھر وہ دوسرے امراء کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

دفعتاً مجھے احساس ہوا کہ کسی کی آنکھیں مجھے مسلسل دیکھ رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہم عورتوں کو یہ جس عطا کی ہے کہ ہمیں نگراں آنکھوں کا فوراً احساس ہو جاتا ہے۔ جانے کیوں مجھے محسوس ہوا کہ وہ آنکھیں مجھے اپنی طرف رخ کرنے پر اُکسارہی ہیں۔ اُن کی تپش مجھے اپنے رخساروں پر محسوس ہو رہی تھی۔ میں رفتہ رفتہ مڑی اور پھر میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔۔۔ میری جانب نگراں آنکھیں ولی عہد سلطنت شہزادہ شہاب الدین محمد خرم کی تھیں۔

ooo

شہاب الدین

مجھے یعنی، پندرہ سالہ خرم کو نہیں بلکہ مطلق العنان اور خود مختار شہزادے، ولی عہد اقلیم ہندوستان اور فرمانروائے سلطنت مغلیہ ظل الہی شہنشاہ نور الدین محمد جہانگیر کے سب سے عزیز اور پیارے سپوت شہزادہ شہاب الدین محمد خرم کو بھی شاہی مینا بازار میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ میرے لیے اس قسم کی کسی تقریب میں قدم رنجہ ہونے کا یہ پہلا موقع تھا، اس لیے مجھ میں ہلکا سا جوش پایا جاتا تھا۔ اس سے دوسروں کو میری اہمیت کا احساس بھی ہوتا کیوں کہ ظل الہی نے مجھے اپنے تین دوسرے بیٹوں پر فوقیت دے کر اس عظیم مغلیہ قلمرو کا وارث مقرر کیا تھا۔

شاہی مینا بازار کی رسم میرے پردادا حضور، حضرت ہمایوں نے شروع کی تھی۔ مجھے یہ سب بہت اچھا لگا کیوں کہ مملکت کی خوب صورت ترین خواتین اس بازار میں اپنے نقابوں اور حجابوں کے بغیر شریک ہوتی تھیں۔ نہایت معتمد اور وفادار امیروں کو بازار میں خریداری کی اجازت دی جاتی تھی۔ حرم کی خواتین بھی پورا برس اونچی اونچی چار دیواریوں میں مقید رہ کر کچھ پہروں کے لیے باہر نکلتی تھیں۔

جوں جوں شام کے سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے مینا بازار کی تیاریاں بھی بام عروج کو چھو رہی تھیں۔ غلام، باغ کے مختلف گوشوں میں شامیانے اور خیمے نصب کرنے میں مصروف تھے اور خواتین یقیناً اُن زیورات و جواہر کا انتخاب کر رہی تھیں جو وہ اس بازار میں فروخت کے لیے پیش کرنے والی تھیں۔

میں نے غسل کر کے شاہانہ پوشاک زیب تن کی۔ منہ چڑھی لونڈیاں اور کنیریں، بازار

مرمر کے بنے ہوئے خوب صورت مجسمے فروخت کر رہی تھیں۔ میری موجودگی سے ہر مردہ چہروں پر رونق لوٹ آئی تھی۔ ہر نوجوان لڑکی کی خواہش تھی کہ میں اُس کی طرف متوجہ ہو جاؤں۔ وہ اپنے اپنے طور اور انداز سے مجھے لہانے اور بہلانے کی کوششیں کر رہی تھیں۔

لیکن مجھے ان میں سے کسی کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میری بے قرار نگاہیں ایک سے دوسرے چہرے پر پھسل رہی تھیں اور پھر وہ ایک جگہ جم کر رہ گئیں۔۔۔ وہ ایک ذیلی پتلی اور سڈول سی خوب صورت اور من موہنی دوشیزہ تھی جو اس سارے ہنگامے اور تماشے سے بے نیاز گھٹنوں کے بل بیٹھی جانے کہاں دیکھ رہی تھی۔ اُس کے سادہ کتابی چہرے، بڑی بڑی غلافی آنکھوں، ادھ کھلے گلاب سے ہونٹوں، لمبے سیاہ بالوں اور ان بالوں میں گندھے ہوئے واحد گل یا سمیں نے میری نظروں کو وہیں مقید کر لیا۔

وہ میری طرف متوجہ نہیں تھی۔۔۔ میں نے دل ہی دل میں اللہ کو پکارنا شروع کر دیا اور پھر اُس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب اُس نے اپنا رخ بدل لیا۔ اب وہ آہو چشم۔۔۔ براہ راست میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میرا دل بس سے باہر ہو رہا تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ میں کس طرح اُس تک پہنچا۔۔۔ بس یوں لگا جیسے کسی نادیدہ قوت نے مجھے کوہ قاف کی اس پری تک پہنچا دیا تھا۔

اُس کے پاس بیچنے کو صرف چاندی کے کچھ زیورات تھے۔ اُس نے مجھے کوئی پیش کش نہ کی۔ بس اُس کی پلکوں کی چلمنیں ایک بار اُنھیں اور پھر آنکھریوں پر سایہ فلن ہو گئیں۔ اُس کا نازک سراپا، تھر تھرا رہا تھا۔

”تمہیں کس نام سے پکاریں، شمشاد نو خیز؟“

”ارجمند بانو، صاحب عالم۔“ اُس کے لب لعلیں واہوئے۔

میرے کانوں میں نفرتی گھنٹیاں بج اُنھیں۔ وہ کورنش بجالانے کے لیے جھک گئی۔ میں نے کندھوں سے پکڑ کر اُسے اپنے سامنے استادہ کر لیا اور پھر اُس کے حُسن جہاں سوز میں کھو گیا۔ اُس کے عارض تپ اٹھے۔

”ہمیں اعتراف ہے کہ ہم اپنا دل تمہاری پلکوں کی اوٹ میں بھولے جا رہے ہیں۔“

”صاحب عالم!“ وہ صرف اتنا ہی کہہ پائی تھی۔

میں متوقع خواتین کے بارے میں ہلکے بھلکے مذاق کر رہی تھیں۔ بقول اُن کے۔۔۔ میں آج کے اس بازار میں کسی شہزادی سے ملنے والا تھا۔ شاہی جوتی نے پیش گوئی کی تھی کہ شہزادہ یعنی میں بہت خوش قسمت رہوں گا، میں شہزادی کی محبت میں گرفتار ہو جاؤں گا اور ہم ہنسی خوشی زندگی بسر کریں گے۔

میں نے کینروں کی باتوں کو ہنسی میں اُڑا دیا کیوں کہ میں کسی قسم کے نیک یا بد شکون پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ میرے لیے یہ محبتیں، ایک کھیل سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھیں۔ یہ تو چہروں، آنکھوں اور ہاتھوں کی عیاشیاں تھیں۔۔۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

میرے دو مصاحبین اجازت طلب کر کے اندر آ گئے۔ ان میں ایک نواب اجیر اور دوسرے علامہ سعد اللہ خان تھے۔ دونوں نے آج شام کے لیے خاصا اہتمام کر رکھا تھا۔ اُن کا جوش اُن کے چہروں سے ہوتا تھا۔ اس سے پہلے اُنہوں نے شاہی مینا بازار میں کبھی شرکت نہیں کی تھی۔

پھر مجھے بالکونی سے چوب دار کی آواز سنائی دی۔ وہ ظل الہی کے قدم رنجہ ہونے کا اعلان کر رہا تھا۔ میں نے جھانک کر دیکھا، ایک لمحے کے لیے پورے باغ پر سکوت چھا گیا۔۔۔ رعب شاہی سے سب کی زبانیں گنگ ہو گئی تھیں۔۔۔ پھر میں نے شہنشاہ کو ہاتھ اٹھا کر اشارہ کرتے دیکھا اور اُس کے ساتھ ہی باغ کے مختلف گوشوں سے رنگ و نور اور نغمہ و آہنگ پھوٹ پڑے۔

چند ثانیوں کے توقف کے بعد چوب دار کی آواز دوبارہ قلعے کے درود یوار سے نکرانے لگی۔

”باادب، بالملاحظہ، ہوشیار نازش لوح و قلم، صاحب خورشید علم، ولی عہد سلطنت، صاحبو عالم شہزادہ شہاب الدین محمد خرم تشریف لاتے ہیں۔“

میں نے اپنے مصاحبین کو ہمراہ لیا اور شاہانہ چال چلتے ہوئے باغ میں داخل ہوا۔ بازار کیا تھا، رنگ و نور کا سیلاب تھا۔ لہراتے آنچلوں اور سرسراتے ملبوسات کی بہار تھی۔ پایہ تخت اور شاہی حرم کی خوب صورت ترین خواتین اپنے اپنے رخِ زیبا سے نقائیں اٹھائے ریشمی ملبوسات، سونے اور چاندی کے زیورات، کھلونے، خوشبوئیات، ہاتھی دانت اور سنگ

”ہم دوسروں کے لیے صاحبِ عالم اور شہزادے ہیں۔۔۔ تم ہمیں خرم کہہ کر پکارو۔“
 ”کنیز اس گستاخی کی جرأت نہیں کر سکتی، صاحبِ عالم۔“
 ”ہم اپنے من پسند گستاخوں کی خطائیں معاف کر دیا کرتے ہیں، ماہوش۔“
 ”کنیز معافی چاہتی ہے، ص۔۔۔ صاحب۔۔۔ شہزادہ عالی مقام۔“ وہ انگلی، اُس کی
 نگاہیں میرے چہرے پر جم گئیں لیکن مجھے اُن میں اپنی صورت نہیں۔۔۔ خلائے بیٹ کی
 ویرانیاں نظر آرہی تھیں۔
 ”ارجمند۔“

”جی شہزادے۔“ وہ خواب میں بول رہی تھی۔ ”کنیز ہر خدمت بجالانے کو تیار ہے۔“
 ”کھوئے ہوئے لوگ ہمیشہ کے لیے کھو جاتے ہیں۔۔۔ ارجمند، کیا سوچ رہی ہو؟“
 ”مجھے اپنا سپنا یاد آ گیا، شہزادے۔“
 ”کیسا سپنا؟“

”میں پورا سپنا نہیں بتا سکتی۔“ اُس نے تھر تھراتی آواز میں کہا۔ ”بس۔۔۔ بس یوں
 لگتا ہے صاحبِ عالم کہ وہ آپ ہی تھے۔۔۔ وہ جو میرے تخت کے ساتھ یک جان ہو جاتا
 ہے۔۔۔ وہ سایہ آپ کا تھا شہزادے۔۔۔ میں پھر کہیں سپنا تو نہیں دیکھ رہی۔“ وہ رک رک
 کر اور جھجک جھجک کر بول رہی تھی۔
 ”نہیں ارجمند۔۔۔ ہمیں چھو کر دیکھو۔۔۔ ہم پوری حقیقتوں کے ساتھ تمہارے
 سامنے ہیں۔“

وہ کھل کھلا کر ہنس دی۔ میرے آس پاس جل ترنگ بج اٹھے۔

”تم ہمارے مل گئے دنوں کے لیے سورج بن جاؤ جانِ خرم، ہم ان اندھیروں سے
 گھبرا گئے ہیں، ہماری شبوں کی سیاہیوں کو اپنے زرخِ زیبا سے متور کر دو۔۔۔ ارجمند۔“
 ”کنیز۔۔۔ دل و جان سے حاضر ہے۔“

”تم کنیز نہیں، جانِ خرم ہو۔۔۔ اپنی توہین نہ کرو۔“ میں نے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ

دیا۔

”کنیز ہمیشہ کنیز ہی رہے گی، شہزادے۔“ اُس نے میرا ہاتھ بٹا دیا۔

”اور اگر ہم شہزادے نہ ہوتے پھر؟“

”پھر بھی یہ کنیز، آپ کی کنیز ہی رہتی۔۔۔“

میں اُس کے سحر میں کھو گیا۔ اُس کے خُسن نے مجھے مقید کر لیا تھا۔ جانے کتنا وقت یونہی
 گزر گیا۔ دفعتاً عقب سے کسی کی ذری سہمی آواز مجھے سنائی دی۔

”صاحبِ عالم!“

”کون گستاخ ہے؟“ میں پلٹا۔

علامہ سعد اللہ خاں نے جھک کر مجھے تعظیم دی۔

”آپ کی تلاش ہو رہی ہے صاحبِ عالم، سب خواتین آپ کا پوچھ رہی ہیں۔“

”ہم ابھی آرہے ہیں۔“ میں نے جواب دیا اور علامہ کو جانے کا اشارہ کیا، انہوں نے

فوراُتھیل کی۔ میں دوبارہ اپنی محبت کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”ہم تمہارے بارے میں ظلِ الہی سے بات کریں گے۔“

”اگر یہ ظلِ الہی کی خواہش۔۔۔“

”یہ ہماری خواہش ہے۔“ میں نے اُسے جملہ پورا نہیں کرنے دیا۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا،

وہ بدستور گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھی ہوئی تھی لیکن اُس کا چہرہ میری جانب اُٹھا ہوا تھا۔ اس

سے پہلے کہ میں پلٹتا اُس نے سامنے پڑے زیورات میں سے چاندی کی ایک انگشتری اُٹھا

کر مجھے تھما دی۔

”کیا میری محبت، یادگار کے طور پر کچھ خریدے گی نہیں؟ آپ خالی ہاتھ تو نہ جائیں

شہزادے، مجھے کم از کم ایک دوا شریفوں کی آمدنی تو ہونی چاہیے۔“

”تم ایک اشرفی کا کیا کرو گی، جانِ خرم۔“

”کسی غریب کو دے دوں گی، وہ ہم سے زیادہ ضرورت مند ہیں۔“

”غریب؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”کیا میرے شہزادے کو غریبوں کے بارے میں علم نہیں، وہ قلعے سے باہر رہتے

ہیں۔“

”جب ہم تمہارے ساتھ ہوں گے تو اپنی قلمرو کی ہر چھوٹی بڑی شے کا معائنہ کریں گے،

ارجمند بانو

انسان اگر ہزار برس بھی زندہ رہے تو اُسے اپنی گوری ہوئی طویل عمر۔۔۔ ایک مختصر سا
سپنا محسوس ہوتی ہے۔ یوں لگتا ہے، ابھی سوئے تھے، ابھی آنکھ کھل گئی۔
میری ملاقات ہزار برسوں کی نہیں بلکہ چند لمحوں کی تھی۔ پھولوں کی عمر سے بھی مختصر عمر
پائی تھی۔۔۔ میرے سپنوں کی تعبیر نے!

شہزادہ چلا گیا اور میں دیکھتی رہ گئی۔ میں شہزادے کو روکنا چاہتی تھی لیکن ایسا نہ کر سکی اور
پھر اچانک ہی مجھے اپنی حیثیت کا ادراک ہو گیا۔ وہ ولی عہد سلطنت اور ہندوستان کا ہونے
والا بادشاہ اور میں ایک معتبوب امیر کی کم سن اور نا سمجھ پوتی۔۔۔ ایک دھرتی دوسرا آکاش
۔۔۔ ایک آس دوسرا نراش۔۔۔ ایک کسی تنگ و تاریک کوٹھڑی کی گھٹن، دوسرا فضائے بسیط،
ایک۔۔۔

عیسیٰ کے سامنے آ جانے سے میرے خیالات کا تسلسل چھناک سے ٹوٹ گیا، میں
عالم مدہوشی سے عالم خود شناسی میں واپس آ گئی تھی۔ عیسیٰ چاندی کے زیورات اکٹھے کرنے
لگا اور میں نے سورج مکھی کی رنگت کا ریشمی دوپٹا اُسے دے دیا تاکہ وہ زیورات اُس میں
باندھ سکے۔

”تمہیں کتنا زبردست منافع ہوا ہے آغاچی!“ عیسیٰ نے اشرفیوں کی تھیلی دیکھتے
ہوئے کہا۔ ”اتنی قیمت واقعی ایک شہزادہ ہی لگا سکتا تھا۔“

میں پھر بھٹک گئی۔۔۔ میری بے چین نگاہیں لہراتے آنچلوں گنگناتے لبوں اور دکتے
عارضوں پر پھسلنے لگیں۔ اگر کسی اور دکان پر شہزادے کو مجھ جیسی لڑکی ٹکرا گئی اور اُس نے بھی

اگر تمہاری آمدنی غریبوں کے لیے ہے تو پھر ہم سب کچھ خرید رہے ہیں، کیا قیمت ہے؟“
وہ جھجکی، اُس نے پہلے اپنے سامنے پھیلے چاندی کے زیورات کو اور پھر مجھے دیکھا اور
کھل کھلا کر ہنس دی۔ ”دس ہزار اشرفیاں۔“
”اور اگر ہم مول تول کریں۔“ وہ بدستور ہنستی رہی میں نے اپنے عقب میں کھڑے
غلام کو اشارہ کیا اور اُس نے طلائی اشرفیوں کی پوری تھیلی اُس کے ہاتھ پر رکھ دی۔
”ہم تم سے دوبارہ ملیں گے، جان خرم۔“

ooo

تمہیری

1042ھ (1632ء)

ممتاز محل

مورتی نے جب پہلی بار آگرہ دیکھا تو وہ ایک اندھیری رات تھی۔ وہ اپنی بیوی اور تین سالہ بچے کو قافلے کے ہمراہ چھوڑ آیا تھا جہاں وہ رات کے کھانے کی تیاری میں مصروف تھے۔ وہ تنہا تاریکی کا سینہ چیرتا روشنیوں کے شہر کی جانب خراماں خراماں چلا جا رہا تھا۔ وہ ان روشنیوں سے بڑی توقعات وابستہ کر چکا تھا، لیکن یہ آسمانوں پر بیٹھ کر فیصلے کرنے والا بھگوان ہی جانتا تھا کہ اُس کی آشائیں پوری ہو سکتی تھیں یا نہیں۔

اُس نے مڑ کر پڑاؤ کی طرف دیکھا، جہاں اب آگ کے چھوٹے چھوٹے الاؤ نظر آرہے تھے، اُس نے سامنے پھیلے اندھیرے اور اُس میں پوشیدہ خطرات کی بو سونگھ کر ایک لمحے کے لیے پلٹنے کا فیصلہ کیا لیکن اُس کا جوش، خوف پر حاوی آ گیا۔ وہ رات کی سیاہی میں ہی اپنی تقدیر کا چاند تلاش کرنا چاہتا تھا جو جتنا کہ اُس پار۔۔۔ مغل راجدھانی آگرہ کی صورت اُس کے سامنے تھا۔

اُس کا ذہن انتشار کا شکار تھا۔ اُس کا پورا جسم یقینی اور بے یقینی کے بیچوں بیچ جھکولے لے رہا تھا۔ ہر اٹھنے والے قدم کے ساتھ وہ سوچتا کہ لوٹ جائے، لیکن قدم اُٹھ کر وہ فاصلے ختم کر رہا تھا، بڑھانہیں رہا تھا۔

اُسے اپنا گھر چھوڑنے کا دکھ تھا۔ آگرہ کے بلند و بالا محلات کے ہیولے دیکھ کر اُس کی آنکھوں سے اشک بہ نکلے۔ اُس نے انہیں روکا نہیں بلکہ رخساروں پر راستہ بنانے دیا۔ وہ جانتا تھا کہ کسی کی یاد میں بہنے والے آنسو ایک خراج ہوتے ہیں اور یہ اُس کے گھر کی یاد میں

یوں ہی شہزادے۔۔۔!

”عیسیٰ۔۔۔“ میں اپنی سوچ سے پریشان ہو گئی۔ ”دیکھو، صاحبِ عالم ابھی مینا بازار میں ہیں یا واپس چلے گئے؟“

عیسیٰ نے جن نظروں سے مجھے دیکھا میں انہیں بخوبی سمجھ گئی۔ وہ میرے دل و دماغ کی آویزش سے آگاہ ہو گیا تھا لیکن مجھ سے کچھ کہے بغیر ہجومِ دلبراں میں غائب ہو گیا۔ میں نے بے خودی میں اشرفیوں کی تھیلی اٹھالی اور اُسے آہستہ آہستہ تھکنے لگی۔ میں اپنے عمل میں اس قدر کھو گئی کہ مجھے عیسیٰ کی واپسی کا احساس ہی نہ ہوا۔ اُس وقت چونکی جب اُس نے مجھے مخاطب کیا۔

”صاحبِ عالم واپس تشریف لے گئے ہیں، آغاچی۔“ اُس نے مجھے آگاہ کیا۔ ”وہ تنہا گئے ہیں۔“

وہ یوں خاموش ہو گیا جیسے کچھ اور بھی کہنا چاہتا ہو۔ میں نے نظروں سے اُس کی حوصلہ افزائی کی۔

”کیا تم یہاں رکو گی آغاچی؟“

”کس لیے؟ چلو ہم بھی چلیں۔“

○○○

محبت واقعی ایک درد تھا۔ اس کا احساس مجھے اُس وقت ہوا جب میں سونے کے لیے لیٹی اور سونہ سکی۔ جونہی آنکھیں موندتی۔۔۔ سامنے شہزادہ خرم آکھڑا ہوتا۔ جب لاڈلی سونے کے لیے کمرے میں داخل ہوئی، میں اُس وقت بھی جاگ رہی تھی لیکن ظاہر یہی کیا کہ میں سو رہی ہوں۔

ذرا دیر بعد دروازہ پھر کھلا۔ میں نے پازیبوں کی جھنکار سنی اور ذرا سی آنکھیں کھول کر آنے والے کو دیکھا۔ وہ پھوپھو مہر النساء تھیں۔ وہ میرے سرہانے آ کر کھڑی ہو گئیں اور ٹھنکی باندھ کر مجھے دیکھنے لگیں۔ میں اُن کے چہرے کے تاثرات تو نہ پڑھ سکی لیکن مجھے اُن کی موجودگی سے ایک عجیب سی بے کلی کا احساس رہا۔ تھوڑی دیر پھوپھو اسی طرح کھڑی رہیں اور پھر لاڈلی کو ایک نظر دیکھتے ہوئے باہر نکل گئیں۔

○○○

بخشا جائے۔

راجا نے اُس کی درخواست قبول کر لی اور مورتی کو ز اور راہ کے علاوہ ہاتھی دانت کا بنا ہوا کرشن بھگوان کا ایک مجسمہ شہنشاہ کے لیے تحفہً دے کر رخصت کر دیا۔
اور اب مورتی جمنہ کے کنارے کھڑا۔۔۔ اس عظیم الشان قلعے کی بلند و بالا فصیلوں کو دیکھ رہا تھا جن کے اُس پار اس سلطنت کا اُجڑا ہوا ڈلہا آباد تھا۔



برہے تھے۔۔۔ وہ گھر کہ جس کے سائے بھی اب جمنہ کے ارد گرد کی تاریکیوں میں مدغم ہو رہے تھے۔

اُسے ایک موہوم سی امید تھی کہ کبھی نہ کبھی وہ اپنے گاؤں، اپنے گھر لوٹ سکے گا، لیکن کب؟ یہ سوائے بھگوان کے کوئی نہیں جانتا تھا۔
اُس نے اپنا گھر اور گاؤں اپنی مرضی سے نہیں چھوڑا تھا۔ اُسے شمال کی جانب سفر کرنے پر مجبور کیا گیا تھا۔

وہ ایک لچار یہ تھا اور دیوی دیوتاؤں کے بت تراشنے میں اُسے خصوصی مہارت حاصل تھی۔ یہ کام اُس کے خاندان میں پرکھوں سے ہو رہا تھا۔ اُس جیسے دست کاروں اور سنگ تراشوں نے جنوبی شہروں مدورئی، کانچی پورم اور ترپوندرم میں کئی عظیم مندر اور مقبرے تعمیر کیے تھے اور خود اُسے، اُس کے گاؤں میں بڑی قدر و منزلت سے دیکھا جاتا تھا۔ اپنے باپ اور بڑوں کی طرح وہ پتھر کو چہرے کے نقوش، جسم کے خطوط، اور منہ کو زبان عطا کرنے پر قادر تھا اُس کے ہاتھ میں آ کر پتھر بولنے لگتے تھے۔

لیکن ایک روز اُس کی زندگی کی یہ کچی ڈور ٹوٹ گئی۔
اُس نے ڈور جوڑنے کے لیے اپنے تراشے ہوئے بھگوانوں سے پرارتھنا کی لیکن اُس کی کسی پرارتھنا نے اُس کی نراش کو آس میں نہیں بدلا اور یوں پتھر کے ان اصنام پر سے اُس کا اعتقاد اور وشواس ڈالواں ڈول ہو گیا۔

اُس کے باپ کو اُن کے اُن داتا، راجا گونئی کل نے ایک دن آگرہ کی جانب سفر اختیار کرنے کی ہدایت کی۔ راجا نے سنا تھا کہ عظیم مغل تاجدار شہنشاہ شہاب الدین شاہ جہاں اپنی مرحومہ ملکہ ممتاز محل کا ایک عالیشان مقبرہ تعمیر کرنا چاہتا ہے اور اس کے لیے پورے ہندوستان کے کونے کونے سے معمار، بڑھئی، سنگ تراش اور دوسرے ہنرمندوں کو آگرہ طلب کیا گیا ہے۔ چنانچہ راجا نے اپنے عظیم بادشاہ کی مدد کے لیے۔۔۔ اپنی ریاست کے بہترین سنگ تراش کو بھیجنے کا فیصلہ کیا تھا۔

مورتی کے والد نے راجا کا شکریہ ادا کیا لیکن ساتھ ہی یہ گزارش بھی کی کہ عمر رسیدہ ہونے کے باعث شاید وہ یہ سفر نہ کر سکے اس لیے اُس کے ایک بیٹے کو شاہ کی خدمت کا شرف

وہ قلعے کے ساتھ ساتھ بننے والے شوریدہ سردریا کی طرف بڑھتے رہے۔ قریب پہنچے پر مورتی کو دریا کے کنارے ایک چھوٹی سی عمارت نظر آئی جو اینٹوں اور چونے کے آمیزے سے تیار کی گئی تھی۔ اُس پر ایک گنبد بھی بنا ہوا تھا۔ عمارت پر ہونے والی سفیدی اکھڑ چکی تھی اور بعض جگہوں پر بارشوں کے پانی نے اس پر سیاہ دھبے ڈال دیے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ اس عمارت کو بہت جلدی میں اور نہایت بے احتیاطی اور لا پرواہی سے بنایا گیا ہے لیکن اُس کی دل چسپی کی وجہ وہ لشکری تھے جو عمارت پر پہرہ دے رہے تھے۔ اُن کی تعداد بیس کے قریب تھی، انہوں نے شاہی وردیاں زیب تن کی ہوئی تھیں اور سورج کی روشنی میں اُن کی تلواریں اور ڈھالیں چمک رہی تھیں۔

”یہ کس شے کا پہرہ دے رہے ہیں؟“ مورتی نے پوچھا۔ ”مجھے تو یہ کچی سی عمارت لگتی ہے۔“

”یہ ملکہ کا مقبرہ ہے۔“ گجراتی تاجر نے جواب دیا۔

”یہ۔۔۔۔۔؟ یہ تو پہلے ہی سے بنا ہوا ہے۔“ مورتی کے چہرے پر ناراضی اُٹھ آئی۔ ”ہمیں یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی، کوئی بھی بے وقوف اسے تعمیر کر سکتا تھا۔“

”یہ عارضی آرام گاہ ہے۔“

”تو ملکہ کیا پسند کرتی تھی؟“

”وہ کہتے ہیں، خوب صورت، لیکن کون جانتا ہے؟“

مورتی نے چونک کر تاجر کو دیکھا اور خاموش ہو گیا۔ وہ دیکھے اور اُن دیکھے بھگوانوں کے جسے تراشتا تھا لیکن مرد اور عورتیں اُس کے فن پر اُس کے ہاتھ چوم لیا کرتے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا وہ ایسی عورت کا مقبرہ بنالے گا جسے اُس نے دیکھا بھی نہیں تھا۔۔۔ جس کے بارے میں وہ جانتا بھی نہیں تھا اور جس کے بدلے میں کوئی اُس کے ہاتھ چومنے والا ہی نہیں تھا۔۔۔

ooo

اگلی صبح بھی وہ وہیں تھا۔

لیکن اس بار اُس کی پتی سیتا، جو پھر ماں بننے والی تھی، اور بیٹا گوبی بھی اُس کے ساتھ تھے۔ وہ تینوں قلعے کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھنے والے اکیلے نہیں تھے بلکہ اس عظیم مقبرے کی تعمیر میں اپنا اپنا حصہ بٹانے کے لیے آنے والے اُن کے تمام ساتھی بھی ویران نگاہوں سے فصیلوں کی بلندی ناپنے کی ناکام کوششوں میں مصروف تھے۔

”رات کو یہ قلعہ ایک مہیب دیو لگتا ہے جس کے سائے میں عظیم مغل بادشاہ رہتا ہے۔“ مورتی بڑبڑایا۔

”کیا وہ بھگوان ہے؟“ ننھے گوبی نے سوال کیا۔

”نہیں، وہ انسان ہے، لیکن آکاش سے اُتر اہوا۔“ مورتی نے جواب دیا۔ ”میں نے سنا ہے کہ اُسے اس بات کا علم نہیں کہ اُس کی قلمرو کی سرحدیں کہاں سے کہاں تک ہیں؟“

”تم اگر چاہو تو اُس کا دیدار کر سکتے ہو۔“ ایک تاجر نے اُسے بتایا، وہ کئی بار آگرہ جا چکا تھا اور اس شہر کے اسرار و رموز سے بخوبی آگاہ تھا۔

”کیا میں ہم کلام بھی ہو سکتا ہوں؟“

تاجر جو گجرات کا ایک بنیا تھا، کھل کھلا کر ہنس دیا۔ ”وہ تم جیسے غلیظ کیڑوں پر کوئی توجہ نہیں دیتا، ہاں، ہر صبح۔۔۔ طلوع آفتاب سے ذرا پہلے وہ درمچک دیدار میں نمودار ہوتا ہے۔“ اُس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ ”وہاں۔“

”پھر تو ہم اُسے ضرور دیکھیں گے، وہ یقیناً ایک حیرت انگیز نظارہ ہو گا۔“ مورتی نے

جواب دیا۔

ہم خون اور موت کی توقع لے کر آئے تھے، لیکن وہاں دوسری ہی صورت حال تھی۔ چیخ کی آواز آقا زادی مہر النساء کی تھی۔ وہ دیوان پر بیٹھی اپنے شوہر پر چیخ رہی تھیں۔ ہمیں کوئی اندازہ نہیں تھا کہ اُن کی ناراضی کی وجہ کیا ہے۔ چنانچہ دونوں میں سے کسی نے بھی دخل اندازی کی کوشش نہ کی۔ بانولا ڈلی اپنے والد کے عقب میں چھپنے کی کوشش میں مصروف تھی۔

”کیا میری خدمتوں کا یہی صلہ ہے؟“ دفعتاً خانم مہر النساء کی آواز دوبارہ گونجی، لیکن اُن کا مخاطب کوئی خاص آدمی نہیں تھا۔

”لیکن یہ بہت اہم عہدہ ہے، مہر۔“ آقا شیر آغلن نے احتجاج کیا۔

”وہ یہ اہم عہدہ کسی اور کو دے دیں، مجھے نہیں چاہیے۔“ خانم نے ہاتھ لہرایا۔ ”خدا کی پناہ، شاہی خاندان کی خدمت کا صلہ یہی ہے کہ ہمیں ایک ہزار کوس دور بنگال میں پھینک دیا جائے۔“

”لیکن میں وہاں دیوان بن کر جا رہا ہوں، میں بنگال کا صوبے دار ہو کر وہاں جاؤں گا اور پھر بنگال ایک زرخیز علاقہ۔۔۔“

خانم نے تیز لہجے میں آقا کی بات پوری نہیں ہونے دی۔ ”وہ آپ کو یہاں میرساں (وزیر تجارت)۔۔۔ یا کوئی اور عہدہ بھی تو دے سکتے تھے۔ وہ۔۔۔“ خانم اچانک خاموش ہو گئیں۔ انہوں نے اپنی آنکھیں دیوار پر جمادیں۔ انداز سوچنے والا تھا یا شاید انہیں ہماری موجودگی کا احساس ہو گیا تھا۔

خانم یوں بھی بے حد خوب صورت تھیں لیکن اس لمحے وہ کچھ زیادہ ہی اچھی لگ رہی تھیں میں شہنشاہ کے ذوق کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا کیوں کہ میں نے یہ افواہیں بھی سنی تھیں کہ ظلم الہی، خانم مہر النساء سے محبت کرتے ہیں۔

کمرے میں موجود دوسرے افراد بھی خاموش تھے۔ آقا شیر آغلن، بانولا ڈلی کے ساتھ سرگوشیوں میں مصروف تھے جبکہ آغاچی چپ چاپ دروازے پر کھڑی تھی۔

”ٹھیک ہے۔“ تھوڑی دیر بعد خانم کی آواز دوبارہ کمرے میں گونجی۔ ”ہم بنگال چلیں گے۔“

○○○

1017ھ (1607ء)

عیسیٰ

”تم مضحل نظر رہی ہو آغاچی۔“

”میں صحیح طور پر نیند نہیں لے سکی۔“ ارجمند نے جواب دیا۔

آغاچی ایک درخت کے نیچے بیٹھی ہوئی تھی اور اُس کا چہرہ کسی گہری سوچ کی آماجگاہ نظر آ رہا تھا۔ اُس کی بھوری آنکھیں دور کہیں خلاؤں میں کھوئی ہوئی تھیں۔ اُس نے اپنی زبان سے کچھ نہیں کہا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ اُس کی اس حالت کا پس منظر کیا ہے۔ ولی عہد سلطنت اور آغاچی کے پیار کی افواہیں میں نے اپنے ساتھی خولجہ سراؤں سے سنی تھیں۔ درخت تلے بیٹھی آغاچی اس وقت مجھے ایک بے چین روح دکھائی دے رہی تھی جو عظیم محل کی غلام گردشوں میں اپنے محبوب کو ڈھونڈتی پھر رہی ہو۔ شاعری کی ایک کھلی کتاب اُس کی گود میں رکھی ہوئی تھی جس کا ایک صفحہ بھی اُس نے نہیں پلٹا تھا۔

میں تھوڑی دیر دوبارہ اُس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا لیکن جب اُس جانب سے خاموشی رہی تو میں نے بھی کچھ اور کہنے کی جرأت نہیں کی تھی۔

وہ کافی دیر یونہی بیٹھی خلاؤں میں گھورتی رہی، پھر اُس نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”کیا ہم دوبارہ مل سکیں گے، عیسیٰ؟“

میں جواب دینے کے لیے مناسب الفاظ تلاش کر رہا تھا کہ گھر کے اندر سے بلند ہونے کی ایک چیخ نے ہم دونوں کو ہی چونکا دیا۔ آواز نسوانی تھی۔ آغاچی بوکھلا کر کھڑی ہو گئی اور اُس نے زنان خانے کی طرف دوڑ لگادی۔ میں اُس کے پیچھے پیچھے تھا۔

”یہ چیزیں چھوٹی، بڑی کر کے دکھاتا ہے۔“ آغاچی نے بدستور ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ”ایک طرف سے تم بالکل ننھے منے دکھائی دیتے ہو لیکن دوسری طرف سے نظر ہی نہیں آتے کیوں کہ اتنے بڑے ہو جاتے ہو کہ اس میں پورے نہیں سماتے۔“

اس نے پیتل کی ٹکلی مجھے تھمادی اور کمرے کے دوسرے کونے میں چلی گئی۔

میں نے پیتل کی ٹکلی آنکھ سے لگالی اور وہ بہت بڑی ہو کر میرے قریب سمٹ آئی۔ میں یک ٹک اُسے دیکھتا رہا۔ حتیٰ کہ خود اس نے آ کر میرے ہاتھوں سے ٹکلی چھین لی۔ ”تم تو بے وقوف ہو، عیسیٰ۔ دوسری طرف سے بھی دیکھو۔“

”اسی طرف سے بہت ہے آغاچی۔“ میں پیچھے ہٹ گیا۔ ”یہ ایسا جادو ہے جو میرا مالک لیکھ راج بھی کبھی نہیں دکھاسکا، لیکن میں یہ ضرور تسلیم کرتا ہوں کہ وہ واقعی جادوگر تھا۔“ ”کیا تم کبھی اُس کے غلط سلوک پر اُسے سزا دینا چاہو گے؟“ اُس نے پُر سوچ انداز میں پوچھا۔

”نہیں، آغاچی۔“

”دُرست۔“ اُس نے تحسین آمیز نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ ”مجھے یاد آیا، پھوپھو نے تمہیں بلایا ہے۔“

”لیکن میں یہ جگہ نہیں چھوڑ سکتا۔“

”اپنا خنجر مجھے دے دو، میں ان تحفوں کی حفاظت کا فرض انجام دوں گی۔“

یہ اُس کا حکم تھا، میری محبوب آغاچی کا حکم۔۔۔ اُس نے خنجر کے لیے ہاتھ بڑھایا اور میں نے اپنا ہتھیار ڈرتے ڈرتے اُسے تھمادیا کہ میری عدم موجودگی میں یہاں کوئی حادثہ نہ ہو جائے۔ ”پھوپھو تمہیں جو کچھ کہیں گی۔۔۔ کیا مجھے بتاؤ گے؟“

”کیوں نہیں آغاچی۔“

اُس نے مسکرا کر خنجر اپنے لہنگے میں اڑس لیا اور میں نے دروازے کی طرف قدم بڑھا دیے۔

ooo

آقا اور خانم کی بنگال روانگی سے ایک روز پیشتر۔۔۔ ظل الہی نے حویلی میں ذرا دیر کو رونق افروز ہونے کا شرف بخشا۔

یہ اس گھرانے کے لیے بہت بڑا اعزاز تھا کہ عظیم مُغل شہنشاہ بہ نفس نفیس وہاں جلوہ افروز ہونے والا تھا۔ اجتماعی طور پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ ظل الہی کو خاصہ تناول کرنے کے بعد مغلیہ روایات کے عین مطابق۔۔۔ قیمتی تحائف اور نذرانے پیش کیے جائیں گے۔

شہنشاہ کی آمد کی شام۔۔۔ مجھے اُن تحائف کی حفاظت کی ذمہ داری سونپی گئی تھی جو ایک ایرانی قالین پر ڈھیر تھے۔ حرم کی تمام خواتین نے اپنا سارا زیور، پہنچیاں، ہار، کانوں کے بندے، ناک کی تھلیاں، بازبیں اور بھومرا تار کر پیش کر دیے تھے۔

آقا غیاث بیگ نے شہنشاہ کے لیے سب سے منفرد تحفہ پسند کیا تھا جو انہوں نے ایک فرنگی ملاح سے خریدا تھا۔ وہ نشے کی حالت میں یہ شے آقا کو فروخت کر گیا تھا۔ یہ پیتل کی بنی ہوئی ایک لمبی سی ٹکلی تھی جس کے دونوں سروں پر شیشہ لگا ہوا تھا۔ مجھے اس کا نام اور کام معلوم نہیں تھا، لیکن میں جاننے کا خواہش مند ضرور تھا۔

ابھی میں اس تحفے کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ آغاچی اندر داخل ہوئی اُس کا انداز اُن چھوٹی بچیوں جیسا تھا جو بچوں کے بل بڑوں کی محفل میں دخل اندازی کے لیے آئی ہوں۔

اُس نے آقا کے تحفے کو اٹھا لیا اور اُسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ اُس نے پہلے ایک طرف سے آنکھ لگا کر دیکھا اور پھر دوسری سمت سے۔ آغاچی نے اُس ٹکلی کو کسی تفنگ کی مانند میری جانب تان رکھا تھا۔

پھر اُس نے ہنسا شروع کر دیا۔

”یہ کیا ہے، آغاچی؟“

ہی کیوں کیا ہے؟ خانم کے والد، بھائی یا شوہر بھی تو یہ تحفہ شہنشاہ کو پیش کر سکتے تھے مگر پھر اس کی وجہ میری سمجھ میں آگئی۔۔۔ یقیناً انہیں اس تحفے کی خبر ہی نہیں ہوگی۔ اس صورت میں تو یہ تحفہ اور بھی زیادہ خطرناک تھا۔

خانم نے شاید میری سوچوں کو پڑھ لیا تھا۔ ”تم اس تحفے کو سب کے سامنے اپنی جانب سے پیش کر دو گے۔“

”ظل الہی مجھ جیسے غریب آدمی کا تحفہ کیوں کر قبول کر سکتے ہیں؟“

”وہ کریں گے۔“ خانم نے اعتماد کے ساتھ کہا اور آئینے کی سمت مڑ گئیں۔۔۔ میں بے وقوفوں کی طرح کھڑا انہیں تک رہا تھا۔ ”یہ یاد رکھنا عیسیٰ، کہ تم میری نگاہوں کے سامنے ہو گے۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور صندوقچہ اپنے لباس میں چھپا کر واپسی کے لیے مڑ گیا۔ آغاچی میری منتظر تھی۔۔۔ اُس نے میرے چہرے پر لکھی ہوئی پسینے کی تحریر بہ خوبی پڑھ لی تھی۔

”تم مجھے ٹھیک دکھائی نہیں دے رہے ہو، عیسیٰ؟“

”ایسی کوئی بات نہیں آغاچی۔“ میں نے اُس سے نگاہیں پڑاتے ہوئے اپنا خنجر واپس لے لیا جس کا دستہ اُس کے ہاتھ کی گرفت سے گرم ہو رہا تھا۔

”میں یہ نہیں پوچھوں گی کہ پھوپھو نے تمہیں کیا کہا ہے لیکن میرا اندازہ ہے کہ تم اُن کی بات سے خوش نہیں۔“ آغاچی میری چورنگا ہی کو بھانپ گئی تھی۔

”ہاں، آغاچی، خانم ہماری نگرانی کر رہی ہیں۔“ میں نے بدستور نظریں جھکا کر جواب دیا لیکن آغاچی نے پلٹ کر ضرور دیکھا اور پھر میری جانب نگرانی ہو گئی۔

”اگر تم حکم دو آغاچی تو میں وہ شے دکھا دوں؟“

”نہیں عیسیٰ، میں کسی کے راز میں شریک ہونا پسند نہیں کرتی۔“ آغاچی نے کہا اور دروازے کی طرف پلٹ گئی۔

میں نے اُس کی پشت پر لہراتے بالوں کو دیکھ کر سوچا کہ ایک غلام بہت سے آقاؤں اور بیگمات کی خدمات بجالاتے ہوئے کسی ایک کا وفادار کس طرح ہو سکتا ہے؟

خانم مہر النساء آئینے کے سامنے بیٹھی کا جل لگا رہی تھیں جبکہ اُن کی خادما میں اُن کی زلفیں سوار نے میں مصروف تھیں۔ میرے اندر داخل ہوتے ہی انہوں نے انہیں باہر جانے کو کہا اور اپنے صندوق سے ہاتھی دانت کا بنا ہوا ایک صندوقچہ نکال کر میری طرف پلٹیں۔

”عیسیٰ، تم اپنی جان سے زیادہ اس کی حفاظت کرو گے۔“

”جی، خانم۔“ میں نے صندوقچے کی طرف ہاتھ بڑھائے۔

”تم اس کے بارے میں کسی کو نہیں بتاؤ گے کہ یہ میں نے تمہیں دیا ہے۔“ انہوں نے گھور کر مجھے دیکھا۔ ”اگر ایسا ہوا تو میں تمہیں جان سے مار ڈالوں گی۔“

”جی، خانم۔“ مجھے خوف سے پسینہ آ گیا۔ میری آواز بھی لرزنے لگی تھی۔ ”میں سمجھ گیا، لیکن مجھے اس کا کیا کرنا ہے؟“

”تم اسے اپنے ہاتھوں سے ظل الہی کو دو گے۔“

میں سن ہو گیا۔

”لیکن میں ظل الہی تک کیسے پہنچوں گا، خانم۔“ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”یہ تمہارا کام ہے۔“ خانم نے صندوقچہ دوبارہ میرے ہاتھوں سے لے کر ایک ریشمی کپڑے میں لپیٹ دیا۔ ”اب یہ مقفل ہے۔ اگر میں نے سنا کہ تم نے اسے کھولنے کی کوشش کی ہے تو میں تمہیں ہاتھی کے سامنے ڈلوادوں گی۔“

مجھے اُن کے الفاظ پر کوئی شبہ نہیں تھا۔ اُس زمانے میں کسی کو موت کی سزا دینے کا یہ عام سا طریقہ تھا۔ میں نے سنا تھا کہ بڑے بڑے آدمیوں کو ہاتھی کے سامنے ڈلوایا جاتا رہا ہے۔۔۔ میں تو ایک غلام تھا۔۔۔ ظاہر ہے میرے بچنے کے امکانات بہت کم تھے لیکن اس طرح کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ آخر خانم نے اس ذمے داری کے لیے میرا انتخاب

شام کے سائے ڈھلتے ہی نرسنگا پھونکے جانے کی آواز آئی۔ مغل سپاہ نے راستے خالی کرانے شروع کر دیے۔ ادھر ادھر تک شاہی محافظوں کے دستے احادی پھیل گئے اور پھر نقیب کی گرج دار آواز سنائی دینے لگی۔

”بادب، باملاحظہ، ہوشیار، شاہ کشور گیر، صاحب فرخ سریر، شہنشاہ ہندوستان کی سواری تشریف لاتی ہے۔“

تمام لوگ بادب کھڑے ہو گئے اور پھر جب ظل الہی نے شاہی سواری سے حویلی کے مرکزی دروازے کے سامنے بچھے قیمتی قالین پر قدم رنجہ فرمایا تو سب کے سب کورنش بجالانے کے لیے جھک گئے۔

ظاہری طور پر ظل الہی بڑے اچھے رنگ میں دکھائی دے رہے تھے۔ انہوں نے صرف آقا غیاث بیگ سے ہی نہیں بلکہ آغاچی کے والد محترم اور خانم مہر النساء کے شوہر سے بھی معافقہ کیا۔ پھر انہوں نے آغاچی کے والد کا ہاتھ تھاما اور کشاں کشاں، اندرون خانہ روانہ ہو گئے۔

شاہی روایت کے مطابق ظل الہی نے سب سے پہلے اپنے لیے مخصوص تحائف کا معائنہ فرمایا۔ آقا غیاث بیگ نے اپنا تحفہ، ظل الہی کے حضور پیش کیا اور اس کے بارے میں بتایا تو انہوں نے پیتل کی نلکی کا رخ آسمان پر جگمگانے والے چاند کی طرف کر لیا۔ جو یقینی طور پر انہیں محض چند قدم دور ہی نظر آیا ہوگا۔

”اسے کیا کہتے ہیں؟“ ظل الہی کی بھاری بھر کم آواز سنائی دی۔

”میں اس بارے میں لاعلم ہوں۔ ظل الہی“ آقا نے جواب دیا۔ ”میں نے اسے

بازار میں ایک فرنگی سے خریدا ہے، ظل الہی۔“

شاہی مینا بازار کے اگلے روز بھی خانم مہر النساء نے مجھے طلب کیا تھا۔ وہ اس وقت دیوان پر بیٹھی آئین اکبری کے مطالعے میں مصروف تھیں۔ میرے قدموں کی آہٹ پر انہوں نے نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا اور پھر بغیر کسی تمہید کے گویا ہوئیں۔

”مجھے سب کچھ بتادو۔“

”کیا خانم؟“ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”پچھلی رات جو کچھ ہوا تھا، بے وقوف۔“ خانم کی آواز بلند ہو گئی۔ ”اُن دونوں کے درمیان جو بات چیت ہوئی تھی۔۔۔ اُس کا ایک ایک لفظ۔“

”میں نے کچھ نہیں سنا، خانم، میں۔۔۔“

”تمہارے کان۔۔۔ ہاتھی کے کان ہیں۔“ خانم نے مجھے جملہ مکمل نہ کرنے دیا۔

”اگر تم نے سچ نہ بولا تو میں انہیں جڑوں سے اکھڑا دوں گی۔“

میری ساری بہادری ہوا ہو گئی اور میں نے خانم کو سب کچھ بتا دیا۔ وہ خاموشی سے بیٹھی سنتی رہیں اور پھر انہوں نے مجھے جانے کی اجازت دے دی۔ اپنے حجرے میں آ کر میں پلک پلک کر رو دیا لیکن مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں آغاچی کو اپنی غدا ری کے بارے میں آگاہ کرتا۔

ooo

”اور لوگ کہاں ہیں؟“

”میری بیٹی مہروان میں موجود نہیں ظل الہی۔“ آقا نے جواب دیا اور پھر اپنے داماد سے مخاطب ہوئے۔ ”شیر اقلن جاؤ۔۔۔ اُسے یہاں لے آؤ۔“

آقا شیر اقلن کے پاس لیت و لعل کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔۔۔ اُنہوں نے فوراً حکم کی تعمیل کی لیکن اُن کے چہرے پر ناپسندیدگی کی جھلک مجھے واضح طور پر نظر آ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ خانم کے ہمراہ لوٹ آئے۔ خانم نے آتے ہی شہنشاہ کے حضور کورنش پیش کی اور اُس وقت تک جھکی رہیں جب تک کہ اُنہوں نے اُٹھنے کی اجازت نہیں دے دی۔ خانم نے چہرے پر نقاب ڈال رکھی تھی صرف اُن کی چمکتی آنکھیں ہی دکھائی دے رہی تھیں۔

”نقاب اتار دو۔“ شہنشاہ نے حکم دیا۔

خانم نے فوری طور پر حکم کی تعمیل نہیں کی بلکہ آہستہ آہستہ اُنہوں نے چہرے کو نقاب سے آزاد کیا۔۔۔ یوں لگا جیسے کوئی چاند، بدلیوں کی اوٹ سے نکل آیا ہو۔ میں نے ظل الہی کی طرف دیکھا اُن کے چہرے کی رونق لوٹ آئی تھی۔

اُسی شام آقا غیاث بیگ کو اعتماد الدولہ (وزیر اعظم) کے منصب سے سرفراز فرما دیا گیا۔

○○○

شہنشاہ نے اثبات میں سر ہلایا اور اُس کمرے کی طرف قدم بڑھا دیے جہاں آپ ارغوانی اُن کے حضور پیش کیا جاتا تھا۔ یہ اعزاز مجھے بخشا گیا تھا۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے خانم مہر النساء کا تحفہ بھی کشتی میں رکھ لیا۔

”یہ کیا ہے؟“ ظل الہی نے دریافت کیا۔

میں فوراً کورنش بجالایا۔ ”یہ میری طرف سے آپ کے حضور نذرانہ ہے ظل الہی۔“
ظل الہی نے ہاتھی دانت کا صندوقچہ کشتی سے اُٹھا کر اُسے کھول ڈالا۔ اندر خانم مہر النساء کی ایک رنگین تصویر تھی۔ خانم دیوان پر نیم دراز تھی۔ جس کسی مصور نے بھی یہ تصویر بنائی تھی اُس نے خانم کو خسن کا نادر شاہکار بنا کر پیش کیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ ظل الہی تصویر میں کھو کر رہ گئے۔

”تمہیں یہ کس نے دی ہے؟“ ظل الہی نے بدستور تصویر کو دیکھتے ہوئے دریافت کیا اور میں جی جان سے کانپ اُٹھا۔ میں نے جلال جہانگیری کے بارے میں بہت سی باتیں سُن رکھی تھیں۔

”کک۔۔۔ کک۔۔۔ کسی نے نہیں ظل الہی۔“ میں نے کانپتی آواز میں جواب دیا۔ اس سے زیادہ بولنا میرے حق میں خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔

آقا غیاث بیگ نے، جو ظل الہی سے کچھ فاصلے پر تشریف فرما تھے۔۔۔ تحفہ دیکھنا چاہا لیکن ظل الہی نے صندوقچہ بند کر لیا۔

”ہمیں تمہارا تحفہ پسند آیا۔“ شہنشاہ کے الفاظ نے میرے بدن میں جیسے جان ڈال دی۔ اُنہوں نے ہیرے کی ایک انگٹھوٹی اپنی انگلی سے اتار کر میری جانب اُچھال دی اور آقا کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”حرم کی خواتین کو ہمارے حضور پیش کیا جائے۔“

آقا فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے اور پھر وہ پردہ ہٹا دیا گیا جس کے عقب میں اُن کے خاندان کی عورتیں موجود تھیں، یہ شہنشاہ کا حق تھا کہ وہ جس خاتون کا چاہیں چہرہ دیکھ لیں۔

میں نے ظل الہی کے چہرے پر ناامیدی کی جھلک دیکھی، کیوں کہ سامنے آنے والی خواتین میں خانم مہر النساء نہیں تھیں۔

دن پر دن گزرتے رہے۔۔۔ ہر صبح پورب سے سورج دیوتا نمودار ہوتا اور دن بھر کے سفر کے بعد چچھم میں غروب ہو جاتا۔ ہر گزرنے والے دن کے ساتھ وہاں نئی نئی زبانیں بولنے والے آتے جا رہے تھے۔ ایسی زبانیں بولنے والے جو مورتی نے کبھی نہیں سنی تھیں۔ ہر روز ایران، بنگال، سمرقند، کشمیر اور راجپوتانہ سے اونٹوں اور خچروں کے قافلے وہاں پہنچ رہے تھے۔ دن میں وہ کئی شہزادوں، امراء اور بیگمات کو اپنے خادین اور لونڈیوں کے جلو میں گزرتا دیکھتے لیکن کبھی کسی نے انہیں درخور اعتنا نہیں سمجھا تھا۔

ان تمام کے دلوں میں آگرہ کے عظیم قلعے کے اندر جانے کی حسرتیں ٹھانھیں مارتی تھیں لیکن ان میں سے کسی کو بھی اپنی حسرت، خواہش میں بدلتی نظر نہ آتی تھی۔ حتیٰ کہ ایک صبح وہ تمام بادشاہ وقت کے درشن کے لیے دریا اور قلعے کے درمیانی خطے میں دریچہ دیدار کے عین سامنے جمع ہو گئے جہاں عظیم مغل بادشاہ شہاب الدین شاہ جہاں۔۔۔ اپنے امراء اور رعایا کو درشن دیا کرتا تھا۔

چند ثانیوں بعد گھنٹیاں بجنے کی آواز سنائی دی جو سونے کی ایک زنجیر سے منسلک تھیں۔ ”یہ کیا ہے؟“ مورتی نے اپنے ساتھی سے دریافت کیا۔ ”یہ زنجیر عدل ہے، میں نے سنا ہے کہ بادشاہ اس زنجیر ہلانے والے کی فریاد سنتا ہے، لیکن کون جانے؟“

مورتی نے کچھ سمجھنے اور کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں گردن ہلائی اور اپنے بیٹے گوپی کو اٹھا کر کندھوں پر بٹھالیا، تاکہ وہ بھی شہنشاہ کی جھلک دیکھ سکے۔

”کیا وہ بھگوان ہے؟“ ننھا گوپی اُس کے کانوں پر جھک آیا۔ ”نہیں، ایک پورکھ (انسان)۔“ مورتی نے دھیرے سے جواب دیا۔ ”لیکن ہمارے لیے بھگوان سے کم نہیں۔“

اور پھر شہنشاہ۔۔۔ دریچہ دیدار میں نمودار ہوا۔ اُس نے کوئی بات کی نہ کسی کو مخاطب کیا، بلکہ پتھر کے ایک بُت کی طرح ساکت بیٹھا رہا اور کچھ دیر بعد واپس چلا گیا۔

1042ھ (1632ء)

ممتاز محل

”میں دیوتا تراشتا ہوں“ مورتی نے کہا۔

”پھر یہاں تو تمہاری کوئی ضرورت نہیں۔“ محرر نے کاغذ سمیٹتے ہوئے جواب دیا۔ اُس نے مورتی کے عقب میں دیکھا جہاں اُس جیسے اور بہت سے اپنی باری کے منتظر تھے۔ اُن کے چہروں پر اُمید و بیم کی کیفیت تھی۔

”میں اچار یہ ہوں۔“ مورتی نے اصرار کیا۔

اُس کے ان الفاظ کا بھی محرر پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ بدستور خاموش تھا۔ مورتی کچھ دیر اُس کے جواب کا انتظار کرتا رہا پھر واپسی کے لیے مڑ گیا۔ دریا کے کنارے کی جانب، جہاں انہوں نے خیمے لگائے تھے، وہ کھلے آسمان کے رحم و کرم پر تھے۔ بہت سے دوسرے لوگوں کے ساتھ، جو اُس کی طرح کھلے میں کھاتے پیتے اور سوتے تھے۔

دریا کا کنارہ۔۔۔ رفتہ رفتہ آباد ہوتا جا رہا تھا۔ شہنشاہ کے اعلان کے بعد بہت سے لوگ روزانہ ملک کے مختلف حصوں سے وہاں پہنچ رہے تھے تاکہ مرحومہ ملکہ کے مقبرے کی تعمیر میں اپنے ہنر کا مظاہرہ کر سکیں۔ دریا کنارے ایک چھوٹا سا گاؤں آباد ہو گیا تھا۔

اور پھر ان لوگوں نے اپنے کچے گھر بنانے شروع کر دیے۔ مورتی نے بھی اُن کی تقلید کی۔ اُس نے اپنے لیے ایک چھوٹی سی کھولی بنالی اور اپنی بیوی سیتا اور بیٹے گوپی کے ساتھ اندھیری کھولی میں بیٹھ کر اپنے گھر آنگن، لکشمی کے اُترنے کے خواب دیکھا کرتا۔

”کیا لوگ یہاں پر ارتھنا کرتے ہیں؟“ مورتی نے دریا کے کنارے بوسیدہ سی کوٹھری کی طرف اشارہ کیا۔

”نہیں، یہ مقبرہ ہے۔“

”اوہ، تو اب تم رانی کا مجسمہ بنوا رہے ہو؟“

”نہیں، ہمارے مذہب میں مجسمے بنانا حرام ہے، اللہ کی بھی کوئی شکل اور جنم نہیں ہے۔“

مورتی نے یوں سر ہلایا جیسے وہ محترم کا ایک ایک لفظ سمجھ گیا ہو لیکن محترم جانتا تھا کہ اُسے خاک بھی سمجھ میں نہیں آیا ہوگا۔

”اب تم جا کر پتھر کا ٹو، ورنہ ہمارے پاس اور بہت سے لوگ موجود ہیں۔“

اُسی وقت شامیانے سے ایک شخص برآمد ہوا۔ وہ طویل القامت اور دُبلّا پتلا تھا۔ داڑھی کے بال سلیقے سے ترشے گئے تھے۔ اُس نے قیمتی ململ کا لباس پہنا ہوا تھا۔ اُگلیوں میں ہیروں کی انگشتریاں اور بازو پر سونے کا بازو بند تھا۔

○○○

مورتی نے ایک بار پھر قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا۔ وہ دوبارہ محترم کے پاس پہنچ گیا۔

”مگر اس کون ہے؟“

محترم نے بے نیازانہ انداز میں زمین پر تھوکا اور پھر سر سے قلعے کی بلند و بالا فصیل کی طرف اشارہ کیا۔

”وہ۔“ محترم نے دیا۔ ”کیا تمہیں ملازمت چاہیے؟“

”مجھے بہ طور خاص یہاں بھیجا گیا ہے، میں نے تمہیں شہنشاہ کے لیے راجا کا تحفہ بھی دیا تھا۔“

”وہ ظل الہی تک پہنچ جائے گا، میں خود نہیں دوں گا۔ تم یہ بتاؤ کہ پتھر کاٹتے ہو؟“

”نہیں، میں اچار یہ ہوں، سنگ تراش، میں بُت تراشتا ہوں۔“

”لیکن یہاں تو کوئی بُت نہیں، تم یا تو سنگ مرمر کا ٹوپا چلے جاؤ۔ دوسرے لوگ انتظار کر رہے ہیں۔“

مورتی واپس نہیں گیا، محترم کے عقب میں بہت سے رنگا رنگ شامیانے نصب تھے، امراء آ اور جا رہے تھے بہت سے ایسے افراد بھی تھے جنہوں نے ہاتھوں میں نقشے اور کلک (قلم) پکڑے ہوئے تھے۔ وہ آپس میں سرگوشیوں میں باتیں بھی کر رہے تھے۔ وہ باہر زک کر شامیانوں کے عقب میں ایک چٹان کا جائزہ لیتے اور پھر اندر غائب ہو جاتے۔

”میں اُن سے بات کروں گا۔“ مورتی نے ارادہ ظاہر کیا۔

”اگر تمہاری خواہش ہے تو، جاؤ۔“

مورتی اس کے باوجود اپنی جگہ سے نہیں ہلا البتہ محترم اُٹھ کر شامیانے کے اندر چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد واپس آ کر اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔

1017ھ (1607ء)

شہاب الدین

”کیا آپ خواب دیکھ رہے ہیں، صاحبِ عالم؟“

”کیا شہزادے خواب نہیں دیکھ سکتے؟“

”جنگ کے میدانوں میں نہیں۔“ ابا حضور کے قابلِ اعتماد اور بہادر جرنیل مہابت خان کی تلوار میری آنکھوں کے سامنے لہرائی۔ ”جنگ میں بادشاہ، سپاہ کا دل ہوتا ہے صاحبِ عالم۔۔۔ اگر وہ مرجائے تو شکست مقدر ہو جاتی ہے اور آپ جانتے ہیں کہ خواب دیکھنے والے عملی افراد نہیں ہوتے۔“

”ہم ابھی بادشاہ نہیں بنے۔۔۔ لہذا ہمارے پاس خواب دیکھنے کے لیے کچھ وقت باقی ہے۔“ میں نے مہابت خان کو کڑے تیوروں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا، تندرست و توانا اور چاق و چوبند جرنیل کا چہرہ اس وقت پسینے میں شرابور تھا جس میں ریت کے چمکتے ہوئے ذرات صاف نظر آ رہے تھے۔

دو غلاموں نے بڑھ کر ہمارے ہاتھوں سے تلواریں لے لیں اور ہم دونوں حمام کی طرف بڑھ گئے۔

”گستاخی معاف صاحبِ عالم! لیکن آپ اُس لڑکی ارجمند کے خواب کچھ زیادہ ہی دیکھتے ہیں۔“

”تم کیا جانو، خوابوں کا مزہ۔۔۔“ میں نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ”یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ جرنیل بے خواب اور کھر در ری زندگیاں بسر کرتے ہیں۔“

عیسیٰ نے کھڑے ہو کر انسانوں کے ٹھانٹھیں مارتے سمندر کو دیکھا۔۔۔ بلا مبالغہ میں ہزار سے زائد مرد اور عورتیں یہاں جمع تھیں۔ مزدوروں کے ناموں کا اندراج کرنے والے محزرا ایک سمت دیوان سجائے بیٹھے مختلف تفصیلات درج کر رہے تھے۔ عیسیٰ نے سرگھما کر ایک محزرا کو دیکھا جو عین اپنے سامنے کھڑے شخص کو بُری طرح نظر انداز کر رہا تھا۔ عیسیٰ شامیہ نے میں لوٹ آیا اور محزرا کو بلا بھیجا۔

”وہ شخص کون ہے؟“

”ایک بے وقوف۔“ محزرا نے جواب دیا۔ ”وہ بت تراشتا ہے۔ میں نے اُسے بتایا تھا کہ یہاں اُس کے مطلب کا کوئی کام نہیں۔“

”میں نے پوچھا تھا کہ وہ کون ہے؟“ عیسیٰ نے سختی سے دریافت کیا، محزرا کانپ کر رہ گیا۔ ”جاؤ اور معلوم کر کے آؤ کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے؟“

محزرا واپس آ گیا۔ اُسے شہنشاہ کے مصاحب خاص کی ایک عام آدمی میں اتنی دلچسپی کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ اُس نے مورتی سے سوال و جواب کیے اور پھر عیسیٰ کے پاس واپس آ گیا۔

”وہ گونئی کل سے آیا ہے، یہ جنوب میں۔۔۔“

”میں جانتا ہوں۔“

”وہ ایک اچاریہ ہے۔ اُس کا نام مورتی، باپ کا نام کرشنن اور دادا کا نام لکشمی ہے۔۔۔ اُسے راجا جانے بھیجا ہے۔ میں نے اُسے مزدور کی حیثیت سے ملازمت دینے کی پیش کش کی تھی لیکن اُس نے اُسے ٹھکرا دیا۔“

”اُسے ملازمت دے دو۔“

”لیکن یہاں اُس کے کرنے کا کوئی کام نہیں۔“ محزرا نے حجت کی۔

”جو میں نے کہا ہے وہ کرو۔“ عیسیٰ نے کسی قدر سختی سے کہا۔ ”اُسے کام کرتے دیکھو اور براہِ راست مجھے آگاہ کرو۔“

”شہزادوں اور بادشاہوں کو بھی شامل کر لیجئے۔“

مہابت خان نے کہا لیکن میں یوں بن گیا جیسے میں نے سنا ہی نہیں کیونکہ ارجمند کھلی پلکوں سے میری روح میں داخل ہو گئی تھی۔ وہ ایک چھوٹی سی ملاقات میں میرے دل پر قابض ہو گئی تھی۔

وہ ایک ایسی سلطنت کی ملکہ بن بیٹھی تھی جہاں آج سے پہلے کوئی اور داخل ہونے کا شرف حاصل نہ کر پایا تھا۔۔۔ وہ میری ملکہ تھی اور میں اُس کی سلطنت تھا۔

”پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“ کچھ توقف کے بعد میں نے بہادر جرنیل سے دریافت کیا۔ جو میرے اتالیق کے فرائض بھی انجام دے رہا تھا۔ اُس نے مجھے تلوار بازی، گھڑسواری، کشتی اور جنگی رموز سے آگاہ کیا تھا۔

”اُسے بھول جائیں صاحبِ عالم۔“ جرنیل نے بڑے ظالمانہ انداز میں مشورہ دیا۔ ”میں جانتا ہوں کہ آپ میرے مشورے کو قبول نہیں کریں گے شہزادے، آپ مالک ہیں، میں نے یہ سیکھا ہے کہ اگر شاہ بھری دوپہر کورات کہیں تو سنے والے کو تصور کی آنکھ سے چاند ستارے دیکھ لینے چاہئیں لیکن آپ نے پوچھا اور میں نے کہہ دیا۔“

”لیکن ہم اُسے فراموش نہیں کر سکتے۔“

”وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کر دیں گے۔“

”اُسے دیکھے ہوئے کئی مہینے ہو گئے ہیں خان لیکن وہ ہر وقت ہماری بند پلکوں کے پیچھے۔۔۔“

”تو پھر آپ سنیاں لے لیں صاحبِ عالم! اُس کی مورتی گلے میں لٹکا کر جنگلوں میں نکل جائیں۔“ وہ ذرا دیر کا اور پھر گویا ہوا۔ ”محبت، شہزادوں کے لیے نہیں ہوتی، آپ کوئی عام دیہاتی یا سپاہی نہیں، ہندوستان کے ہونے والے بادشاہ ہیں، آپ اُس سے شادی کریں گے جو آپ کے لیے ناگزیر ہوگی۔ آپ محبت کے لیے نہیں۔۔۔ سیاست کے لیے شادی کریں گے، کیا حضرت باہر نے محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر شادی کی تھی؟ کیا حضرت ہمایوں کے دل پر محبت کا تیر لگا تھا؟ کیا مہابلی۔۔۔؟“

”حضرت ہمایوں نے کی تھی۔“

”تو پھر آپ کو یہ علم بھی ہوگا کہ اُن پر کیسی تباہی نازل ہوئی تھی؟“

مہابت خان شاید یہ بھول گیا تھا کہ میرے پردادانے اپنے والد حضور کی نصیحت پر کان نہیں دھرے تھے، لیکن اس میں جنت مکانی حمیدہ بیگم کا بہر حال کوئی قصور نہ تھا۔

”ہمیں بتایا گیا ہے کہ ہمارے والد حضور پر آج کل خانم مہر النساء نے قبضہ جمار کھا ہے۔“

مہابت خان نے چونک کر مجھے دیکھا لیکن فوری طور پر زبان سے کچھ نہیں کہا۔

خانم کا نام آتے ہی میں خود سوچنے لگا تھا کہ وہ کیا چاہتی ہے؟

مجھے بتایا گیا تھا کہ اُس کی خواہشوں کا دائرہ بھی سلطنتِ مغلیہ کی طرح لامحدود ہے لیکن وہ ملکہ تو کسی صورت نہیں بن سکتی تھی، کیوں کہ والد بزرگوار کی پہلی اہلیہ میری والدہ۔۔۔ مہارانی جو دہابائی تھیں پھر خانم شادی شدہ تھی اور اُسے طلاق ہو جانے کا بھی کوئی امکان نہیں تھا۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ اگر یہ سب ہو بھی جاتا تو سلطنت کے مولوی حضرات کسی مطلقہ عورت سے شہنشاہ کو کبھی شادی نہ کرنے دیتے، مگر ایک اُمید یہ بھی تھی کہ اگر ظلِ الہی واقعی اُس سے محبت کرتے تھے تو وہ اُسے یقیناً اپنے قریب کرنے کی کوشش بھی کریں گے؟ اگر ایسا ہوا تو خانم مہر النساء۔۔۔ ارجمند کے حصول میں یقینی طور پر میری دوست اور ہمدرد ثابت ہو سکتی تھی۔

”ہم اس معاملے پر والد حضور سے بات کرنا چاہتے ہیں لیکن فی الوقت انہوں نے ٹال دیا ہے۔“ میں نے دوبارہ اپنے اتالیق کو آگاہ کیا۔

”اس میں کوئی شک نہیں کہ ظلِ الہی اُس وقت آپ سے بات کریں گے جب اُس لڑکی کے لیے آپ کے جذبات نسبتاً سرد ہو چکے ہوں گے۔“

”ہو سکتا ہے انہوں نے سوچا ہو کہ وقت گزرنے کے ساتھ یہ آگ سرد پڑ جائے گی، کل ظلِ الہی نے ہمیں وقت دیا ہے ہم اُن سے مطالبہ۔۔۔“

”ظلِ الہی سے نرمی سے بات کیجئے گا صاحبِ عالم گستاخی“ مہابت خان نے مجھے ٹوک دیا۔ گستاخی معاف، لیکن اس سرزمین پر ظلِ الہی کے علاوہ کوئی اور ہستی ایسی نہیں جو کسی قسم کا مطالبہ کر سکے یا حکم دے سکے۔“

جرنیل نے حمام کی ایک کشمیری لڑکی کو اشارہ کر کے اپنے قریب بلایا اور پھر اُسے میری طرف دھکیل دیا۔ ”اس سے لطف اندوز ہوں صاحبِ عالم، عورت کا قرب ہر قسم کی آگ بجھا دیتا ہے۔“

”نہیں۔“ میں پرے ہٹ گیا۔ ”ہم ارجمند کی محبت میں کسی اور کو شریک نہیں کر سکتے۔“

وزراء کا تقرر بھی شامل تھا۔ ان وزراء میں اعتماد الدولہ، میر بخش، میرسان اور صدر (وزیر اعظم، وزیر خزانہ، وزیر تجارت، وزیر مذہبی امور) شامل ہوتے تھے۔

میں کافی دیر وزراء کو سنا رہا۔۔۔ بالآخر وہ اپنی اپنی کہہ کر دیوان خاص سے باہر چلے گئے۔ تجلیہ ہونے پر ظل الہی مجھ سے مخاطب ہوئے۔

”ہمارے قریب آؤ، خرم۔“

ظل الہی نے تخت سے اتر کر مجھے گلے لگایا اور پھر ہاتھوں کے حلقے میں لیے اپنے کمرہ خاص کی طرف بڑھے۔ جب سے میرے بھائی خسرو نے بغاوت اور ظل الہی کو قتل کرنے کی ناکام کوشش کی تھی، اُن کا مجھ سے لگاؤ کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا تھا۔ خطاب کے علاوہ مجھے ظل الہی نے حسن فیروز کی عظیم جاگیر عنایت فرمائی تھی۔ بہت سال پہلے یہی جاگیر مہابلی نے ظل الہی کو مرحمت کی تھی، جب وہ ولی عہد سلطنت تھے۔

ہم خاموشی سے چلتے ہوئے ظل الہی کے کمرہ خاص میں داخل ہوئے۔ کنیریں ظل الہی کا عمامہ، طلائی پٹکا، خلعت اور طلائی خنجر اُتارنے کے لیے آگے بڑھیں۔ ساتھ ہی انہوں نے ظل الہی کو آبِ ارغوان کا جام پیش کیا۔

”راجپوت، دوبارہ ہمارے لیے مسائل کھڑے کر رہے ہیں۔“ ظل الہی نے دختر رزکو ہونٹوں سے چھوتے ہوئے کہا۔ ”میواڑ نے خراج ادا کرنے سے انکار کر دیا ہے، ہمارے خیال میں وہ تب تک مطمئن نہیں ہوں گے جب تک ہم اُن کی اینٹ سے اینٹ نہیں بجائیں گے۔ انہوں نے چتوڑ کی بربادی سے بھی سبق حاصل نہیں کیا۔“

وہ آگے بڑھ کر دیوان پر دراز ہو گئے اور پھر جیسے پہلی مرتبہ انہیں میری موجودگی کا احساس ہوا۔

”آؤ، ہمارے قریب بیٹھ کر بتاؤ کہ تمہارا کیا مسئلہ ہے، جس کے لیے تم ہم سے ملنے کو بے تاب تھے۔“

میں نے دل ہی دل میں دعا کی کہ میری زبان۔۔۔ جاہ چشم کے اس مرقع کے سامنے لڑکھڑائے نہیں۔۔۔ ورنہ میری ار جند ہمیشہ کے لیے کھوجاتی۔

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔

”ولی عہد سلطنت تشریف لاتے ہیں۔“

دیوان خاص کے دروازے پر متعین نقیب نے میری آمد کا اعلان کیا جبکہ مغلیہ سپاہ سے تعلق رکھنے والے ایک محافظ نے مجھ سے میرا طلائی دستے والا خنجر لے لیا۔ شہنشاہ کے حضور مجھ سمیت کوئی شخص ہتھیار لے کر نہیں جاسکتا تھا۔

ظل الہی۔۔۔ تخت پر فروکش تھے۔ اُن کے ارد گرد، عمال حکومت اور امراء کھڑے تھے جن میں میری محبوب کے دادا اعتماد الدولہ غیاث بیگ بھی شامل تھے۔ میں کورنش بجالایا لیکن ظل الہی نے مجھے بیٹھنے کی اجازت نہیں دی چنانچہ میں بھی امراء کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔

امراء نے باری باری بولنا شروع کر دیا۔ ظل الہی بڑی توجہ اور ذمے داری سے اُن کی باتیں سن رہے تھے۔ یقینی طور پر ابتدا میں انہیں ظل الہی کی دلچسپی اور توجہ پر ضرور حیرت ہوئی ہوگی کیونکہ انہوں نے مہابلی اکبر اعظم کو یہ کہتے ضرور سنا ہوگا کہ میرے والد گرامی کبھی ذمے دار حکمران نہیں بن سکتے۔ اسی وجہ سے مہابلی نے میرے بھائی اور اپنے پوتے خسرو کو ہندوستان کا بادشاہ نامزد کرنے کے بارے میں سوچا تھا لیکن بستر مرگ پر انہوں نے فیصلہ والد حضور کے حق میں دیا۔

مہابلی نے ایک مستحکم اور مضبوط سلطنت چھوڑی تھی۔ اُن کے دور میں لوگوں کو انصاف حاصل تھا۔ انہوں نے اپنے دور میں غیر مسلموں پر جزیہ معاف کر دیا تھا۔ آبیانے اور مالیے کے معاملات بھی نئے سرے سے ترتیب دیے تھے۔ مہابلی نے بچپن کی شادیوں پر پابندی عائد کر دی تھی اور ہندو مذہب کی ایک ظالمانہ رسم ’ستی‘ جس میں نوجوان بیوہ اپنے آنجنابی شوہر کے ساتھ جل مرتی تھی، ممنوع قرار دے دی تھی۔ انہوں نے دین الہی سے ہٹ کر سلطنت کے معاملات چلانے کے لیے اور بہت سے قوانین مرتب کیے تھے جن میں چار

اپنے لیے ہمدردی کے آثار نظر آئے تھے۔

”مہابلی اکثر ہمیں شہزادوں کے فرائض اور ذمے داریوں سے آگاہ فرمایا کرتے تھے۔“
 ظل الہی نے انتہائی نرم لہجے میں اپنی بات شروع کی۔ ”اللہ تعالیٰ نے بطور خاص ہمیں ان ذمے داریوں کے لیے منتخب فرمایا ہے، ہم ڈاکو یا لٹیرے نہیں جنہوں نے بہ زور شمشیر اس سلطنت پر قبضہ کر لیا ہو۔ ہم چنگیز خان اور حضرت تیمور کے وارث ہیں اور اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر اس عظیم قلمرو پر حکمرانی کر رہے ہیں۔ ایک شہزادہ صرف وہی کرتا ہے جس کا اُس کی سلطنت کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے۔۔۔۔۔ جہاں تک اُس لڑکی کا سوال ہے۔۔۔۔۔ ارجمند کا۔۔۔۔۔ تو ہم اس پر ایک پیارے بیٹے کے باپ کی حیثیت سے نہیں بلکہ سلطنت مغلیہ کے شہنشاہ کی حیثیت سے غور کریں گے اور تم ہمارے ولی عہد اور وارث تخت بھی ہو۔ ہماری زندگیاں ہماری اپنی نہیں ہیں خرم۔۔۔۔۔ یہ اس سلطنت کی امانت ہیں، کیا ارجمند سے تمہاری شادی سے عظیم مغل سلطنت کو کوئی فائدہ یا استحکام پہنچ سکتا ہے؟ اس پر غور کرو اور پھر ہمیں آگاہ کرو۔“

ظل الہی کی طویل تقریر سے مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دیر نہ لگی کہ میں اپنا کھیل ہار گیا ہوں، پھر بھی میں نے جی کڑا کر کے جواب دیا۔

”اس سے ہمارے دل کو سکون اور مسرت و شادمانی حاصل ہوگی، ظل الہی۔“
 ”تم نے پوری توجہ سے ہماری بات نہیں سنی۔“ ظل الہی نے میرے رخسار پر چٹکی بھری۔ ”تم نے اپنے دل کے سکون اور خوشی کو مقدم جانا جبکہ ہم تمہیں آگاہ کر چکے ہیں کہ ہماری زندگیاں ہماری اپنی نہیں ہیں۔۔۔۔۔ ہمیں بتاؤ کہ ارجمند اپنے ساتھ کیا لائے گی؟ دولت؟ طاقت؟ سلطنت؟ کوئی سیاسی اتحاد؟ کیا اُس سے شادی کے نتیجے میں کوئی دشمن دوست بن رہا ہے؟ جس کے لیے مہابلی نے ہمیشہ نصیحت کی، اگر اس کا جواب ہاں میں ہے تو پھر ہم تمہیں اس سے شادی کی اجازت دیتے ہیں۔“

”آپ جانتے ہیں کہ ان تمام سوالوں کا جواب۔۔۔۔۔ نہ میں ہے ظل الہی۔“
 ”تو پھر مسئلہ حل ہو گیا۔“ ظل الہی نے مجھے بھیج لیا۔ ”سلطنت مغلیہ کے لیے شادی کرنے کے بعد اُسے دوسری بیوی کے طور پر حرم میں داخل کر لینا بشرطیکہ اُس وقت بھی تم اُس کے لیے وہی محبت محسوس کرو جو آج کرتے ہو، تم نوجوان ہو، اس لیے زیادہ جذباتی ہو رہے

”ہم شاہی مینا بازار گئے تھے ظل الہی، ہم۔۔۔۔۔“

”وہ بھی کیا تماشا تھا؟“ ظل الہی نے مجھے جملہ مکمل نہ کرنے دیا۔ ”ہم سوچ رہے ہیں کہ اسے ہر برس کے بجائے ہر ماہ منعقد کرنا شروع کر دیں، خواتین اس سے خاصی لطف اندوز ہوتی ہیں، تمہارا کیا خیال ہے؟“

”جی ظل الہی۔“ میں نے کن اکھیوں سے اُس کنیر کی طرف دیکھا جو آہستہ آہستہ اُن کی پشت سہلا رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتے، میں نے فوراً اپنی بات شروع کر دی۔
 ”ہمیں علم ہے کہ ہماری شادی کے انتظامات کا آغاز ہونے والا ہے۔۔۔۔۔“
 ظل الہی نے چونک کر مجھے دیکھا۔

”گستاخی معاف ظل الہی، ہماری مسرتوں اور ہندوستان کی ہونے والی ملکہ کا انتخاب آپ کے مبارک ہاتھوں میں ہے، آپ سلطنت مغلیہ اور ہمارے حق میں جو بہتر تصور فرمائیں گے ہم اُسے دل و جان سے قبول کریں گے۔۔۔۔۔ ہم ایک بار پھر معافی کے خواستگار ہیں ظل الہی۔۔۔۔۔ مینا بازار میں ہم نے ایک بہت خوب صورت لڑکی کو دیکھا تھا۔ وہ چاندی کے زیورات فروخت کر رہی تھی۔۔۔۔۔ ہو سکتا ہے، آپ نے بھی اُسے دیکھا ہو ظل الہی۔۔۔۔۔ اُس کا تعلق ایک اچھے خاندان سے ہے۔۔۔۔۔ وہ اعتماد الدولہ غیاث بیگ کی پوتی ہے۔۔۔۔۔“
 میں ایک لمحے کے لیے رُک کر ظل الہی کا ردِ عمل دیکھتا رہا لیکن وہ خاموشی اختیار کیے رہے، جیسے انہیں علم ہو کہ میں آگے کیا کہنے والا ہوں۔

”غیاث بیگ کی صاحبزادی، خانم مہر النساء اُس کی پھوپھی ہے، جو صوبے دار۔۔۔۔۔“
 ”ہم اُس کے شوہر سے واقف ہیں۔“ ظل الہی کی گرفت میرے بازو پر سخت ہو گئی۔ ”ہم نے اس لڑکی کو بھی دیکھا ہے۔۔۔۔۔ غالباً ارجمند نام ہے اُس کا، خوب صورت لڑکی ہے۔“
 ”ہم انتہائی شرمندگی سے اعتراف کرتے ہیں کہ ہم اُس لڑکی سے محبت کرتے ہیں، ظل الہی۔“ میں نے ڈرتے ڈرتے کہا اور مجرموں کی طرح گردن جھکالی۔

”چند لمحوں کی رفاقت سے ہی تم اُس سے محبت کرنے لگے ہو؟“ ظل الہی کی بات میں سوال چھپا ہوا تھا۔ وہ غور سے میری صورت دیکھ رہے تھے۔ اُن کی آنکھیں مجھے چھپتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ میں نے ذرا اوپر کونگا ہیں اٹھائیں اور پھر جھکالیں۔ مجھے اُن کے چہرے پر

1043ھ (1633ء)

ممتاز محل

مورتی کو بے حد مایوسی ہوئی تھی۔ وہ کوٹھری کی ناکافی روشنی میں گھور گھور کر اپنی بیوی کو دیکھ رہا تھا جو زمین پر آڑی ترچھی سو رہی تھی۔ پڑوسی کی بیوی لکشمی، اُس کے قریب موجود تھی اور نومولود اُس کے ہاتھوں میں تھا۔ سیتا کی طرح وہ بھی آس پاس سے بے نیاز سو رہی تھی۔ مورتی کو لڑکے کی خواہش تھی، ہر صبح وہ بھگوان سے پرارٹھنا کیا کرتا تھا کہ اُسے بیٹا دے۔ گوپی سے پہلے اُس کے دو بیٹے تھے۔ ایک تو پیدا ہوتے ہی مر گیا تھا جبکہ دوسرا صرف آٹھ ماہ زندہ رہ سکا تھا۔

”رام، رام، رام۔“ وہ بڑبڑایا۔ ”بھلا اس بیٹی کی کیا ضرورت تھی؟ یہ میرے کس کام آئے گی؟ لڑکا ہوتا تو بڑھا پے میں میرا سہارا بنتا لیکن یہ تو میری بوٹیاں نوج نوج کر کھا جائے گی۔“

مورتی اپنی جگہ سے اٹھ کر باہر نکل آیا۔ کونے پر بنے ہوئے ایک جھونپڑے کو قہوہ خانے میں تبدیل کر دیا گیا تھا جس کے باہر لکڑی کے تختوں پر بیٹھے ہوئے اُس کے سنگی ساتھی اراک اور قہوہ پینے میں مصروف تھے۔ اُس نے نظریں گھما کر چاروں طرف دیکھا، خیموں اور جھونپڑیوں کا جھمکنا نہ صرف ایک شہر میں تبدیل ہو گیا تھا بلکہ اب تو خیموں کے ساتھ پکے مکانات بھی نظر آنے لگے تھے جو عمال سلطنت کے لیے بنائے گئے تھے۔ ان کے بچوں بچ چار بڑی عمارتیں تھیں جو مقبرے کے انتظامی دفاتر تھے۔ شہر کا نام ممتاز آباد رکھا گیا تھا۔

مورتی بوجھل قدموں کے ساتھ قہوہ خانے کی طرف بڑھا لیکن نصف راستے سے ہی لوٹ آیا۔ اُس کے ذہن پر تھوڑی دیر قبل پیدا ہونے والی بیٹی سوار تھی۔

ooo

ہو، وقت گزرنے کے ساتھ یہ ابال ختم ہو جائے گا۔“

”خرم، گستاخی کی معافی چاہتا ہے ظل الہی، لیکن ہم اُسے اپنی پہلی اور واحد بیوی کے طور پر قبول کرنا چاہتے ہیں، ہم۔۔۔“

”ہمارے احکامات سے روگردانی کی کوشش مت کرو خرم“ ظل الہی نے تیز لہجے میں میری بات کاٹی۔ ”تم وہی کرو گے جس کا ہم حکم دیں گے، محل میں خوب صورت لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں، جو پسند ہو اُسے اپنے لیے منتخب کر کے وقتی طور پر اُس سے لطف اندوز ہو سکتے ہو۔ اُس لڑکی کو بھول جاؤ۔۔۔ اب جاؤ، ہم آرام کرنا چاہتے ہیں۔“

”ظل الہی، ہم درخواست۔۔۔“

”جاؤ۔“

میں نے حکم کی تعمیل میں تساہلی برتی تو اُن کے چہرے پر خفگی کے آثار پیدا ہو گئے۔ میں انہیں مزید پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا چنانچہ میں اٹھ کر کورنش بجالایا اور خارجی دروازے کی طرف بڑھا۔

”ہم ہندوستان کی ہونے والی ملکہ کا انتخاب کر چکے ہیں خرم“

دروازے کے قریب پہنچ کر مجھے ظل الہی کی آواز سنائی دی، لیکن میں اُن کا انتخاب جاننے کے لیے وہاں نہیں رکا۔

ooo

عیسیٰ نے انہیں بتایا تھا کہ یہ ظل الہی کے خوابوں کی تعبیر ہے اور وہ اس بات کو بخوبی سمجھ گئے تھے۔ عظیم اور ماہر فن کار ہونے کے ناتے وہ بھی خواب دیکھتے تھے اور پھر اپنے ہاتھوں کی صنائی سے انہیں تعبیر بخش دیتے تھے۔

شہنشاہ نے اپنے خوابوں میں آنے والی عمارت کا نقشہ اور نمونہ اپنی قلمرو کے ماہرین تعمیرات کو بتایا لیکن جب وہ اُس کے خوابوں کو اُس کی خواہشوں کے مطابق نہ ڈھال سکے تو وہ اُن پر برس پڑا۔ معتبہ ماہرین کوششوں میں لگے رہے اور بالآخر دو سال کی طویل مدت میں وہ لکڑی کا ایک مقبرہ بنانے میں کامیاب ہو گئے جو اس وقت فرش پر رکھا ہوا تھا۔ لیکن یہ ابھی نامکمل تھا۔ انہوں نے ہزاروں تجاویز پیش کیں لیکن شہنشاہ ہند نے انہیں مسترد کر دیا تھا۔ شہنشاہ اُن کی ناکامیوں پر آپے سے باہر ہو گیا، فن کاروں اور ماہرین کو اپنی موت سروں پر منڈلاتی نظر آنے لگی تھی۔۔۔ عیسیٰ نے نظریں پھیر کر اُسے دیکھا، حالانکہ وہ اسے اتنی بار دیکھ چکا تھا کہ اُس کا ایک ایک خط اور ایک ایک محراب اُس کے ذہن پر نقش ہو چکی تھی لیکن وہ اب بھی اُسے ایسے گھور رہا تھا جیسے پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہو۔۔۔ وہ اس سے پیار کرنے لگا تھا۔

محل سے متصل کلیہ تعمیرات میں سینکڑوں آدمی دن رات مقبرے کی اندرونی دیواروں اور اس کی دونوں مجوزہ مساجد کے نقش و نگار کے نمونے بنانے میں مصروف تھے۔ وہ نمونے اور نقشے بناتے اور شہنشاہ جھاگ اڑاتی ہوئی آواز میں انہیں مسترد کر کے نئے سرے سے بنانے کے احکامات جاری کرتا رہتا۔

عیسیٰ کبھی کبھار سوچتا کہ آخر شہنشاہ کیا چاہتا ہے؟ لیکن یہ اُس کی سوچ تھی۔ خود شہنشاہ کی سوچ یہ تھی کہ وہ اپنی محبوب ملکہ کا ایسا مقبرہ تعمیر کرائے جس کی نظیر پوری دنیا میں اور کوئی نہ ہو۔ وہ مقبرے کے درو دیوار میں اپنی خوب صورت محبوبہ کے حسین خدو خال کو سمو دینا چاہتا تھا۔

”شہنشاہ ہند تشریف لاتے ہیں۔“

نقیب کی آواز نے عیسیٰ کو چونکا دیا۔ وہ اور بالکونی میں موجود تمام افراد مودب ہو گئے۔ ذرا دیر بعد ہی بالکونی کے دروازے پر شہنشاہ شاہ جہاں نمودار ہوا۔ اُس کا سفید لبادہ،

سینتیس آدمی۔۔۔ شام کے دُھند لکے میں قلعے کی سبک سفید سے بنی بالکونی میں خاموش کھڑے شہنشاہ ہند کی آمد کے منتظر تھے۔ عیسیٰ اُن سے ذرا فاصلے پر الگ تھلگ کھڑا دریا کے پار نئے شہر کی سرگرمیوں کا جائزہ لے رہا تھا۔

ایک کنیر نے ہنڈا روشن کر دیا اور مذہم سی روشنی میں وہاں موجود افراد کے چہرے چمک اُٹھے۔ وہ تمام، عظیم مغل بادشاہ کی جلی پر دنیا کے مختلف حصوں سے وہاں آئے تھے۔

اسماعیل آفندی، ایک خوش مزاج اور صحت مند ترک، مقبروں کا ماہر نقشہ نگار۔ ایرانی النسل کاظم خان، چاندی اور سونے کے نقش و نگار بنانے کا ماہر۔ ایران کا امارت خان، اعلیٰ پائے کا خطاط۔ دہلی کا ہندو جرن جی لال، پتھر کے کتبے بنانے کا فن کار۔ شہنشاہ جہانگیر کا مصاحب میر عبدالکریم جسے آٹھ سو کنیزوں اور چار سو گھوڑوں کا تحفہ دیا گیا تھا۔ اُن کے ہمراہ مرکارنیت خان تھا جو مقبرے کے انتظامی عمال میں سے ایک تھا۔ یہ تمام لوگ اپنے اپنے شعبوں کے ماہر تھے۔ اُن کا تعلق ہندوستان کے علاوہ سمرقند، شیراز، بخارا سے تھا اور عیسیٰ نے ان کی خدمات کو دولت کے عوض حاصل کیا تھا۔

مقبرے کا نمونہ جو لکڑی سے بنایا گیا تھا نامکمل حالت میں اُن کے عقب میں فرش پر رکھا تھا۔ اُن میں سے کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا بلکہ سب کی نگاہیں دریا کے اُس پار جمی تھیں جہاں دنیا کی ایک عظیم عمارت معرض وجود میں آنے والی تھی۔ انہوں نے جب پہلی مرتبہ مقبرے کے نمونے کو دیکھا تو پہلی نظر میں وہ سمرقند میں غوری امیر اور تیمور لنگ کے مقبروں کے مشابہ نظر آئی لیکن غور سے دیکھنے پر انہیں اپنا خیال بدلنا پڑا۔ پھر اُن کی نظروں میں سکندر آباد میں اکبر اعظم کا مقبرہ گھوم گیا لیکن یہ اُس جیسا بھی نہیں تھا۔ اعتماد الدولہ غیاث بیگ کا مقبرہ بھی انہوں نے دیکھا تھا لیکن یہ اُس سے بھی مختلف تھا۔

کمرے میں موجود تمام افراد کو سانپ سونگھ گیا۔
عیسیٰ آگے بڑھا۔ ”نمونہ ابھی مکمل نہیں ہوا ظلِ الہی۔“ اُس نے جھک کر شہنشاہ کو
بتایا۔ ”ایک بار تعمیر شروع ہوگئی تو اُس کے نقشے میں ترمیم نہ ہو سکے گی۔ اس لیے یہ لوگ ظلِ
الہی کے حکم کے منتظر ہیں۔“

”ہم نے سب کچھ کر دیا ہے، تم لوگ مقبرے کے اضافی نقشے اور نمونے بناؤ تا کہ اس
کی سادگی اور خوب صورتی متاثر نہ ہو۔۔۔ تخیل۔۔۔ عیسیٰ!“
تمام لوگ ایک ایک کر کے باہر نکل گئے۔ عیسیٰ نے آگے بڑھ کر ظلِ الہی کو تعظیم پیش کی۔
”وہ کیا پسند کرتی تھی عیسیٰ؟“

عظیم مغل شہنشاہ کا انداز اُس بچے کا سا تھا جو ہر رات سونے سے پہلے کہانی سننے کی ضد
کرتا ہے۔۔۔ اور اُس کی ماں ایک ہی کہانی ضروری ترمیم کے ساتھ ہر رات اُسے سنا دیا
کرتی ہے۔

ooo

سنگ سفید کے فرش پر گھسٹ رہا تھا۔ اُس نے بالکونی میں موجود افراد میں سے کسی کی طرف
دیکھا نہ انہیں مخاطب کیا۔ اُس کا رخ لکڑی کے مقبرے کی طرف تھا۔ تمام لوگ اب بھی خم ہو
کر بادشاہ کے حضور کورنش بجالا رہے تھے۔

”روشنی کا انتظام کیا جائے۔“ اُس کی پاٹ دار آواز بالکونی میں گونجی۔
”جی ظلِ الہی۔“ تمام لوگوں کے منہ سے بیک وقت نکلا اور ہر کوئی اپنے اپنے طور پر
روشنی کا بندوبست کرنے چل دیا۔ بالکونی میں صرف شہنشاہ کھڑا رہ گیا تھا۔ کمرے میں جلنے
والے واحد ہنڈے کی روشنی میں اُس کا سایہ لکڑی کے مقبرے پر لہرا رہا تھا۔

روشنی ہو جانے پر بھی اُس نے کسی کو مخاطب نہیں کیا۔ وہ آہستہ روی سے جھروکے کی
طرف بڑھ گیا۔ جتنا کاٹھا ٹھیس مارتا پانی اُس کے سامنے تھا۔ وہ تصور کی آنکھ سے دریا میں
اپنی محبوب ملکہ کے مقبرے کی پرچھائیں دیکھ رہا تھا۔
میر عبد الکریم نے سب سے پہلے بادشاہ کو مخاطب کرنے کی جرأت کی۔ وہ آگے بڑھ کر
کورنش بجالایا۔

”شہنشاہ کے اقبال کا سورج ہمیشہ بلند رہے۔۔۔ غلام کچھ عرض کرنے کی اجازت
چاہتا ہے۔“
شاہ جہاں اُس کی طرف پلٹا اور سر کی ایک ہلکی سی جنبش سے بات جاری رکھنے کا اشارہ
کیا۔

”دریا کی گزرگاہ تبدیل ہونے سے پانی مقبرے کے نیچے پہنچنے کا خدشہ ہے ظلِ الہی،
زمین اس بھاری بھرکم مقبرے کا بوجھ برداشت نہیں کر سکے گی، اس لیے اگر ظلِ الہی اجازت
دیں تو ہم اسے کسی اور جگہ۔۔۔“

”اس کی نکاسی کا بندوبست کرو۔“ شہنشاہ نے حکم دیا۔

”ایسے معمولی مسائل لے کر ہمارے پاس مت آیا کرو، ماہر تعمیرات تم ہو، ہم نہیں۔“
”جی ظلِ الہی، غلام معافی کا خواستگار ہے، لیکن ہمارے پاس پانی کو مزید رسنے سے
روکنے کی غرض سے بنیادوں میں ڈالنے کے لیے کچالو ہائیں ہیں۔“

”خریدلو۔“ شہنشاہ گر جا۔ ”ابھی تک مقبرے کی تعمیر کیوں کر شروع نہیں ہو سکی۔“

مورتی کے دن بے حد مایوسی اور اکتاہٹ میں گزر رہے تھے۔ وہ ہر روز اپنے اوزار تھیلے میں سے نکال کر انہیں تکتا اور پھر واپس ڈال دیتا۔

ایک شام جب وہ مایوسی کی زندہ تصویر بنا اپنی جھونپڑی کے باہر بیٹھا تھا۔۔۔ اُسے کچھ لوگ اپنی طرف بڑھتے نظر آئے۔ ان میں سے ایک آدھ کو وہ پہچانتا تھا لیکن باقی اُس کے لیے اجنبی تھے۔ تمام لوگ امراء کا لباس پہنے ہوئے تھے۔

جونہی وہ قریب آئے، مورتی بوکھلا کر اٹھا اور ہاتھ جوڑ کر نمستے کہا۔ مورتی نے ادھر ادھر دیکھا لیکن اُسے کچی اور گندی زمین کے علاوہ کوئی جگہ نظر نہ آئی جہاں وہ آنے والے معزز افراد کو بیٹھنے کی پیش کش کرتا۔

”میرا نام چرن جی لال ہے۔“ ایک چھوٹے قد کے موٹے شخص نے اپنا تعارف کرایا۔ ”میں ملکہ کے مقبرے پر پتھر کے کتبے نصب کرنے دہلی سے یہاں آیا ہوں اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم ایک اچار یہ ہو۔“

مورتی مسکرا دیا۔

”میں بھی ایک سنگ تراش ہوں لیکن اس عمارت کو میری خدمات کی ضرورت نہیں ہے اس لیے میں دوسرے کام کرتا ہوں۔“ پھر مورتی نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ”کیا آپ شاہ کے مصاحب ہیں؟“

”نہیں۔“ چرن جی نے جواب دیا۔ ”میں بھی تمہاری طرح مقبرے کے کام کے لیے نہیں آیا۔۔۔ یہاں ہمارے جیسے اور بہت سے ہندو ہیں لیکن کوئی مندر نہیں ہے جہاں ہم بھگوان کی پوجا کر سکیں۔ ہمیں نہیں معلوم کہ ہمیں مندر کی تعمیر کی اجازت ملے گی یا نہیں لیکن ہم شہنشاہ سے اس سلسلے میں بات کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔“

مورتی، مجوزہ مقبرے کی مشرقی جانب پہاڑی پر کھڑا ادھر ادھر دیدے گھمار رہا تھا۔ گوہی اپنی چھوٹی بہن ساوتری کے ہمراہ اُس کے برابر کھیل رہا تھا۔ ساوتری اب بڑی ہو گئی تھی۔ سیتا اُسے اُس کے پاس چھوڑ کر کام پر چلی گئی تھی۔ جب ساوتری کو بھوک لگتی، مورتی اُسے سیتا کے پاس لے جاتا اور وہ دودھ پلا کر اُسے واپس کر دیتی۔

پہاڑی سے نیچے ایک ہجوم جمع تھا۔ بہت سے مسلمان مولوی اور ہندو جوتشی اُس جگہ موجود تھے تاکہ مقبرے کی تعمیر کے آغاز کے لیے زمین پر پہلا پھاڑا چلانے کی صحیح اور سعد گھڑی کا حساب لگا سکیں۔ تمام کام رک گیا تھا اور مورتی رسم آغاز کا منتظر تھا۔

پھر اُسے نقاروں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

دور لال قلعے سے اُسے شاہی جلوس برآمد ہوتا نظر آیا۔ شہنشاہ ہند شاہی سواری پر تشریف لا رہا تھا۔۔۔ اُس کے ساتھ مغلیہ سپاہ امرائے سلطنت اور اعلیٰ اہل کاروں کا ایک جم غفیر تھا۔

پہاڑی کے سامنے موجود ہجوم میں شہنشاہ کی آمد کا اعلان ہونے لگا۔ نقیب اور چوہدار چیخ چیخ کر لوگوں کو نگاہیں نیچے رکھنے اور باادب رہنے کا حکم دے رہا تھا اور پھر شہنشاہ ہندوستان ابومظفر شہاب الدین محمد شاہ جہاں کی سواری آ پہنچی۔ تمام گردنیں احتراماً جھک گئیں۔ آنکھیں نیم وا ہو گئیں اور شور مچاتے ہجوم پر سکوت مرگ طاری ہو گیا۔

شہنشاہ نے شاہی پالکی سے اتر کر زمین کو بوسہ دیا اور افتتاح کی رسم پوری ہو گئی۔

مورتی بہت حیران ہوا۔ اُسے یاد تھا کہ جب کسی مندر کی تعمیر کا آغاز ہوتا تھا تو اس کے افتتاح میں کئی روز لگ جایا کرتے تھے۔ بے انتہاء عائیں مانگی جاتیں۔ بھجن گائے جاتے۔ وید۔۔۔ صبح سے شام تک اشلوک پڑھتے، گھی اور دودھ کے چراغ جلانے جاتے اور غریبوں میں لنگر تقسیم ہوتا۔

اُسے اس چھوٹے سے تماشے سے مایوسی ہوئی تھی۔

مغلیہ کا شاہی نشان، طلوع ہوتے ہوئے سورج کے سامنے بیٹھا ہوا شیر، استادہ تھا۔ پھر چار مزید ہاتھی تھے جن پر سبز پرچم لہرا رہے تھے۔ ہر پرچم پر سورج کو پوری آب و تاب کے ساتھ چمکتا دکھایا گیا تھا۔ اُن کے پیچھے نو سفید گھوڑے چل رہے تھے جن پر کوئی سوار نہیں تھا۔ ان گھوڑوں کی کاٹھیاں، رکابیں اور لگامیں خالص سونے کی تھیں۔ اُن کے عقب میں دو گھڑسوار تھے۔۔۔ ایک کے ہاتھ میں شہنشاہ ہند کا شاہی خطاب ”فاتح عالم“ اور دوسرے کے پاس شاہی نقارہ تھا۔۔۔ جسے کو بجا کر وہ عظیم مغلیہ بادشاہ کی شاہی سواری کا اعلان کرتا تھا۔

اُن کے آگے آگے تیس آدمی پیدل بھاگ رہے تھے، وہ شہنشاہ کی سواری کے راستے پر پانی کا چھڑکاؤ کرتے جا رہے تھے تاکہ گرد مغل بادشاہ کو پریشان نہ کرے۔ خود شہنشاہ کے دائیں بائیں ہزاری امیر ایک ہزار گھڑسواروں کے دستوں کے سربراہ چل رہے تھے جو اپنے اپنے دستوں کی قیادت کر رہے تھے۔

شہنشاہ کے عقب میں کچھ فاصلے پر چار وزیروں کی سواری تھی۔ اُن کے پاس امور سلطنت کی مختلف دستاویزات اور کاغذات تھے۔ ان کاغذات میں اُن تمام علاقوں کے بارے میں ضروری معلومات بھی محفوظ تھیں جن سے شاہ کی سواری گزرنی تھی۔ اگر شہنشاہ دریافت کرتا تو وزیر اُن کاغذات کی مدد سے اُسے دیہہ کے نام، اُس کے سربراہ کے نام، آمدنی کے ذرائع، فصلوں، پھلوں اور پھولوں کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کرتے، بعد ازاں یہ معلومات جہانگیر نامہ مغل بادشاہ کی خودنوشت کے لیے محفوظ کر لی جاتیں۔

ان سے ذرا پیچھے دو اور افراد چل رہے تھے۔ اُن کے پاس ایک رسی تھی جس کی مدد سے وہ لال قلعہ کے دروازوں سے لے کر اب تک کی طے کی گئی مسافت ناپتے آ رہے تھے۔ ان دونوں کے عقب میں ایک تیسرا آدمی تھا جو یہ فاصلہ اپنے پاس موجود ہی کھاتے میں درج کرتا تھا۔ چوتھے آدمی کے پاس پیتل کا ایک طبل اور ایک ریت گھڑی تھی۔ ہر ایک ساعت کے بعد وہ طبل پر زوردار ضرب لگاتا تھا۔

شہنشاہ کی سواری سے کچھ فاصلے پر دو گھڑسوار اپنی کلائیوں پر شکرے بٹھائے چل رہے تھے۔ پھر دس گھڑسوار تھے جن میں سے چار کے پاس شاہی جزائلیں (رائفلیں) تھیں جو سونے کے کام والے تھیلوں میں محفوظ تھیں۔ پانچویں کے پاس شاہی بلم (نیزہ) چھٹے کے

”خاموش رہو۔“ میں نے نرمی طرح اُسے ڈانٹ دیا اور وہ یوں چپ ہو کر شکوہ بھری نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا جیسے کوئی چھوٹا بچہ گویا چھیننے والے کو دیکھتا ہے۔ میں نے ایک نظر اُسے دیکھا اور پھر قافلے کا جائزہ لینے لگی۔

شہنشاہ ہند جہانگیر۔۔۔ سفر میں تھے اور ان کے ساتھ پوری سلطنت مغلیہ سفر میں تھی۔ عجب گہما گہمی کا عالم تھا۔ آگرہ سے چلے ہوئے ہمیں دو روز ہو چکے تھے۔ تیسرے روز میرا چھوٹا سادستہ، شاہی سواری سے الگ ہو کر جنوب کی طرف بنگالہ کو کوچ کر جاتا۔ میں پھوپھو مہرا لستہ سے ملنے جا رہی تھی اور خاص طور سے اس بات پر خوش تھی کہ کچھ روز آگرہ کے تصنع سے نجات ملے گی۔

میں قافلے میں جس جگہ سفر کر رہی تھی۔۔۔ وہاں سے نہ مجھے شاہی قافلے کا اگلا حصہ نظر آ رہا تھا اور نہ ہی اُس کے آخری سوار دکھائی دے رہے تھے۔ اسی قافلے میں آگے۔۔۔ دُور کہیں میرا محبوب ولی عہد ہند۔۔۔ اپنے شہنشاہ باپ کے ساتھ جو سفر تھا اور ہمارے درمیان انسانوں اور بھیڑیوں کا ایک لامتناہی سمندر تھا۔

میں نے ساتھ گھوڑا دوڑانے والے عیسیٰ کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ وہ میری ڈانٹ کھا کر افسردہ ہو گیا تھا۔

”وہ جانتے تو ہوں گے کہ میں اُن کے عقب میں کہیں سفر کر رہی ہوں۔“ میرا اشارہ شہزادہ خرم کی طرف تھا۔ ”اگر وہ جلد مجھ سے ملنے نہ آئے، عیسیٰ! تو تم خود اُن کے پاس جانا اور انہیں یہ دے دینا۔“

میں نے چاندی کی ایک انگشتری اتار کر عیسیٰ کو تھما دی جسے اُس نے اپنی قبائیں چھپالیا۔ ”اسے کھونا مت۔“

”میں اپنی زندگی سے زیادہ اس کی حفاظت کروں گا۔“ اُس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے محتاط انداز میں جواب دیا۔

قافلہ پوری رفتار سے رواں دواں تھا۔ اگلے حصے میں بادشاہ ہندوستان۔۔۔ شہنشاہ جہانگیر اور ولی عہد کشور مغلیہ۔۔۔ شہزادہ خرم کی سواری تھی۔

اُن کے آگے آگے دو دیوبہیل ہاتھی چل رہے تھے جن میں سے ہر ایک پر سلطنت

پاس شای تلواری، ساتویں کے پاس سپر (ڈھال) آٹھویں کے پاس خنجر، نویں کے پاس کمان اور دسویں کے پاس شای ترکش تھا۔

اسلحہ برداروں کے بعد احدی (شہنشاہ کے ذاتی باڈی گارڈز) تھے جو براہ راست شہنشاہ کو جواب دہ تھے۔ ان کے پیچھے تین شای محافے (پالکیاں) تھے جن کے پردوں پر سونے اور چاندی کا کام کیا ہوا تھا۔ ان محافوں کے عقب میں چوبیس گھڑ سوار تھے۔ ان میں سے آٹھ کے پاس ترم (تانبے کا بنا ہوا ایک آلہ موسیقی)، آٹھ کے پاس بانسریاں اور آٹھ کے پاس نقارے تھے۔ پھر پانچ شای ہاتھی تھے جن کے ہودے سونے اور چاندی کے تھے۔ یہ شہنشاہ کے آرام کے واسطے تھے۔ ان پانچوں کے ساتھ تین اور ہاتھی بھی تھے، درمیانی ہاتھی پر چاندی کا ایک کھمبنا ہوا تھا جس کے اوپر چاندی کے تین ہاتھ بنائے گئے تھے۔ یہ سب محفل میں لپٹے ہوئے تھے۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ مغل شہنشاہ۔۔۔ ”عقیدہ محمدی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا پیروکار ہے۔“ دائیں جانب والے ہاتھی پر اسی قسم کا نشان نصب تھا جس پر درج تھا۔ ”جہانگیر، عقیدے کو پھیلانے اور حفاظت کرنے والا۔“ جب کہ تیسرے پر پتیل کا ایک کتبہ آویزاں تھا جس پر۔ ”اللہ ایک ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اللہ کے رسول ہیں۔“ کے الفاظ کندہ تھے۔

چار مزید ہاتھی ان کے عقب میں تھے۔ ان کے ہودوں میں دوسرے اہم نشانات رکھے گئے تھے۔ ایک میں میزان تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ شہنشاہ، انصاف پسند ہے۔ دوسرے پر ایک بہت بڑا پرچم نصب تھا، جب ہوا چلنے کے ساتھ پرچم لہراتا تو سفید کپڑے پر بنا ہوا سنہری مگرچھ، زندہ مگرچھ کی طرح حرکت کرتا نظر آتا۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ ”جہانگیر دریاؤں کا حاکم اعلیٰ ہے۔“ تیسرے ہاتھی پر بھی اسی طرح کا ایک بڑا پرچم لہرا رہا تھا جس پر ایک بہت بڑی مچھلی کا سر بنا ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ”جہانگیر، سمندروں کا آقا ہے۔“ چوتھے پر ایک سنہری بلم نصب تھا، یہ شہنشاہ کے فاتح ہونے کا نشان تھا۔ ان ہاتھیوں کے پیچھے بارہ ہاتھی اور تھے جن پر موسیقار سوار تھے۔

یہ سب کچھ میرے اور میرے محبوب کے درمیان حائل تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ دنیا کے ایک سرے پر ہو اور میں دوسرے سرے پر۔۔۔

”عیسیٰ۔“ دفعتاً ہی میری بے قراریوں میں اضافہ ہو گیا۔ ”میرا گھوڑا لو اور ابھی شہزادے کے پاس جاؤ اور میرے۔۔۔“ میری زبان سے فوری طور پر وہ لفظ ادا نہ ہو سکا جو میں شہزادے کے لیے کہنا چاہتی تھی۔۔۔ ”میرے محبوب کو بتاؤ کہ میں ان کی منتظر ہوں۔ انہیں پیغام دو کہ میں ان سے ملنے آؤں یا وہ خود تشریف لائیں گے۔ ان سے پوچھنا کہ کیا میرے لیے ان کی۔۔۔ محبت ختم ہو گئی ہے؟ کیا میں انتظار کروں؟ ایک ہونے کا، انہیں کہنا کہ میں ان کی ہونے والی ذلہن سے اتنی ہی شدید نفرت کروں گی جتنی شدت سے انہیں چاہتی ہوں، انہیں کہنا۔۔۔“

”آغاچی۔“ عیسیٰ نے مجھے ٹوک دیا ورنہ میں جذبات کی رو میں بہ کر جانے کیا کیا کہتی جا رہی تھی۔ ”میں صاحبِ عالم کو یہ سب نہ کہہ پاؤں گا۔“

”تب پھر صاحبِ عالم کو یہاں آنے کا پیغام دو۔ میں خود کہہ لوں گی، تم میرا گھوڑا لو اور ہوا ہو جاؤ۔“

عیسیٰ نے خوف زدہ نگاہوں سے میرے سرکش اور منہ زور گھوڑے کو دیکھا۔۔۔ پھر ڈرتے ڈرتے گویا ہوا۔

”آغاچی، یہ گھوڑا میرے قابو میں نہیں آئے گا، میں اپنے گھوڑے پر چلا جاتا ہوں۔“

”نہیں، وہ سُست رفتار ہے، میں اتنا انتظار نہیں کر سکتی۔“

مرتا کیا نہ کرتا کہ مصداق۔۔۔ بے چارہ عیسیٰ اپنے گھوڑے سے اتار بیٹھا۔ گھوڑے پر سوار ہو گیا جب کہ میں ایک قریبی پاکی میں چلی گئی جو میرے لیے ہی مخصوص تھی۔ اس طرح میں بہت سی آنکھوں سے اپنے نینوں کے انمول موتیوں کو چھپانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

میری پاکی ملکہ ہندوستان مہارانی مان متی کی سواری کے عقب میں تھی۔ وہ ایک ہاتھی پر ایک پناہبر (ہاتھی پر بنا ہوا تخت) پر تشریف فرما تھیں جو سونے اور قیمتی پتھروں سے بنایا گیا تھا۔ وہ ایک عجیب و غریب مہلک بیماری میں مبتلا تھیں۔ انہوں نے محل میں ہی رہنے پر اصرار کیا تھا لیکن میری معلومات کے مطابق شہنشاہ نے اس سفر کے لیے بہ طور خاص انہیں مجبور کیا تھا۔

گہرے ہو گئے۔ شاہی قافلے کو قیام کا مژدہ سنایا گیا اور پھر دوسری طرح کی سرگرمیاں شروع ہو گئیں۔

شاہی قیام گاہ کے نگراں نے چھوٹا دریاں نصب کرانی شروع کر دیں اور کچھ ہی ساعتوں میں بنجر زمین کے سینے پر خیموں کا پورا شہر آباد ہو گیا جس میں دیوان خاص، دیوان عام اور شاہی آرام گاہ سے لے کر ایک عام کنیر یا خواجہ سرا تک کے خیمے شامل تھے۔

میری چھوٹا دریا۔۔۔ حرم کی خواتین کے ساتھ نصب کی گئی تھی۔ میں نے غسل کر کے دن بھر کی تھکن اتاری اور پوشاک تبدیل کی۔ کنیروں نے کھانے کا پوچھا لیکن میں انکار کر کے آرام کرنے لیٹ گئی۔

عیسیٰ جب اندر داخل ہوا تو میں چھوٹا دریا کی دیوار کی جانب منہ کیے لیٹی تھی۔
 ”آغاچی۔“ مجھے اُس کی مایوسانہ آواز سنائی دی۔ ”میں شرمسار ہوں کہ صاحبِ عالم کو تلاش نہ کر سکا۔ میں جس سے بھی دریافت کرتا، وہ مجھے اگلے کے پاس روانہ کر دیتا تھا۔“
 میں بدستور اُسی طرح لیٹی رہی۔ عیسیٰ کچھ دیر میرے جواب کا انتظار کرتا رہا لیکن جب میں خاموش رہی تو وہ باہر چلا گیا۔ میں نے اس کے قدموں کی آہٹ سن کر بھی اپنا منہ اُس طرف نہ کیا۔ مجھے رہ رہ کر صاحبِ عالم پر غصہ آ رہا تھا لیکن ظاہر ہے میں کیا کر سکتی تھی؟ کہاں ہندوستان کا ہونے والا بادشاہ اور کہاں میں؟ ایک عام سے امیرِ الامراء کی پوتی۔۔۔

کافی دیر یونہی گزر گئی قدموں کی آہٹ دوبارہ سنائی دی۔ وہ عیسیٰ تھا۔
 ”آغاچی۔“ اُس نے میرے قریب آ کر سرگوشی کی ”ایک نامہ بر تمہارا منتظر ہے۔“
 ”کس کا پیغام لایا ہے؟“

”صاحبِ عالم کا۔“ عیسیٰ نے جواب دیا۔ ”چل کر اُس سے مل لو۔“
 میں نے پھر بھی اپنی جگہ سے جنبش نہ کی اور بدستور اُس کی طرف، پشت کیے لیٹی رہی۔
 ”پیغام لے آؤ اور اُسے بتا دو کہ میں دو ایک روز میں جواب بھجوادوں گی۔“
 میں نے عیسیٰ کے قدموں کی آہٹ نہیں سنی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ بدستور کھڑا ہے۔ میں غصے سے اٹھ بیٹھی۔

”تم نے سنا نہیں، میں نے کیا کہا ہے؟“

ملکہ کے ہاتھی کی حفاظت ڈیڑھ سواڑبک عورتوں کے سپرد تھی جو بہادری میں مردوں سے کسی طور کم نہ تھیں۔ وہ نہ صرف خود نیزوں سے مسلح تھیں بلکہ اُن کے ارد گرد لٹھی بردار خواجہ سراؤں کا ایک دستہ بھی چل رہا تھا۔ اُن کی سواری کے ساتھ سینکڑوں دوسرے ہاتھی اور پالکیاں بھی تھیں جن میں شہنشاہ کے حرم کی دوسری خواتین سوار تھیں اُن میں سے ہر ایک کے ساتھ غلاموں، کنیروں اور خواجہ سراؤں کی الگ الگ فوج ظفر موج تھی۔

سفر میں ہونے کے باوجود مغل بادشاہ، سلطنت کے امور کو پس پشت نہیں ڈالتے تھے۔ اس وقت بھی شاہی قافلے کے ساتھ اسی اُونٹوں، تیس گھوڑوں اور بیس چھکڑوں پر شاہی ریکارڈ موجود تھا۔ ان کے علاوہ پچاس اُونٹوں پر ایک سو صندوق لدے ہوئے تھے۔ جن میں شاہ کے ملبوسات تھے۔ تیس ہاتھیوں پر زرو جواہر کا خزانہ تھا جو ایسے افراد کو انعام و اکرام دینے کے لیے ساتھ لیا گیا تھا جو شہنشاہ کی نظرِ کرم کے مستحق ٹھہرتے۔ دو اُونٹوں پر چاندی کے سکے، ایک سو اُونٹوں پر طلائی اشرفیاں اور ڈیڑھ سو اُونٹوں پر شیر، چیتے یا نیل گائے کے شکار کے لیے بڑے بڑے جال لدے ہوئے تھے۔ پچاس اُونٹ، پینے اور نہانے کا پانی لیے قافلے کے ساتھ تھے جب کہ کئی بڑے بڑے چھکڑے بھی تھے جن پر خوبصورت، آرام دہ اور دیدہ زیب حمام بنے ہوئے تھے۔ ان حماموں میں شہنشاہ یا اہم خواتین کو غسل کی سہولت حاصل تھی۔

اس شاہی قافلے کی حفاظت۔۔۔ راجپوت شہزادے بے سنگھ کے سپرد تھی جو آٹھ ہزار گھڑسواروں کے ساتھ عقب میں آ رہا تھا۔

شاہی دستے سے ایک کوس آگے ایک اُونٹ سوار سفید، کتان (سوتی کپڑا) کے تھان لیے چل رہا تھا، راستے میں اگر کوئی مردہ جانور، انسان یا گندگی کا ڈھیر نظر آتا تو وہ اسے کتان سے ڈھانپ دیتا تا کہ اسے دیکھ کر شہنشاہ کی طبیعت مکر نہ ہو۔

دن کے دو، پہر ڈھل چکے تھے اور اب درختوں کے سائے پھیلنے شروع ہو گئے تھے لیکن ابھی تک عیسیٰ کی واپسی کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میرے منہ زور گھوڑے نے ضرور اُسے گرا دیا ہوگا اور وہ اُسی کے سموں تلے آ کر کچلا گیا ہوگا۔ خود غرضی کی ایک سوچ میرے ذہن میں در آئی کہ اگر وہ مر گیا تو میرے محبوب تک میرا پیغام کون پہنچائے گا۔ میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد باہر جھانکتی رہی لیکن عیسیٰ نہ آیا۔ حتیٰ کہ شام کے سائے

”میں تمہاری ناراضی کی وجہ سمجھتا ہوں آغاچی۔“ عیسیٰ نے نگاہیں جھکا کر عاجزی سے کہا۔ ”نامہ بر نے کہا ہے کہ وہ پیغام صرف تمہیں دے گا۔“

میں نے پہلی مرتبہ عیسیٰ کو بہ غور دیکھا۔ وہ نسبتاً نیم تاریکی میں تھا لیکن مجھے اُس کے چہرے اور بازوؤں پر خراشیں صاف نظر آ رہی تھیں۔

”مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہیں اپنے گھوڑے پر جانے کے لیے مجبور کیا۔“

”اُس نے مجھے کئی بار گرایا، آغاچی۔“ عیسیٰ نے بے چارگی سے کہا اور تمام تر غصے کے باوجود میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں مسہری سے اُتر آئی۔

”میں تمہارے نامہ بر سے ملتی ہوں، مجھے اُمید ہے کہ وہ اچھی خبر لایا ہوگا۔“

نامہ بر، چھو لداری کی ایک جانب تاریکی میں کھڑا تھا تاکہ گشت کرنے والے سپاہیوں اور ازبک عورتوں سے محفوظ رہ سکے۔ پورے جسم کے گرد اُس نے ایک کمبل لپیٹ رکھا تھا جس میں اُس کی آنکھوں کے سوا پورا چہرہ بھی پوشیدہ تھا۔

”تم کس کا پیغام لائے ہو، نامہ بر؟“ میں نے اُس کے قریب جا کر عام سے انداز میں دریافت کیا۔

”اپنا۔۔۔ ہماری محبوب۔“ کمبل کے عقب سے آواز آئی اور میرا انگ انگ خوشی سے جھوم گیا۔ وہ آواز شہزادہ خرم کی تھی۔ میری محبت کی تھی۔ ”کیا وجہ ہے کہ ہم ہمیشہ تاریکی میں ہی ملتے ہیں؟“

”شاید صاحبِ عالم، مجھے دن میں دیکھنے کی تاب نہیں رکھتے۔“ میں نے محتاط لہجے میں جواب دیا۔

”کیا تم ہم سے ناراض ہو؟“

”میں ہندوستان کے ہونے والے بادشاہ سے ناراض ہونے کا کوئی حق نہیں رکھتی صاحبِ عالم! میں آپ کی باندی ہوں۔ بس افسوس اس بات کا تھا کہ مہینوں گزر گئے لیکن آپ کی جانب سے تو ہوا کا کوئی جھونکا بھی میری جانب نہیں آیا۔۔۔ جس سے مجھے آپ کی چاہتوں کی خوشبو آ سکتی، ہاں میں نے بہت سی سرگوشیاں سُنیں، جھوٹ سُنے اور۔۔۔“

”تم جانتی ہو کہ ہم نے تمہاری خاطر سارے شاہی کرد و فر کو تاج دیا ہے۔“ صاحبِ عالم

نے میرا جملہ کاٹ دیا۔ ”کیا مورخ آج سے پہلے ایسی کوئی مثال پیش کر سکتا ہے کہ کسی سلطنت کا ولی عہد۔۔۔ یوں فقیروں کا بھی بدل کر اپنی محبوبہ سے ملنے آیا ہو۔۔۔“

ایک خواجہ سرا قریب سے گزرا تو میں نے صاحبِ عالم کو مزید تاریکی میں ہو جانے کا اشارہ کیا۔ ”۔۔۔ لیکن اس کے باوجود ہماری کچھ ذمے داریاں ہیں ہماری محبوب، ہم پدر بزرگوار کو چھوڑ کر تم سے ملنے نہیں آ سکتے تھے۔“

”لیکن کوئی نامہ بر تو آ سکتا تھا۔“ میں نے شکوہ کیا ذرا دیر پہلے کا تمام غصہ، خوشبو کی مانند ہوا میں تحلیل ہو گیا تھا۔

”محبتوں کے نامے دلوں سے بہتر کوئی سنا سکتا ہے نہ سُن سکتا ہے، یہ جذبے باہم محسوس کرنے کے ہوتے ہیں، قاصدوں کے ہاتھوں روانہ کرنے کے نہیں ہوتے۔“

”اگر مجھو ریوں کے دریا اتنے ہی گہرے تھے تو پھر ایک کنیر کے دل میں محبت کی جوت کیوں جگائی تھی، صاحبِ عالم؟“ میں نے پھر گلہ کیا۔

”تم نے سنا ہوگا کہ۔۔۔“

”گستاخی معاف شہزادے، میں سُن چکی ہوں۔“

”تم یہ بھی سمجھتی ہو گی کہ ہماری زندگیاں ہماری اپنی نہیں ہوتیں بلکہ سلطنت اور رعایا کے لیے وقف ہوتی ہیں۔ وہ ہماری زندگی میں حصے دار ہوتے ہیں۔ ہم تم سے محبت ضرور کرتے ہیں لیکن نہیں چاہتے کہ آنے والے دنوں کا تاریخ ساز ہمیں مشفق باپ کے نافرمان بیٹے کی حیثیت سے یاد کرے۔“

”کیا شہنشاہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی نہیں فرمائیں گے؟“

”ظُلّ الہی فیصلہ کر چکے ہیں، جانِ خرم۔“ انہوں نے میرا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

”لیکن ایک فیصلہ ہم نے بھی کیا ہے، تم ہماری دوسری بیوی۔۔۔“

”آپ کا ظلم میری زندگی ہے صاحبِ عالم۔“ میں نے سرگوشی کی۔ ”میں آپ کی

باندی ہوں اور زندگی کے آخری سانس تک آپ کے قدموں کی خاک رہنا چاہتی ہوں۔“

”ہم تمہیں اپنے دل کی ملکہ بنائیں گے ارجمند!“ صاحبِ عالم نے جذباتی انداز میں

کہا۔ ”ہم ایک نہ ایک دن اس عظیم سلطنت کے بادشاہ بنیں گے اور آج تم سے وعدہ کرتے

آزادی کا تصور کس قدر فرحت بخش ہوتا ہے۔ اس کا احساس مجھے اُس وقت ہوا جب میرا چھوٹا سا قافلہ عظیم الشان شاہی دستے سے بنگالہ جانے کے لیے الگ ہوا۔ اب میں خود اس قافلے کی سربراہ تھی۔ ظل الہی نے پانچ سو سوار میرے ساتھ کیے تھے۔ عیسیٰ اور ایک درجن غلام ان کے علاوہ تھے۔

ہم دن کو سفر کرتے اور رات کو سراؤں میں قیام کرتے جو مسافروں کی سہولت کے لیے ملک کے طول و عرض میں بنی ہوئی تھیں۔ سپاہیوں کو ایسی سراؤں کی حدود میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ ایک روز ہم ایسی ہی ایک سرائے میں اترے تو میں نے سونے کے لیے الگ خارگاہ (خیمہ) نصب کرائی۔

سونے کے لیے بستر پر لیٹی تو تصور کی آنکھ کے سامنے شہنشاہ ہند اور ولی عہد سلطنت آ موجود ہوئے۔ میں دونوں باپ بیٹوں کی گفتگو پر غور کرنے لگی جو میرے بارے میں ہوئی تھی۔ میں سوچنے لگی کہ وہ قیمتی لڑکی کون سی ہے جسے ظل الہی اپنے ولی عہد کی ذہین بنانا چاہتے ہیں؟ وہ مسلمان ہے یا ہندو؟ کسی ملک کی شہزادی ہے یا کسی ریاست کی راجکمار؟ لیکن ظاہر ہے میں ایک خیمے میں پڑی، بلند و بالا محلات کے پراسرار ایوانوں میں ہونے والے فیصلوں تک کس طرح رسائی پاسکتی تھی۔

ذرا دیر بعد میں نے کچھ گھڑ سواروں کو اپنی قیام گاہ کی طرف آتے محسوس کیا۔ ناپیں معدوم ہوئیں تو مجھے عیسیٰ کی آواز سنائی دی۔ وہ آنے والوں سے مخاطب تھا۔ مجھے اُس کے الفاظ تو سمجھ میں نہیں آئے لیکن ذرا دیر بعد اُس نے میری خارگاہ میں جھانکا۔

”آغاچی۔“ اُس نے مجھے پکارا، میں نے اُس کی آواز سنی لیکن یہی ظاہر کیا کہ میں سو

ہیں کہ ہمارے بعد جو شخص ہندوستان کے تخت کا وارث ہوگا وہ ہم دونوں کا بیٹا ہوگا۔“

”کنیز اس عنایت پر کورنش بجا آتی ہے صاحب عالم“ میں فرشی سلام کے لیے جھک گئی، لیکن شہزادے نے کندھوں سے پکڑ کر فوراً مجھے اپنے رو برو کر لیا۔

”ہم نے پہلے بھی تمہیں بتایا تھا کہ تمہارا مقام یہ نہیں، ہمارا دل ہے۔“ شہزادے نے مجھے اپنے حصار میں قید کرتے ہوئے کہا۔ ”تم ہماری ملکہ ہو، ہندوستان کی ہونے والی ملکہ۔“

”آغاچی۔“ عیسیٰ کی تیز سرگوشی کے باعث شہزادے کا جملہ ادھور اڑ گیا۔

”کون گستاخ ہے؟“ شہزادہ فوراً مجھ سے الگ ہو گیا۔

”میرا ملازم ہے۔“

”جان کی امان چاہتا ہوں صاحب عالم۔“ عیسیٰ نے شہزادے کو تعظیم پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ دیکھ لیے گئے ہیں اور ازبک عورتیں لائیں لے کر اس طرف بڑھ رہی ہیں۔ میرے ساتھ آئیے، میں آپ کو حرم کے خیموں سے باہر لیے چلتا ہوں۔“

”شاید قدرت کو ہماری طویل ملاقات منظور نہیں ارجمند۔“ شہزادے نے سرگوشی کی اور عیسیٰ کی رہنمائی میں ایک سمت بڑھ گیا۔

میں خیمے کے در پر کھڑی اُس وقت تک اپنے محبوب کی پشت دیکھتی رہی جب تک وہ تاریکی کا حصہ نہ بن گیا۔

000

دل میں تو میری پھوپھو کی محبتوں کے دیے روشن کر رکھے تھے لیکن وہ میرے درد سے آگاہ نہیں تھے۔ خود تو وہ محبتیں بانٹتے پھر رہے تھے اور اپنے ولی عہد کو مجھے بھولنے کا فرمان سنایا تھا۔ میں قاصد کی طرف متوجہ ہو گئی جواب روانگی کے لیے پرتول رہا تھا۔

”ایک پل ٹھہرو۔۔۔ ملکہ معظمہ کیسی ہیں؟“

”ملکہ عالیہ۔۔۔ کی حالت بہتر نہیں، بیگم۔“

مجھے جواب کا علم تھا۔ میری روانگی سے پہلے ہی اُن کی حالت اچھی نہیں تھی۔ وہ کھاپی نہیں سکتی تھیں۔ جو کھاتی تھیں فوراً تھوکتے ہو جاتی تھیں۔ انہیں کوئی ایسی بیماری لاحق تھی جس کا پتا مملکت مغلیہ کا کوئی طبیب یا حکیم نہیں چلا سکا تھا۔ ہرگز رنے والا دن انہیں تاریکی کی جانب لیے جا رہا تھا۔

”۔۔۔ اور صاحبِ عالم؟“ میں نے دوسرا سوال کیا۔ میں نے جان بوجھ کر ایسا انداز اختیار کیا کہ قاصد بھی میری دلی بے چینیوں سے آگاہ ہو جائے۔

”وہ بھی اچھے ہیں، بیگم۔“

جملہ ختم ہونے کے بعد بھی میں سانس رو کے منتظر رہی کہ شاید وہ کچھ اور کہے۔ کوئی پیغام دے لیکن ادھر خاموشی ہی طاری رہی۔

”تم واپس کب روانہ ہو گے؟“

”میں جلد واپس نہیں جاؤں گا، بیگم۔“ قاصد نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔ ”ظل الہی نے مجھے آپ کے قافلے کے ہمراہ بنگالہ جانے کا حکم دیا ہے۔“

”میرے پاس پانچ سو گھڑ سوار ہیں، تم کتنے لائے ہو؟“ مجھے اُس کے جواب پر خاصی حیرت ہوئی تھی۔

”دوسو۔“

”کیا سب امدادی ہیں؟“

اس بار اُس نے خاموشی اختیار کی۔ جواب دینے کے بجائے وہ جھک کر کورنش بجالایا اور تاریکی میں غائب ہو گیا۔

”عیسیٰ۔“ اُس کے جانے کے بعد میں نے اپنے ذاتی ملازم کو پکارا۔ ”معلوم کرنے

رہی ہوں، میں چاہتی تھی کہ وہ دوبارہ مجھے بلائے۔

”آغا جی۔“ اُس نے دوبارہ آواز دی۔ ”ظل الہی کا قاصد تم سے ملنا چاہتا ہے۔“

ایک کنیر نے مجھے میری عبا تھمائی، دوسری نے چراغ روشن کر دیا۔ میں فوراً اُٹھ بیٹھی۔ قاصد، خارگاہ کے دروازے پر میرا منتظر تھا۔ عیسیٰ نے چراغ اُپر کیا تاکہ میں قاصد کی صورت دیکھ سکوں۔ وہ مسلح تھا۔ اُس کے زخسار پر ایک گہرے اور لمبے زخم کا نشان تھا۔

”تم کون ہو؟“ میں نے پردے کے عقب میں کھڑے ہو کر پوچھا۔ وہ صرف میری آواز ہی سن سکتا تھا۔

”ظل الہی کا قاصد، بیگم۔“ اُس نے دھیرے سے کہا۔

”لیکن تم نے شاہی قاصدوں کا لباس زیب تن کیوں نہیں کر رکھا؟“

”ظل الہی نہیں چاہتے کہ اُن کے سندیے کا راز افشا ہو۔“ اُس نے ادھر ادھر دیکھتے

ہوئے جواب دیا۔

میں عجیب سی بے چینی محسوس کرنے لگی، اگر وہ شاہی قاصد تھا تو اسے شاہی لباس میں ہونا چاہیے تھا لیکن وہ لباس اور شکل سے کوئی ڈاکو نظر آتا تھا۔

”تم جو کچھ اُٹے ہو، عیسیٰ کو دے دو، وہ مجھ تک پہنچا دے گا۔“

اُس نے کچھ عیسیٰ کو تھمایا اور عیسیٰ نے وہ مجھ تک بڑھا دیا۔ وہ دو گٹھریاں سی تھیں۔ ایک ڈبانا مسطح تھی جو ریشمی کپڑے میں لپیٹی ہوئی تھی۔ جب کہ دوسری سونے کا ایک صندوق تھا جو ایک محلی تھیلے میں رکھا ہوا تھا۔ دونوں پر مہر ازاک (شاہی مہر) ثبت تھی۔

”یہ خانم مہر النساء کے لیے ہیں۔“ قاصد کی آواز میرے کانوں میں سیسہ انڈیل گئی۔ ”یہ اُن کے لیے ظل الہی کے تحائف ہیں اور آپ۔۔۔ بہ نفس نفیس، خانم کے حوالے کیجئے گا۔“

میرامنہ بگڑ گیا، یعنی شہنشاہ ہند کی نظر میں میری وقعت ایک ہرکارے سے زیادہ نہیں تھی۔ میں ولی عہد سے شادی نہیں کر سکتی تھی کیونکہ میری کوئی حیثیت نہ تھی لیکن مجھے شہنشاہ کی محبوبہ تک محبتوں کے یہ تحائف پہنچانے کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ بے اختیار میں نے سوچا کہ اللہ تعالیٰ نے بادشاہوں کو گوشت پوست سے نہیں بلکہ پتھروں سے بنایا ہے۔ شہنشاہ نے اپنے

پورے تیس دن کے سفر کے بعد ہم گور پہنچ گئے۔ احدی گلیوں اور بازاروں میں ادھر ادھر غائب ہو گئے تھے۔ راج کمار کے خیال میں وہ میر بخشی کو اطلاع دینے گئے تھے۔ گور میں مجھے سب سے پہلا شناسا چہرہ منیر کا نظر آیا۔ مجھے دیکھتے ہی آداب بجالایا اور پھر میرا سامان کھولنے میں مصروف ہو گیا۔ ساتھ ساتھ وہ گور کے بارے میں ضروری تفصیلات سے بھی مجھے آگاہ کرتا رہا۔

گور۔۔۔ گنگا کے کنارے سے چودہ کوس کے فاصلے پر ایک مقدس شہر تھا۔ یہاں پیغمبر آخر الزماں کے موئے مبارک محفوظ تھے۔ اُسے مغلیہ سلطنت کی اناج کی کوٹھی بھی کہا جاتا تھا اور یہاں کے رہنے والے خاصے متمول تھے۔

میری پھوپھی کی رہائش گاہ، شہر کی ایک بہت بڑی حویلی تھی جس کے ارد گرد آدموں کا باغ تھا۔ وہ حویلی دیوان بنگال کی حیثیت کے عین مطابق تھی۔

پھوپھو نے ابھی مجھ سے ملنے کے لیے آگئیں۔ میں غسل کر کے تازہ دم ہو چکی تھی۔ پھوپھو کے چہرے پر خوشی ناچ رہی تھی لیکن میں خوب جانتی تھی کہ یہ خوشی، میری آمد کی نہیں تھی بلکہ اُن شاہی تحائف کی تھی جو میرے پاس محفوظ تھے۔ پھوپھو نے اپنی صراحی دار گردن کے گرد سونے کی ایک چابی پہن رکھی تھی۔

لاڈلی بھی انتہائی گرم جوشی سے ملی۔ وہ بڑی ہو گئی تھی اور اُس کے انداز بھی بدل گئے تھے لیکن میرے لیے وہ اب بھی وہی شرمیلی سی بچی تھی۔

پھوپھو خاصی بے چین تھیں۔ میں اُن کی بے چینی سمجھتی تھی لیکن انہوں نے اپنی زبان سے کچھ نہیں کہا۔ جونہی میں نے تحائف اُن کے حوالے کیے۔۔۔ ان کی تمام بے قرار یوں کو قرار آ گیا۔ پھوپھو نے منیر کو وہ تحائف، کمرہ خاص میں رکھنے کا حکم دیا۔ میرا خیال تھا کہ

کی کوشش کرو کہ یہ لوگ ہمارے ساتھ کیوں جانا چاہ رہے ہیں؟“
”مجھے کامیابی کی امید نہیں، آغا جی! احدی ہم جیسے نچلے درجے کے غلاموں کے ساتھ زیادہ بات چیت نہیں کرتے۔“

اور میں واقعی ناکام ہو گیا۔ احدی ہمارے پیچھے ایک کوس کا فاصلہ دے کر چل رہے تھے۔ تمام سپاہ نے اُکوڑوں جیسے کپڑے ہی پہن رکھے تھے۔ انہوں نے میرے قافلے کے سربراہ کو بھی پریشان کر دیا۔ وہ ایک نوجوان اور خوب صورت راجپوت تھا اور جے پور کے رانا کا چھوٹا بیٹا تھا۔ جے پور کے شہزادے۔۔۔ شہنشاہ بابر اور شہنشاہ ہمایوں کے دور سے ہی مغلوں کے وفادار تھے اور اب راج کمار فتح سنگھ کو میرے بنگالہ کے بہ حفاظت سفر کا ذمے دار بنایا گیا تھا۔

راج کمار نے متعدد مرتبہ اس سلسلے میں مجھ سے بات کی اور کسی کارروائی کی اجازت طلب کی لیکن میں نے اُسے ہر بار اس سے اجتناب برتنے کو کہا۔

دوران سفر راج کمار نے مجھے بہت سے مندروں کی سیر بھی کرائی اور ان تاریخی مندروں کے بارے میں بتایا۔ میں نے اپنی زندگی میں ہندو مذہب کو پہلی بار اتنے قریب سے دیکھا تو حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ مجھے ہندوستان میں یہ سب دیکھ کر واقعی حیرت ہوئی تھی۔ اسلام، ہندوستان کے چہرے پر یوں لپٹا ہوا تھا جیسے میرے چہرے سے نقاب! میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ اس نقاب کی آڑ میں ہندو مذہب کے نام پر ایسی حرکتیں بھی ہوتی ہوں گی جن کا اسلام میں خیال بھی حرام ہے۔

ooo

اور بھی کہنا چاہتی تھیں لیکن پھر انہوں نے ارادہ ملتوی کر دیا۔ ”ٹھیک ہے، میں تمہاری مدد کرنے کی کوشش کروں گی۔“

اسی شام پھوپا جان سے ملاقات ہوئی۔ وہ ایک الگ ڈھنگ اور منفرد انداز میں مجھ سے ملے۔

”تم ہمیشہ کے لیے ہمارے پاس رہ جاؤ۔“ انہوں نے پیار سے مجھے اپنے قریب بٹھا لیا۔ ”تم نے آ کر میری مہر کو خوش کر دیا ہے۔“

اب میں انہیں کیا بتاتی کہ پھوپا کی خوشی۔۔۔ میری آمد کی وجہ سے نہیں بلکہ اُن تحائف کی وجہ سے ہے جو ظل الہی نے انتہائی دارانہ طریقے سے انہیں بھجوائے ہیں۔

اگلے ہفتے میرے اعزاز میں قمار گاہ کا اہتمام کیا گیا۔ مجھے علم ہوا کہ یہ اہتمام پھوپا کے بے حد اصرار پر کیا گیا ہے اور جواز یہ پیش کیا گیا کہ ارجمند، شیر کو ہلاک کرنا چاہتی ہے۔

قمار گاہ، شکار کا ایک طریقہ کار تھا جسے سب سے پہلے آقائے تیمور نے متعارف کرایا تھا۔ ہزاروں گھڑ سوار میلوں طویل نصف دائرے کی شکل میں گھڑے ہو جاتے اور پھر بیک وقت ایک دوسرے کی طرف بڑھنا شروع کر دیتے۔ یوں ایک دائرہ بن جاتا۔ اس دائرے میں جنگل کے بے شمار جانور مقید ہو جاتے تھے جن میں شیر، چیتے تیندوے، نیل گائے، لنگور، چیتل اور جانے کیا کیا ہوتا تھا۔ ہر شکاری، اپنے مرتبے کے لحاظ سے اس دائرے میں اترتا اور کسی جانور کو اپنے پسندیدہ ہتھیار سے ہلاک کرتا، جن میں جزائل۔ نیزہ، تلوار اور تیر کمان شامل تھے۔ میں نے سنا تھا کہ مہابلی اکبر ایک بار پیادہ اس دائرے میں اتر پڑے تھے۔ ایک نیل گائے نے ان پر حملہ کر دیا اور وہ کئی روز صاحب فراش رہے تھے۔

میرے لیے جو قمار گاہ ترتیب دی گئی اُس کے لیے پھوپا نے گور کے مشرقی جنگل کا انتخاب کیا تھا۔ اس علاقے میں بے شمار شیر تھے اور اُن کی خواہش تھی کہ صوبے کے دوسرے امیر اور عہدے دار اُن کی محبوب بیوی کی شکار یا نہ صلاحیتوں سے محظوظ ہوں۔

قمار گاہ سے باہر ایک چھوٹی سی جھیل کے کنارے ہمارے رہائشی خیمے نصب کیے گئے۔ پھوپا اور پھوپا کی چھو لدا ریاں برابر برابر تھیں۔ میرا اور لاڈلی کا قیام بھی پھوپا کی چھو لدا ریاں میں ہی تھا۔ شام کے وقت فیصلہ کیا گیا کہ کل قمار گاہ کے آغاز پر صوبے کے دیوان ہونے ل

سونے کے صندوقچے میں ظل الہی کی کوئی نظم ہوگی جو انہوں نے اپنی محبوبہ کے حسن کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے کہی ہوگی کیونکہ وہ ایک بلند پایہ شاعر تھے۔

”آپ مجھے آنے والے تحائف دکھائیں گی نہیں؟“ میں نے پھوپا سے دریافت کیا۔ ”نہیں۔“ پھوپا نے رکھائی سے جواب دیا۔ ”مجھے خوشی ہے کہ تم نے انہیں کھول کر نہیں دیکھا۔“ پھوپا نے آگے بڑھ کر میرے رخسار پُوم لیے۔ ”ان تحائف کا اپنے پھوپا کے سامنے تذکرہ نہ کرنا۔ وہ اسے غلط رنگ دے دیں گے۔“

پھر انہوں نے مجھے اپنے سامنے کھڑا کر کے میرا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ میں پہلے سے کچھ ڈبلی ہو گئی تھی لیکن پھوپا کو یہ نہیں بتا سکتی تھی کہ ایسا کیوں ہوا ہے؟ وہ خود ہی میرے دل کے راز سے واقف تھیں۔

”اب تو تم جوان ہو گئی ہو۔“ پھوپا نے تحسین آمیز نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ ”تم یہاں رہ کر اُسے بھول جاؤ گی۔“

”مشکل ہے، پھوپا۔“ میں نے بدقت تمام کہا۔

”وہ دنیا کا اکلوتا جوان تو نہیں؟“

”لیکن مجھے کسی دوسرے کی ضرورت نہیں۔“

”تم اس لیے اُس سے محبت کرتی ہو کہ وہ ولی عہد سلطنت ہے۔“

”نہیں۔“ میں تڑپ اُٹھی۔ ”خرم اگر ولی عہد کے بجائے ایک فقیر بھی ہوتے تو میں

انہیں اتنی ہی شدتوں کے ساتھ چاہتی۔“

”تمہاری والدہ کا کیا کہنا ہے؟“

”وہی جو کچھ آپ نے کہا ہے۔ ظل الہی نے کہا ہے، اُسے بھول جاؤں۔۔۔۔۔ سب

یہی کہتے ہیں۔“ میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”آپ میری مدد کریں، پھوپا۔“

”کس طرح؟“

”ظل الہی سے بات کریں، انہیں تحریر کریں اور بتائیں کہ ہم ایک۔۔۔۔۔“

”لیکن ظل الہی میری بات کیونکر سنیں گے؟ میں ان کی صرف ایک دوست ہوں، اس

کے علاوہ میری کوئی حیثیت نہیں ہے۔“ پھوپا چند ثانیے کے لیے خاموش ہو گئیں شاید وہ کچھ

زمین میں جذب ہو رہا تھا۔

میں گھٹنوں کے بل اُن کے پاس بیٹھ گئی۔ میں نے پہلے اُن کے موت سے زرد چہرے کو چوما اور پھر بلک بلک کر رونے لگی۔ کسی نے مجھے دلاسا دینے کی کوشش نہ کی۔ حتیٰ کہ پھوپو نے بھی مجھے چپ کرانے کی کوشش نہ کی۔

جب خوب رو چکی تو میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ پھوپا کے ارد گرد پانچ اور لاشیں بھی بکھری ہوئی تھیں۔ کسی کا ایک کٹنا ہوا بازو بھی قریب ہی پڑا تھا۔

”چراغ بلند کرو۔“ میں نے قریب کھڑے ایک سپاہی کو حکم دیا۔ حکم کی تعمیل ہوئی۔ میں نے پانچوں کے چہروں کا جائزہ لیا۔ ایک شخص کا ڈھانٹا کھل گیا تھا اور اُس کے چہرے پر گہرے زخم کا ایک طویل نشان میری نظروں کے سامنے تھا جو ٹھوڑی سے شروع ہو کر کان کی لوتک چلا گیا تھا۔ ظل الہی کا قاصد۔۔۔

میر بخشی نے اپنے دیوان کی موت پر محض کندھے اچکائے اور زیر لب۔ ”ڈاکو تھے۔“ کہتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

پھوپو نے با آواز بلند آدھو بکا شروع کر دی۔ میں اُن کے قریب نہیں گئی۔ مجھے اُن سے کوئی ہمدردی نہیں تھی لیکن میں نے اڈلی کو لپٹا کر بہت تسلیاں دیں کیونکہ وہ اپنے والد سے زیادہ قریب تھی اور انہیں اپنا واحد دوست تصور کرتی تھی۔

میر بخشی نے شہنشاہ ہند کو مطلع کیا کہ بنگال کے صوبے دار شیراقلن کو ڈاکوؤں نے ہلاک کر دیا ہے اور وہ اُن کی تلاش میں زمین و آسمان ایک کر دے گا لیکن کئی دن گزرنے کے باوجود بھی زمین و آسمان الگ الگ ہی رہے۔

ظل الہی کی جانب سے ایک خصوصی ہرکارہ۔۔۔ بنگالہ کے مرحوم صوبے دار کی بیوہ کے لیے شہنشاہ کا تعزیتی پیغام لے کر گور پہنچا۔ ساتھ ہی صوبے دار کی بیوہ کو مہابلی کی ایک بیوہ شہزادی سلمیٰ کی مصاحب مقرر کیے جانے کا شاہی فرمان بھی تھا۔

گور سے روانگی سے قبل پھوپو نے اپنے مرحوم شوہر کا مقبرہ تعمیر کرایا جو اسی جگہ بنایا گیا جہاں سے کچھ فاصلے پر دموڈی جنگل تھا جس نے پھوپا کو نگل لیا تھا۔

گور سے واپس آ کر روانہ ہونے سے قبل۔۔۔ ایک شب میں اڈلی کے ساتھ بیٹھی

حیثیت سے سب سے پہلے پھوپا، شکار کے لیے نکلیں گے۔ پھوپا اُن کے ہمراہ ہوں گی جب کہ میں خصوصی مہمان کی حیثیت سے اُن کے ساتھ جاؤں گی لیکن ہم تینوں اپنے اپنے ہاتھیوں پر سوار ہوں گے۔

رات دیر تک باتیں کرتے رہے اور اُس کے بعد سب لوگ سونے لیٹ گئے۔ رات کے پچھلے پہر کسی شور کے باعث میری آنکھ کھل گئی۔ میں فوراً اٹھ بیٹھی۔ شور بہت سے لوگوں کے چیخنے چلانے اور تلواریں کے آپس میں ٹکرانے کا تھا۔ باہر اندھیرا تھا اس لیے پہلے تو میں نہیں سمجھ سکی کہ آوازیں کہاں سے آرہی ہیں لیکن بعد میں اندازہ ہو گیا کہ یہ سب میرے پھوپا کے خیمے میں ہو رہا ہے۔

پھر ان آوازوں میں عورتوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں بھی شامل ہو گئیں۔ لوگ ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ ہاتھیوں نے جنگھاڑنا شروع کر دیا۔ جزائل کا ایک قاتر بھی ہوا میں اندھیرے میں اٹھ کر خیمے کے در کی طرف بھاگی لیکن کسی نے میرا بازو گرفت میں لے لیا۔

”کہاں جا رہی ہو؟“ مجھے پھوپا کی سرگوشی سنائی دی۔

”یہ دیکھنے کہ باہر کیا ہو رہا ہے؟“

”یہیں ٹھہرو۔“ انہوں نے تیز سرگوشی میں مجھے حکم دیا۔ میں نے غور سے دیکھا، پھوپو کی آنکھوں میں کوئی خوف نہیں تھا۔ وہاں حیرت بھی نہیں تھی بلکہ ایک عجیب سا اطمینان تھا۔ یوں لگتا تھا کہ باہر جو کچھ ہو رہا ہے وہ پہلے سے اُن کے علم میں تھا۔

شور شرابا جس طرح اچانک شروع ہوا تھا اُسی طرح ختم بھی گیا۔ پھوپو نے سکون اور خاموشی ہونے تک میرا بازو نہیں چھوڑا۔ پھر فوراً ہی بہت سے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی جو ہماری قیام گاہ سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ جب آوازیں معدوم ہو گئیں تو ہم باہر نکلے۔

پھوپا کے خیمے کے گرد ایک ہجوم جمع تھا۔ میں لوگوں کو دھکیلتی آگے بڑھی۔ سامنے ہی شہنشاہ جہانگیر کے بہادر جرنیل، بنگالہ کے صوبے دار (دیوان) اور میرے پھوپا۔۔۔ علی قلی خان شیراقلن آڑے ترچھے زمین پر پڑے تھے۔ پہلی ہی نظر میں، میں سمجھ گئی کہ اُن کی روح قفسِ عسری سے پرواز کر چکی ہے۔ ایک تلوار اُن کے پہلو میں پیوست تھی اور خون بہہ کر

1044ھ (1634ء)

ممتاز محل

شہنشاہ ہندوستان ابومظفر شہاب الدین محمد شاہ جہاں نرم گدیوں پر بیٹھا مقبرے کی شیبہ کودیکھ رہا تھا۔ اُس کا نرم و نازک شاہی ہاتھ جو بیروں اور سونے کی انگشتریوں سے لدا ہوا تھا آہستہ آہستہ نمونے کو سہلارہا تھا۔

یہ عمارت اُس پر ایک بوجھ تھی، اُس کے درد کا باعث بن رہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ یہ درد۔۔۔ عمارت کی تعمیر مکمل ہونے تک کسی طور ختم نہیں ہوگا۔

”کوئی نہ کوئی غلطی ضرور ہوئی ہے۔“ شہنشاہ نے دھیرے سے سرگوشی کی۔ ”عیسیٰ! اسماعیل آفندی کو ہمارے حضور پیش کرو۔“

عیسیٰ حکم پاتے ہی کورنش بجالایا اور باہر چلا گیا۔

شاہ جہاں کے ہاتھ بدستور مقبرے کے نمونے کو سہلاتے رہے۔ وہ کسی سقم کی تلاش میں تھا۔ اُس کے وزیر۔۔۔ دیوان، میرسمان اور میربخشی خاموش کھڑے تھے۔ کافی دیر تک انہوں نے شہنشاہ کو مخاطب کرنا مناسب نہ سمجھا۔ بالآخر دیوان نے جرأت کی۔

”غلام، دخل اندازی پر معافی کا خواستگار ہے جہاں پناہ۔“

”کیا کہنا چاہتے ہو؟“ شاہ جہاں نے سر اُٹھایا۔

دیوان نے کچھ کاغذات آگے کر دیے۔ ”جہاں پناہ کی کمال مہربانی سے غلام کچھ معاملات آپ کے علم میں لانے کی جسارت کر رہا ہے۔“ شہنشاہ خاموش رہا تو دیوان نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”اس سال بارشیں بہت تاخیر سے ہوئی ہیں اور کسانوں کی فصلوں کو

تھی کہ مجھے وہ صندوق سامنے رکھا نظر آیا جو ظل الہی نے میری معرفت پھوپھو کو بھجوا دیا تھا۔ میں اُٹھ کر صندوق کی طرف بڑھی۔ لاڈلی اپنے والد کے قتل سے ابھی تک دکھی تھی اس لیے اُس نے مجھ پر کوئی توجہ نہ دی۔ پھوپھو کی خوب صورت گردن سے لٹکنے والی سونے کی چابی اس وقت صندوق کے قفل میں موجود تھی۔ میں نے چابی گھما کر قفل کھولا۔ بہت سے زمردوں کے اوپر میری بند مٹھی جتنا بڑا ہیرا میری نظروں کے سامنے تھا۔ مجھے علم تھا کہ یہ ہیرا شہنشاہ باہر نے شہنشاہ ہمایوں کو دیا تھا۔

میں گہری سانس لے کر پیچھے ہٹ گئی۔ واقعی کسی نے سچ کہا ہے۔۔۔ موت ہمیشہ ان بیش قیمت تحفوں کے ساتھ سفر کرتی ہے۔

ooo

حمیری

سے کانپ اٹھا۔

”جیسا ہم کہیں، ویسا ہی کرو، اس مقبرے کو ہر حال میں دنیا کے دیگر تمام مقبروں اور عمارتوں سے مختلف ہونا چاہیے۔“

”جی جہاں پناہ۔“ اسماعیل نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”جو حکم عالی ہو۔“

”اس کا گنبد جام شیر کی مانند ہونا چاہیے۔“

اسماعیل آفندی کو ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ شاہ کی بات کا مطلب بہ خوبی سمجھ گیا تھا۔ اُس کی نظریں بے اختیار دیوان عام میں موجود خوب صورت باندیوں کی طرف اٹھ گئیں۔ میرے خدا۔۔۔ مقبرے کا گنبد عورت کے۔۔۔ وہ اس سے زیادہ نہیں سوچ سکا۔

”جی ظل الہی۔“ اُس نے بہ مشکل تمام جواب دیا۔

”گنبد کا نچلا حصہ کسی دو شیزہ کی پتلی کمر سے مشابہ ہونا چاہیے۔“ شہنشاہ نے دوسرا حکم سنایا اور ساتھ ہی آفندی کو جانے کا اشارہ کر دیا۔۔۔ وہ جانتا تھا کہ جیسا اُس نے کہا ہے ویسا ہی ہوگا۔

اسماعیل آفندی نے دوبارہ شاہی کنیزوں کو نظروں میں تو لا اور آداب بجالا کر واپسی کے لیے مُڑ گیا۔

ooo

خاصا نقصان پہنچا ہے جہاں پناہ! میں چاہتا تھا کہ اُن کے محاصل معاف کر دیے جائیں جس طرح مہابلی نے کیے تھے لیکن یہ ممکن نہیں، خزانہ عامرہ (دارالمال) ملکہ عالیہ کے مقبرے کی تعمیر پر پہلے ہی بہت اخراجات کر رہا ہے اب جس طرح شاہ عالی مقام حکم فرمائیں۔“

”یہ معاملات بعد میں ہمارے حضور پیش کیے جائیں۔“

”جہاں پناہ۔“ دیوان کے پیچھے ہٹ جانے پر میر بخشی آگے بڑھا ”دکن کے شہزادے غداری پر آمادہ ہیں۔ ان کی سرکوبی کے لیے مغل سپاہ کا بھیجا جانا نہایت ضروری ہو گیا ہے، اس لشکر کی سربراہی کون کرے گا؟“

”وہ ہمیشہ سے بے وقوف رہے ہیں۔“ شاہ جہاں نے تبصرہ کیا۔ ”ہمیں وہاں سے کیا ملا، مہابلی اور ہمارے والد نے بھی وہاں لشکر کشی کی لیکن کیا ملا؟ یہ مسئلہ بھی بعد میں پیش کیا جائے۔“

”جو حکم جہاں پناہ۔“

”تخلیہ۔“

وزراء نے جھک کر تعظیم دی اور باہر چلے گئے۔ شہنشاہ اپنی محبوب ملکہ کے مقبرے کے نمونے کے ہمراہ تنہا رہ گیا۔

تھوڑی دیر بعد عیسیٰ نے مقبروں کے ماہر نقشہ جات اسماعیل آفندی کے آنے کی اطلاع دی۔ شاہ نے فوراً اُسے طلب کر لیا۔ اسماعیل، کورنش ادا کر کے ایک جانب موڑ ب کھڑا ہو گیا۔

”کیا یہ بے عیب نہیں؟“ شہنشاہ کا اشارہ مقبرے کے نمونے کی طرف تھا۔

”جی جہاں پناہ۔“ اسماعیل آفندی کا جواب ذومعنی تھا۔ اس سے دونوں ہی مطلب

اخذ کیے جاسکتے تھے۔

”یہ بالکل مسطح ہے، حضرت ہمایوں کے مقبرے کی طرح، لیکن ہم ایسا نہیں چاہتے،

اسے ایسا بناؤ کہ دنیا میں اس جیسی کوئی عمارت نہ ہو۔“

”غلام معافی کا خواستگار ہے جہاں پناہ، لیکن تمام مقبرے ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔“

شہنشاہ کی آنکھوں میں غصے کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ اسماعیل آفندی، جی جان

بوڑھیوں نے لڑکی کو گلے لگا کر اُسے خوش آمدید کہا۔

لڑکی کی سواری کے پیچھے ذور و زور تک تحائف کا کارواں تھا جو لڑکی کے چچا۔۔۔ شہنشاہ فارس نے عظیم مغل بادشاہ کے لیے بھجوائے تھے۔

پچاس عربی النسل گھوڑے اور گھوڑیاں، چار سو غلام، سونا، چاندی، قیمتی زرد جواہر اور ان سب سے بڑھ کر تاجور ہند کے لیے دوستی اور خیر سگالی کے جذبات۔۔۔ جو ایک لڑکی کی شکل میں تھے۔

وہ کئی ماہ کے سفر کے بعد مغل راجدھانی پٹنچلی تھی۔ قندھار تک وہ ایرانی سپاہ کی حفاظت میں آئی تھی اور پھر دونوں مملکتوں کی سرحد پر اُسے مغل سپاہ نے اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ مغلوں اور ایرانیوں کی دوستی پرانی تھی۔ بہت سال قبل جب حضرت ہمایوں کو شیر شاہ سوری کے ہاتھوں ہزیمت اٹھانی پڑی تو انہوں نے شہنشاہ فارس کے پاس جا کر پناہ لی تھی۔ حضرت ہمایوں بہت سال شاہ ایران کے مہمان رہے تھے اور اس کے بعد ایرانی سپاہ کی مدد سے ہی حضرت ہمایوں نے دہلی کے تخت کو دوبارہ حاصل کیا تھا۔ اس لشکر کشی میں شاہ ایران کا چھوٹا بیٹا بھی اُن کے ہمراہ تھا لیکن وہ دہلی پہنچنے سے پہلے ہی انتقال کر گیا تھا۔

شاہ ایران کی بھتیجی کی آگرہ آمد کا مطلب، دوستی کے ایک نئے عہد کا آغاز تھا۔ شہزادی ان تقریباً میری ہم عمر تھی۔ اُس کا قد مجھ سے قدرے کم تھا۔ پاکی سے اترتے ہی بے چاری کو بہت سی خواتین کو آداب بجالانے پڑے جس سے وہ خاصی بوکھلا گئی تھی۔ اُس کے عقب میں ایک بھاری بھر کم خاتون موجود تھیں۔۔۔ وہ اُس کی والدہ تھیں۔ پھر بہت سی مصاحب خواتین تھیں۔

دلہن کا استقبال کرنے والوں میں پھوپھو مہر النساء بھی موجود تھیں۔ وہ ہنوز شہزادی سلطی کی مصاحب تھیں اور یوں ظاہر کر رہی تھیں جیسے ملکہ ہند۔۔۔ وہی ہوں اور اس وقت اپنے بیٹے کی دلہن کا استقبال کر رہی ہوں۔ کوئی اندازہ بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ کس حد تک شہنشاہ کو مسخر کر چکی تھیں لیکن کہا جاتا تھا کہ ہندوستان کا بادشاہ اُن کے پیار میں پاگل ہے۔

اب شہنشاہ کی راہوں میں صرف اور صرف پھوپھو کا وجود ہی تھا۔ ملکہ عالیہ مہارانی مان متی اپنی شدید بیماری سے کچھ عرصے کے لیے صحت یاب ہوئی تھیں لیکن انتہائی پُر اسرار انداز

1020ھ (1610ء)

ارجمند بانو

”وہ آ رہی ہے۔ وہ آ رہی ہے۔“

حرم کی خواتین، محل کی بالکونیوں سے لپٹی شور مچا رہی تھیں۔ اُن کی آوازوں میں لحظہ بہ لحظہ خوشی کا عنصر غالب آتا جا رہا تھا اور میرادل ڈوبتا جا رہا تھا۔ میں اُن کے ساتھ شامل نہیں تھی بلکہ کمرے میں تنہا بیٹھی جتنا کے نیلگوں پانی کو تک رہی تھی۔

دو سال خاموشی کی اذیت ناک کیوں کا شکار ہو گئے تھے، میں جہاں سے چلی تھی وہیں کھڑی تھی اور اب تو میری زندگی پر مایوسیوں کے گہرے بادل گھر آئے تھے۔ جی چاہا کہ میں روؤں خوب روؤں۔۔۔ اتار دوں کہ پوری مغلیہ قلمرو کو خس و خاشاک کی طرح آنسوؤں کے سیلاب میں بہا دوں لیکن یہ آنسو میرے غموں کا مداوا نہیں ہو سکتے تھے بلکہ مجھے دُنیا میں رسوا کر سکتے تھے۔

میں جی کڑا کر کے اُنھی اور بالکونی میں آ گئی۔

”کیا ہم یہ نہیں دیکھیں گے کہ صاحبِ عالم کی دلہن کیسی لگ رہی ہے؟“

یہ عیسیٰ کی آواز تھی جو میرے پیچھے پیچھے بالکونی میں آ گیا تھا۔ وہاں موجود عورتوں نے بھی پلٹ کر پہلے میری اور پھر عیسیٰ کی طرف دیکھا۔ اُن کی آنکھوں میں ترحم کے دیے جھللا اٹھے تھے، لیکن مجھے ان کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے سر جھٹکا اور سامنے متوجہ ہو گئی۔

رسالہ (شہسواروں کا دستہ) ہمارے سامنے آ کر رُکا تھا اور اب بہت سی کنیریں ایک لڑکی کو پاکی میں سے اترنے میں مدد دے رہی تھیں۔ دروازے پر موجود اور منتظر بڑی

شہاب الدین

ہنگامہ خیزیوں سے مجھے خبر ہوئی تھی کہ میری ہونے والی دلہن آنہی ہے۔ اعتماد الدولہ نے آگرہ کے مضافات میں اُس کا استقبال کیا تھا اور اُس کا جلوس نے کر قلعے تک پہنچا تھا۔
 ”وہ کیسی ہے؟“ میں نے علامہ سعد اللہ خان سے دریافت کیا۔
 علامہ میرے سامنے مودب کھڑے تھے لیکن ان کے چہرے کے تاثرات بتاتے تھے کہ محل کو وہ مقبرہ تصور کرتے ہیں۔

”میں کیسے بتا سکتا ہوں صاحب عالم؟ وہ چھوٹے قد لیکن چہرے اور خوب صورت بدن کی مالک ہے، میں نے شہزادی کے صرف ملائم اور نرم و نازک ہاتھ دیکھے تھے۔ باقی ایک اسرار ہے جس پر سے صرف آپ پردہ اٹھائیں گے۔“
 ”تب تک بہت تاخیر ہو چکی ہوگی۔“ میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا تو علامہ نے کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں میری طرف دیکھا لیکن مجھے انہیں کچھ سمجھانے کی ضرورت بھی نہ تھی۔

”تخلیہ۔“ دفعتاً میں نے ہاتھ اٹھا کر علامہ کو جانے کا اشارہ کیا تو وہ حیران رہ گئے مگر انہیں کچھ پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ انہوں نے مجھے فرشی سلام کیا اور باہر چلے گئے۔

میں اٹھ کر بالکونی میں آکھڑا ہوا۔ حرم میرے سامنے تھا۔ یہیں کہیں ارجمند بھی تھی۔۔۔ میری ارجمند۔۔۔ میں کچھ اور آگے ہو کر کھڑا ہو گیا۔ جی میں خواہش تھی کہ کاش وہ مجھے دیکھ لے اور میں اُسے۔۔۔ میں نے وہ اشعار نکال کر ہاتھ میں تھام لیے جو میں نے اپنی محبوب کے لیے کہے تھے۔ میں اپنے والد کی طرح شاعر نہیں تھا بس میں نے اپنی محبوب کے

میں دوبارہ بیمار پڑ گئیں اور انہوں نے خون تھوکتنا شروع کر دیا۔ نئی بیماری نے صرف ایک ہی ہفتے میں ملکہ ہند کی جان لے لی۔

ظل الہی نے کشور ہند میں ایک ماہ کے سوگ کا اعلان کیا جس کی ہر ایک نے دل و جان سے پاسداری کی لیکن دے دے الفاظ اور گھٹی گھٹی سرگوشیاں میں نے بھی سنیں کہ ملکہ کو زہر دیا گیا ہے۔
 پھوپو، دلہن کو چھوڑ کر میری جانب بڑے راور مجھے شہزادی کی جانب لے چلیں۔ وہ جانتی تھیں کہ اُسے خوش آمدید کہتے ہوئے مجھے کس قدر دکھ ہوگا لیکن آداب شاہی، زنجیروں کی مانند ہمارے جسموں سے لپٹے ہوئے تھے اور پھر میں بہ طور خاص اپنا دل مضبوط کر کے گئی تھی۔

میں نے دوسری عورتوں کی تیز نگاہوں کو اپنے چہرے پر چبھتا محسوس کیا لیکن میں اُن سے بے نیاز رہی۔ خود پر قابو پانے کے باوجود میرا جی چاہا کہ میں آنے والی کا منہ نوچ لوں لیکن اس کے برعکس جب وہ میرے سامنے آ کر ٹھہری تو میں نے مسکرا کر اور جھک کر اُسے آداب کہا۔
 ”میری بھتیجی، بیگم ارجمند بانو۔“ پھوپو نے دلہن سے میرا تعارف کرایا۔

”میں نے تمہارے حسن اور خوب صورتی کے بارے میں بہت کچھ سُن رکھا ہے۔“
 شہزادی نے مسکرا کر جواب دیا۔

”شہزادی حضور کی ذرہ نوازی ہے۔“
 ایک لمحے کے لیے ہماری نگاہیں ملیں۔ میں نے اُس کی آنکھوں میں غمگین مسکراہٹیں دیکھیں، میرے لیے نہیں، اپنے لیے، اُس کی آنکھیں خوب صورت، بڑی بڑی اور بھوری رنگت کی تھیں۔ وہ اس وقت یوں تھیں جیسے چیتل خطرہ دیکھ کر، کر لیتا ہے۔ وہ بھلا مجھ سے کس لیے خوف زدہ تھی؟ یہ میں نہیں جانتی تھی۔ شہزادہ خرم کی شادی اُس سے ہونا قرار پائی تھی مجھ سے نہیں یا پھر ممکن ہے وہ یہ جانتی ہو کہ اُس کا ہونے والا شوہرا اب بھی مجھے چاہتا ہے۔

”میں شہزادی حضور کی آئندہ زندگی کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کرتی ہوں۔“
 اُس نے دوبارہ پلکیں اٹھا کر مجھے دیکھا لیکن کچھ کہے بغیر آگے بڑھ گئی۔ جلد ہی وہ عورتوں کے جوم میں کھو گئی۔ اُسے آرام گاہ میں پہنچایا جانا تھا کیونکہ تین دن بعد مغل ولی عہد سے اُس کی شادی ہونے والی تھی۔

مہر النساء اُس کے بس کی بات نہ تھی۔ میری طرح شاہ بھی محبت میں گرفتار تھا۔ شاید وہ اُن کی ضرورت رہی ہو۔ میں اکثر خود کو طفل تسلیاں دیا کرتا تھا لیکن کبھی انہیں کچھ کہنے کی جرأت نہ کی تھی کیونکہ میں اپنے بھائی خسرو کی طرح اُن کی نظروں میں غدار یا نا فرمان نہیں بننا چاہتا تھا۔

خسرو کی یاد آتے ہی دل میں ہوک سی اٹھی لیکن بھلا میں کیا کر سکتا تھا۔ اُس نے لالچ میں خود ہی اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری تھی۔ یہ پاگل پن اُس کے ذہن میں مہابلی اکبر اعظم نے پیدا کیا تھا۔ مہابلی نے اُسے ولی عہد چنا تھا لیکن بستر مرگ پر انہوں نے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر دی تھی۔۔۔ اس کے باوجود خسرو اپنی حیثیت پر نظر ثانی نہ کر سکا۔

مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ خسرو۔۔۔ پدر بزرگوار کی تاج پوشی سے قطعی خوش نہ تھا۔ وہ سازشوں میں مصروف رہا۔ ظل الہی ان باتوں سے آگاہ تھے انہوں نے اُسے عدالت میں لا کھڑا کیا لیکن وہ فرار ہو کر باغی بن بیٹھا۔ باقی دو سازشیوں کو جلاد کے حوالے کر دیا گیا۔ باپ بیٹے کے درمیان خلج بڑھتی گئی حتیٰ کہ خسرو نے ظل الہی کو دورانِ شکار قتل کرنے کا منصوبہ بنا لیا۔

منصوبہ یہ تھا کہ ظل الہی کو قمار گاہ میں دورانِ شکار۔۔۔ جانوروں اور دوسرے آدمیوں کے ساتھ قتل کر دیا جائے۔ جانوروں کے دھاڑنے اور شور کی آوازوں میں یہ عمل بخوبی پایہ تکمیل کو پہنچ سکتا تھا، لیکن دیوانِ قصی الملک (سلطنت مغلیہ کا انجیلی جنس ڈپارٹمنٹ) کو اس سازش کی بھنک پڑ گئی۔ ظل الہی تک پہنچنے سے قبل ہی ان سرگوشیوں کا علم مجھ کو بھی ہو گیا کیونکہ خسرو کی کامیابی کی صورت میں میری زندگی کے امکانات بھی صفر تھے۔ اب بھلا کوئی اس طرح کے بھائی کو زندہ رہنے دیتا ہے؟

میں اس سلسلے میں ظل الہی کو کوئی الزام نہیں دیتا لیکن مجھے دکھ تھا کیونکہ بہر حال خسرو میرا بھائی تھا۔ وہ میرے بچپن کا بہترین ساتھی تھا۔ اس کے باوجود کہ ہم نے ایک ماں کے بطن سے جنم نہیں لیا تھا، ہماری دوستی شہزادوں میں ایک مثال تھی۔ تمام ہنر ہم نے اکٹھے ہی سیکھے تھے۔ میرا اپنا ایک چھوٹا بھائی تھا، پرویز، لیکن ہم اتنا قریب نہیں تھے۔ ایک اور بھائی خرم تھا جس کی ماں ایک پنجابی کنیز تھی لیکن باقیوں میں سے کوئی تخت کے لیے پاگل نہ تھا۔ ظل الہی نے شکار کی صبح تک کوئی کارروائی نہ کی اور پھر انہوں نے خسرو کو ایک پکے

لیے چاہتوں کا اظہار کیا تھا۔ اُجڑے ہر مہر کا تازہ جھونکا۔۔۔ اپنے ساتھ گلابوں کی مہک کے ساتھ۔۔۔ تیرے بدن کی خوشبو لاتا ہے۔۔۔

تیرے قدم دھرتی پر پڑتے ہیں تو وہ پھول اُگلنے لگتی ہے۔۔۔ تورات کی تاریکی میں باہر نکل آئے تو کل عالم تیرے چہرے کی چاندنی سے روشن ہو جاتا ہے۔۔۔

لیکن میری محبوب!

تو مجھ سے کتنی دور ہے۔

تیرے بدن کی خوشبو

تیرے چہرے کی چاندنی

اور تیرا پیروں کا سا پیکر، میری دسترس سے بہت دور ہے

لیکن میری محبوب!

پھول کی خوشبو بھی اک روز ختم ہو جاتی ہے اور تم!

خوشبو کے مرنے سے قبل مجھ سے آن ملنا!

اے میری محبوب! مجھ سے آن ملنا!

میں اپنے یہ جذبات اُس تک پہنچانا چاہتا تھا لیکن کس طرح؟ ابھی میں کسی مناسب طریقے پر غور کر رہا تھا کہ وزیر کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

”غلام، نخل ہونے پر معذرت خواہ ہے صاحبِ عالم۔“ میں نے اشعار فوراً اپنے لباس میں چھپا لیے۔ ”ظل الہی آپ کو یاد فرما رہے ہیں۔“ میں فوراً روانہ ہو گیا۔

اُن دنوں میں والدِ بزرگوار میں بہت سی تبدیلیاں دیکھ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اُن کی شان و شوکت مدھم پڑ گئی ہو یا اُن کے لباس میں جڑے ہوئے بیروں نے چمکنا چھوڑ دیا ہو۔ کوئی غیر ہوتا تو اس دگرگوں کیفیت کا ضرور مضحکہ اڑاتا لیکن میں اس کی وجہ جانتا تھا۔ عظیم مغل بادشاہ، روئے زمین پر حکومت کر سکتا تھا۔ سب کو اپنے احکامات کا پابند بنا سکتا تھا لیکن خانم

مہابلی نے اپنا ولی عہد نامزد کیا تھا لیکن کیا مہابلی نے تمہیں اپنے ہی باپ کو قتل کرنے کے لیے بھی کہا تھا؟ یقیناً نہیں۔ یہ کبھی مہابلی کا طریقہ نہیں رہا۔ ہم نے اس تخت پر غاصبانہ قبضہ نہیں کیا بلکہ مہابلی کے جائز وارث کی حیثیت سے ہم نے تخت پر بیٹھنا قبول کیا تھا۔ امراء سے دریافت کرو کہ کیا واقعی ایسا نہیں ہے؟“

میں نے بہت سے امیروں کو پہلو بدلتے دیکھا لیکن خسرو سمیت کسی کی زبان کو جنبش نہیں ہوئی۔

”ہمیں مہابلی نے اپنے اجداد کا عمامہ اور تلوار اپنے ہاتھوں سے دی تھی۔“ ظل الہی کی آواز قدرے توقف کے بعد دوبارہ ابھری۔ ”تم خود ہی اپنے اجداد کی روایتوں اور احکامات سے بغاوت کرنے والے کی سزا تجویز کرو۔“

”مجھے موت کی سزا دے دی جائے۔“ خسرو کی آواز ابھری اور پورا دربار انگشت بندھا رہ گیا ہم میں سے کسی کو بھی اس حماقت کی توقع نہیں تھی۔

”تخت یا تختہ۔“ ظل الہی نے کراہتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”شاہی قبایا کفن، اب جب کہ تم شاہی قبائلوں کے ہو کفن کے خواہش مند ہو۔“ انہوں نے اپنا سر نفی میں ہلایا۔ ”لیکن ہم یہ کس طرح کر سکتے ہیں، تم ہمارے بیٹے ہو، حضرت بابر نے اپنے بیٹے کے بدلے، اپنے لیے موت مانگی تھی اور ہم اپنے بیٹے کو اپنی زبان سے موت کی سزادیں نہیں، یہ ناممکن ہے، لیکن ہم تمہاری کوڑے برساتی زبان اور شعلے انگلی آ نکھوں کا سامنا بھی نہیں کر سکتے، ہم نہیں چاہتے کہ تمہاری آنکھیں ہمیشہ شاہی دستار اور حضرت بابر کی تلوار کو حریصانہ انداز میں دیکھتی رہیں، اس لیے ہم نے فیصلہ کیا ہے۔۔۔“ شہنشاہ کی آواز لڑکھڑائی۔۔۔ ”اس لیے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ تم مرتے دم تک زنجیر سے بندھے رہو گے۔ اس کے علاوہ تمہیں، تمہارے ہی حسد سے بچانے کی خاطر، اندھا کیے جانے کے احکامات صادر کیے جاتے ہیں۔“

”رحم ظل الہی، رحم۔“ شہنشاہ کے خاموش ہوتے ہی دربار، امراء کی آوازوں سے گونج اٹھا۔

”آج کوئی ہمارے رحم اور دریادلی کو آواز نہ دے۔“ ظل الہی کی رندھی ہوئی آواز

ابھری۔

ہوئے پھل کی طرح نوج لیا۔ بہت سے امراء خسرو کے خاموش ہمدرد تھے۔ ظل الہی اس بارے میں جانتے تھے لیکن انہوں نے انہیں کچھ نہیں کہا اور یوں خسرو اپنی غداری کی سزا پانے کو تنہا رہ گیا۔

ایک روز سورج طلوع ہونے کے ایک ساعت بعد ہم سب کو دیوان عام میں طلب کیا گیا۔ میں اور خسرو، تخت کے عین سامنے طلائی زنجیر کے اندر کھڑے کیے گئے۔ ہمارے عقب میں، چاندی کی زنجیر کے احاطے میں، وزراء اور دیگر اعلیٰ عمال کھڑے تھے۔ اُن کے ساتھ گرز بردار تھا جس کے ہاتھ میں طلائی عصائے حکومت تھا۔ اس کے پیچھے دوسرے امراء اور چاندی کا عصائے حکومت تھا۔ دوسرا گرز بردار موجود تھا۔

میں نے کوشش کی تھی کہ خسرو سے فاصلہ دے کر کھڑا ہوں۔ اُس سے میں نے بات بھی کوئی نہ کی۔ وہ شروع شروع میں باتیں کرتا رہا اور مذاق اڑاتا رہا لیکن جونہی سیاہ ٹوپیاں باندھے جلاد اندر داخل ہو کر تخت کے قریب جا کھڑے ہوئے اُس کے ہونٹوں پر چپ کی مہر ثبت ہو گئی۔

تھوڑی ہی دیر بعد دربار۔۔۔ دروازے پر موجود گرز بردار کی گرج دار آواز سے گونج اٹھا۔

”جنبش مکن، ہوشیار باش، خسرو خسرواں، شاہ دارالانشاں، مالک سلطنت ہندوستان، شہنشاہ نورالدین محمد جہانگیر جلوه افروز ہوتے ہیں۔“

والد بزرگوار کے اندر داخل ہوتے ہی سب کے سر تعظیم کے لیے جھک گئے اور اُس وقت تک جھکے رہے جب تک بارگاہ شاہی سے سر اٹھانے کی اجازت صادر نہ ہو گئی۔ تخت کو احدی دستوں نے اپنی حفاظت میں لے لیا اور اب مجھ سمیت روئے زمین کا کوئی شخص شاہ کی اجازت کے بغیر تخت کی سیڑھیوں پر قدم نہیں رکھ سکتا تھا۔

ظل الہی کے اشارے پر طلائی گرز بردار آگے بڑھا اور اُس نے طلائی عصا سے خسرو کو چھوا۔ خسرو مضبوط قدموں سے آگے بڑھا۔ وہ ظل الہی کو یک ٹک گھور رہا تھا۔

”خسرو۔۔۔“ ظل الہی کی پاٹ دار آواز دربار میں گونجی۔ شہنشاہ کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا۔

”۔۔۔ خسرو تم ہی بتاؤ کہ ہم تمہارے ساتھ کیا سلوک کریں، تمہارا اصرار رہا ہے کہ تمہیں

”تم ہم سے کیا چاہتے ہو؟“ جونہی میں اندر داخل ہوا، ظل الہی نے سوال کیا۔ اُس وقت کمرہ خاص میں اور کوئی موجود نہیں تھا۔ ”ویسے ہر کوئی ہم سے کچھ نہ کچھ چاہتا ہے لیکن جو ہم چاہتے ہیں وہ ہمیں کوئی نہیں دے سکتا۔“

”اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں ظل الہی۔“ میں نے یہ بات صرف کہنے کو کہی تھی ورنہ مجھے علم نہیں تھا کہ اُن کے پہلے والے جملے کا کیا مطلب تھا۔ میں نے سوچا، شاید آگے چل کر وہ اس کی وضاحت کریں لیکن انہوں نے غالباً موضوع ہی تبدیل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

”تم یقیناً اپنی دلہن کو دیکھنے کے مشتاق ہو گے! کیا تم نے وہ گھوڑے دیکھے جو اُس کے ساتھ آئے ہیں؟ خوب صورت۔۔۔ لیکن ایک بات ہمارے ذہن میں چھ رہی ہے خرم، شہنشاہ نے تمہارے لیے اپنی بیٹی کے بجائے۔۔۔ بھتیجی کیوں بھجوائی ہے؟“

”یہی بات میں آپ سے کرنا چاہتا تھا ظل الہی۔“

”بولو۔“

”کیا ہم شاہ ایران کو اپنی توہین کرنے کی اجازت دے سکتے ہیں ظل الہی؟ میں شاہ جہاں ہوں، عظیم سلطنت مغلیہ کا ولی عہد۔۔۔ جو کسی طرح بھی سلطنت فارس سے چھوٹی نہیں۔ شاہ ایران کو میرے لیے اپنی بیٹی کا رشتہ بھیجنا چاہیے تھا۔۔۔ اپنی حقیر بھتیجی کا نہیں۔۔۔ بھتیجی کی اُس کی نظر میں کیا اہمیت ہو سکتی ہے۔ مہابلی نے راجپوت راناؤں کی بیٹیوں سے شادیاں کی تھیں اُن کی بھتیجیوں، بھانجیوں یا رشتے کی بہنوں سے نہیں۔“

”تمہارا کہنا درست ہے خرم، لیکن اب تاخیر ہو چکی ہے۔ ہم نے اُسے تمہاری دلہن کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔ اُسے واپس بھیجنے کا مطلب کھلی جنگ ہو گا۔“ ظل الہی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل گئی۔ ”ہم جانتے ہیں کہ تمہارا دل ارجمند کے لیے دھڑکتا ہے، اُسے

دربار پر موت کی سی خاموشی چھا گئی۔ اب بولنے کی گنجائش نہ تھی۔ میں نے خسرو کی جانب دیکھا اُس کا چہرہ تاریک ہو گیا تھا۔ جب کہ ہماری حالت بھی اُس سے مختلف نہ تھی۔

شاہی فرمان نویس نے فرمان لکھ کر ظل الہی کے سامنے رکھ دیا اور انہوں نے اُس پر مہرازاک ثبت کر دی۔ اب روئے زمین کی کوئی طاقت خسرو کو بچا نہیں سکتی تھی۔

”حکم کی تعمیل ہو۔“

جلاد، خسرو کی طرف بڑھے اور انہوں نے پکڑ کر اُسے زمین پر لٹا دیا۔ دو نے اُس کی ٹانگوں اور بازوؤں کو پکڑا۔۔۔ تیسرا اُس کے سینے پر چڑھ گیا جب کہ ایک نے اُس کے سر کو قابو میں کر لیا۔ لوہے کی سلاخیاں گرم کرنے کا انتظام کیا گیا اور جب وہ دھک کر سُرخ ہو گئیں تو ایک جلاد نے خسرو کی دائیں آنکھ کھولی اور دوسرے نے سلاخی اُس میں پھیر دی۔ خسرو کی کرناک چیخ نے زمین و آسمان کے دل ہلا دیے۔ اُس کا منہ کھل کر بند ہونا بھول گیا۔ فوراً ہی دوسری آنکھ کھول کر اُس میں بھی سلاخی پھیر دی گئی۔ اُس کی آنکھوں سے خون اور آنسوؤں کا مرکب بہ کر زمین میں جذب ہونے لگا۔ خسرو کی چیخیں بلند سے بلند تر ہوتی گئیں۔ جلاد اُسے چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور خسرو نے اپنے دونوں ہاتھ، آنکھوں۔۔۔ نہیں سوراخوں پر رکھ کر رونا شروع کر دیا۔

فوراً ہی شاہی طبیب آگے بڑھے اور انہوں نے خسرو کی مرہم پٹی شروع کر دی۔ جونہی انہوں نے کام شروع کیا، شہنشاہ نے تخت چھوڑ دیا۔ شاید اُن کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ اُس کے بعد بھی وہ جب کبھی محل کی غلام گردشوں میں خسرو کو سر ٹکراتے دیکھتے تو اُس کے محافظ کو اُسے دُور لے جانے کی ہدایت کر دیتے تھے۔

○○○

اپنی دوسری بیوی بنا لو، ہم تمہیں اس کی اجازت دے چکے ہیں۔“

”گستاخی معاف، ظل الہی، لیکن میں اُسے دوسری بیوی نہیں بنانا چاہتا، میں اس دوسری لڑکی کے مقابلے میں اُسے کمتر کیوں بناؤں؟ ارجمند ہی میرے بیٹوں کی ماں بنے گی۔“

”تم احمقانہ باتیں کر رہے ہو خرم، ہم تمہیں شادی کا حکم دے رہے ہیں اور تم بحث پر آمادہ ہو، پاگل پن نے تمہارے ذہن کو پرانگندہ کر دیا ہے۔ یاد رکھو کہ محبتیں وقتی جذبہ ہوتی ہیں، انہیں بھول جاؤ، تم ایک عام آدمی نہیں ہو۔“

”کیا صرف میں ظل الہی۔۔۔“

”کیا؟“ ظل الہی کی گرج دار آواز نے میرا دل دہلا دیا۔

”میں نے ظل الہی سے درخواست۔۔۔“

”ہم سن چکے ہیں۔“ انہوں نے میرا جملہ کاٹ دیا۔ ”ہم تمہیں پہلے ہی اپنا ولی عہد مقرر کر چکے ہیں۔ ہمارے بعد تخت ہند تمہاری ملکیت ہوگا۔ اگر ہم مہر النساء سے شادی کریں گے تو وہ امور سلطنت میں مداخلت کی بجائے ہوگی۔ تم اپنے کام سے کام رکھو۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ شہزادی گلبدن ایک خوب صورت، نازک اور دلربا لڑکی ہے۔ ایک عورت جسمانی لحاظ سے دوسری سے مختلف نہیں ہوتی۔ اُس سے شادی کرو اُس سے محبت کرو اور لطف اٹھاؤ۔“

ظل الہی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اب تم جاسکتے ہو۔“

میں نے انہیں تعظیم دی اور اُلٹے قدموں لوٹ آیا۔

ooo

عیسیٰ

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ کیا میں قابلِ اعتماد ہوں؟ ہم ملازم اپنے مالکوں کے ہاتھوں اتنے مجبور تھے کہ کبھی کبھی لفظ اعتماد پر بے اختیار ہنسی آ جاتی تھی۔

مجھے وہ رات آج بھی یاد ہے جب تھکا ہارا میں اپنے چھوٹے سے حجرے میں سو رہا تھا کہ کسی سائے نے مجھے آ کر جگا دیا۔ میں اُسے سایہ ہی کہوں گا کیونکہ وہ سر تا پا چادر میں لپٹا ہوا تھا۔ آنکھ کھلتے ہی میری حسیات بیدار ہوئیں تو نتھنوں میں عطر کی خوشبودر آئی۔ مجھے جگانے والی کوئی عورت تھی۔۔۔ لیکن اُس کا چہرہ چھپا ہوا تھا۔

”تم عیسیٰ ہو؟“ وہ گنگنائی ہوئی آواز میں بولی۔

”ہاں۔“

”صاحبِ عالم نے تمہیں یاد فرمایا ہے۔“ جملہ ختم ہوتے ہی۔۔۔ وہ جانے کے لیے پلٹ گئی۔

میں کچھ دیر تو ہکا بکا کھڑا رہا لیکن پھر سب کچھ میری سمجھ میں آ گیا۔ میں فوراً صاحبِ عالم کے محل کی جانب بھاگا۔ میرے پہنچتے ہی دروازہ کھل گیا۔ یوں جیسے کوئی پہلے سے میرا منتظر تھا۔ ایک عورت باہر نکلی۔ اُس نے میرا چہرہ دیکھا اور اندر کھینچ لیا۔ کوئی چراغ روشن نہیں تھا۔ وہ مجھے تاریکی میں ہی آگے لے چلی۔ اُس کا انداز بتاتا تھا کہ وہ ان راستوں سے بہ خوبی واقف ہے۔

دو باغوں سے گزار کر اُس نے مجھے تیسرے باغ میں پہنچا دیا جہاں ولی عہد سلطنت شہزادہ شہاب الدین محمد خرم ایک دیوان پر بیٹھے جمنائے لہروں کا نظارہ کر رہے تھے۔ آہٹ پر

”آہ، بس یہی کافی ہے، افسردہ، ہماری طرح، افسردگی تو سورج اور چاند کو بھی ماند کر دیتی ہے، تم بتاؤ کیا تمہاری آقا زادی روئی بھی؟“

”جی، صاحبِ عالم۔“

صاحبِ عالم کو چپ لگ گئی۔ وہ کافی دیر کھوئے کھوئے بیٹھے رہے۔ پھر انہوں نے دختر رز کا جام اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔

”تم ہم سے کہیں زیادہ خوش قسمت ہو عیسیٰ کہ اپنی آقا زادی کو روز دیکھتے ہو۔“ صاحبِ عالم نے جام نیچے رکھ کر دوبارہ مجھے مخاطب کیا۔ ”آقا زادی سے کہنا کہ وہ اداس نہ رہا کرے، وہ رونے کے لیے پیدا نہیں ہوئی۔ اُسے بتانا کہ وہ روتی ہے تو پورا جگ نیر بہاتا ہے۔ وہ اداس ہوتی ہے تو دنیا، جنگل نظر آتی ہے۔ ہماری محبوب کو بتانا کہ وہ دن جلد آئے گا جب وہ مغل سلطنت پر حکومت کرے گی۔ وہ دن بہت قریب ہے، جب ہم اُس کے ایک ایک آنسو کے بدلے سو سو موتی لٹائیں گے۔“

صاحبِ عالم اچانک خاموش ہو گئے۔ انہوں نے اپنی قبائلی شریعت شروع کر دی اور پھر کاغذ کا ایک پرزہ نکال کر مجھے تھما دیا۔

”یہ ہماری محبوب کو دے دینا۔ یہ ہماری نظم اور ہمارا نامہ ہے، اسے حفاظت سے رکھنا۔“

”جی، صاحبِ عالم۔“

”کیا تمہاری آقا زادی، شادی میں شرکت کرے گی؟“

”نہیں صاحبِ عالم، میری آقا زادی اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔“

صاحبِ عالم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر وہ یونہی بیٹھے رہے پھر انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے جانے کا حکم دیا اور میں کورنش ادا کر کے اُلٹے قدموں لوٹ آیا۔

میں شہزادے کا خزانہ لے کر ابھی آدھے راستے میں ہی پہنچا تھا کہ ایک تاریک کونے سے تین سائے نکل کر مجھ پر جھپٹ پڑے۔ ایک نے میرے سر کے عقبی حصے پر ضرب لگائی اور میں ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گیا۔

وہ پلٹے تو میں فوراً تعظیم کے لیے جھک گیا۔ صاحبِ عالم نے مجھے قریب آنے کا اشارہ کیا اور عورت، جو مجھے یہاں تک لائی تھی واپسی کے لیے مڑ گئی۔

”تم عیسیٰ ہو، اُس کے غلام؟“ صاحبِ عالم کی آواز ابھری جو نشے سے بھرپور محسوس ہو رہی تھی۔

”جی، صاحبِ عالم۔ غلام نہیں ملازم۔“ میرے ذہن میں یہ بات تھی کہ کیا شاہ اور شہزادے غلاموں اور ملازموں میں کوئی تفریق سمجھتے ہیں؟ مگر انہوں نے میرے الفاظ پر کوئی دھیان نہ دیا۔

”کل ہماری شادی ہو رہی ہے۔“

”میرے علم میں ہے، صاحبِ عالم۔“

”ارجمند کو ہمارا پیغام دینا کہ ہم اس شادی سے۔۔۔ اُس ایرانی شہزادی سے خوش نہیں ہیں۔ ہم شہزادے ہیں۔۔۔ اس قلمرو کے ولی عہد، ہماری زندگی میں سب کچھ ہے، سوائے ارجمند کے۔۔۔ کیا تم ہماری باتیں سن رہے ہو؟“ میں خاموش رہا۔ ”بے وقوف، ہم نے کہا ہے۔۔۔ تم ہماری باتیں سن رہے ہو؟“ میری خاموشی پر صاحبِ عالم چراغ پا ہو گئے۔

”جی، صاحبِ عالم۔“ میں نے دھڑکتے دل سے جواب دیا۔

”اُسے کہنا کہ کسی اور عورت نے ہمیں اُس کی طرح متاثر نہیں کیا۔۔۔ کیا تم نے بھی کبھی ایسا محسوس کیا ہے؟“

میں اُن کے سوال کا صحیح جواب نہیں دے سکتا تھا۔

”ہم نے کہا ہے کہ کیا کبھی تم نے بھی محبت کے جذبے کو محسوس کیا ہے؟“

”نہیں، صاحبِ عالم۔“

”تم حیران تو ہو گے کہ عظیم مغلوں کا عظیم ولی عہد تم سے اس طرح کی باتیں کیوں کر رہا ہے؟ لیکن تم ہی بتاؤ کون ہے جو اُس تک ہمارے محسوسات پہنچا سکتا ہے، کیونکہ خاندانِ مغلیہ میں محبت نام کی کوئی شے موجود نہیں ہے۔۔۔ وہ کیسی ہے؟“ صاحبِ عالم عجیب ٹوٹے انداز میں باتیں کر رہے تھے۔

”افسردہ، صاحبِ عالم۔“

ورقی نے آگے جھک کر کاغذ پر بنی لکیروں کا جائزہ لیا۔ ”کیا تم اسے بنانے میں ہماری مدد کر سکتے ہو؟“

”کیوں نہیں؟“ مورقی نے جواب دیا۔ ”مگر اس میں بہت وقت لگے گا۔“
 ”پروا نہیں۔“ بلدیوداس نے کندھے اُچکائے۔ ”لیکن جالی پر کوئی انسانی شبیہ نہیں ہونی چاہیے کیونکہ مسلمان مذہب میں تصویر کشی حرام ہے، بس نیل بوٹے بنا دینا۔“
 مورقی نے دوبارہ اثبات میں سر ہلایا۔ بلدیوداس اُس کا بازو پکڑ کر باقی لوگوں سے ذرا فاصلے پر لے آیا۔

”تمہیں روزانہ کیا اجرت ملتی ہے؟“
 ”دو چاندی کے سکے۔“ مورقی نے جواب دیا۔ ”لیکن یہ میری ضروریات کے لیے ناکافی ہیں۔ میں اور میرا خاندان انتہائی عسرت سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔“
 ”میں بخشی سے بات کروں گا۔“ بلدیوداس نے اُسے یقین دلایا۔
 مورقی نے فوراً اُسے نمستے کہا اور لوٹ آیا۔۔۔ مبادا کہیں بلدیوداس کوئی ایسا سوال نہ پوچھ لے جو اُس کے لیے مصیبت کا باعث بن جائے۔

○○○

1045ھ (1635ء)

ممتاز محل

مورقی خاموش بیٹھانگ مرم کے اُس ٹکڑے کو تھپتھپارہا تھا جسے اپنے ہنرمند ہاتھوں سے کاٹ کر اُس نے جالی کی شکل دی تھی۔ جالی کا یہ نمونہ اُس نے بے انتہا کوششوں کے بعد بنایا تھا کیونکہ وہ بار بار اپنے ہی بنائے ہوئے نمونے کو مسترد کر دیتا تھا۔
 اُسے وہ دن یاد تھا جب محرر نے اُسے اچانک طلب کر لیا تھا۔ وہ خوفزدہ ہو گیا کہ مغل عمال نے پتا چلا لیا ہے کہ اُس نے کوئی کام نہیں کیا اور اب وہ اُس سے اجرت واپس طلب کریں گے لیکن اس کے برعکس اسے ایک شامیانے میں جانے کی ہدایت کی گئی جہاں بہت سے امراء متعدد نقشوں پر جھکے ہوئے تھے۔ تقریباً سبھی اُس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔
 ”میرا نام مورقی ہے۔“ اُس نے بوکھلا کر اپنا تعارف کرایا اور ایک جانب سٹ کر کھڑا ہو گیا۔

”میرے قریب آؤ۔“ اُن میں سے ایک شخص نے اپنے پہلو میں جگہ خالی کرتے ہوئے مورقی کو پکارا۔ وہ بلدیوداس تھا جو ملتان سے یہاں آیا تھا۔
 ”ہمارا کام یکساں ہے۔“ اُس نے گرم جوشی کے ساتھ مورقی سے ہاتھ ملایا۔ ”میں بھی نقاش ہوں، مجھے بتایا گیا ہے کہ تم دیوتاؤں کے بت تراشتے ہو۔“
 مورقی نے اثبات میں سر ہلا کر تائید کی تھی۔

”ہم ایک شے کا نمونہ بنا رہے ہیں۔“ بلدیوداس نے اپنے سامنے پھیلے نقشوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ ایک جالی ہے جو ملکہ عالیہ کے مقبرے کے گرد لگائی جائے گی۔“

عیسیٰ اور میر عبد الکریم نے نمونہ شہنشاہ کے حضور پیش کیا۔ جالی کا نمونہ سنگ مرمر سے تیار کیا گیا تھا اور پھولوں اور نگینوں سے اسے سجایا گیا تھا۔ شہنشاہ بہت دیر تک اس جالی کا مطالعہ کرتا رہا جو اس کی محبوبہ ارجمند کے مقبرے کے گرد لگائی جانی تھی۔ آخر کار شہنشاہ نے اثبات میں سر ہلا کر منظوری دے دی اور نقشہ عبد الکریم کو واپس کر دیا۔

”اس کا خالق کون ہے؟“ بالآخر شہنشاہ کی آواز ابھری۔

”بلد یو داس، جہاں پناہ۔“

”بہت خوب۔“ شہنشاہ نے کہا۔ ”کام کی رفتار کیا ہے؟“

”کام جاری ہے جہاں پناہ۔“ میر عبد الکریم نے کہا۔ ”فوارے مکمل ہونے والے ہیں

لیکن کام کے نگران نے بتایا ہے کہ پاڑ کے لیے لکڑی نہیں ہے۔“

شہنشاہ شاہ جہاں نے چونک کر میر عبد الکریم کو دیکھا لیکن فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔ میر بخشی اپنے کاغذات لیے بات چیت ختم ہونے کا منتظر تھا۔ دکن کا معاملہ اس کے سر پر بھوت کی طرح سوار تھا۔ اس کے مخبروں نے اطلاع دی تھی کہ چھوٹے چھوٹے شہزادوں نے شہنشاہ کی توجہ محض ایک ہی جانب محسوس کر کے سر اٹھانا شروع کر دیا تھا اور انہوں نے سلطنت کے جنوبی حصے کو آزاد کرانے کا منصوبہ بنا لیا تھا۔ مغل سپاہ کو ہر حال میں ان کی بیخ کنی کے لیے بھیجا جانا تھا لیکن افسوس یہ کہ یہ اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ اس کے بعد میر سلمان کے اپنے مسائل تھے۔ خشک سالی نے خاصی تباہی مچائی تھی۔ بارش نہ ہونے کے باعث فصلیں تباہ ہو گئی تھیں اور محاصل کم رہ گئے تھے۔

”پختہ خشت سے کام چلایا جائے۔“ کچھ توقف کے بعد شہنشاہ کی آواز ابھری۔ ”کیا

اینٹیں کام آ سکتی ہیں؟“

مورتی اپنے کام میں مصروف تھا۔ پتھر کی سل اس کے قدموں کے قریب پڑی تھی۔۔۔ گوپی، اس کا بیٹا، اس کے برابر کھڑا اپنے باپ کو کام کرتے دیکھ رہا تھا۔ مورتی نے اسے نہ صرف دیکھنے بلکہ یہ سب سیکھنے کی ہدایت کی تھی۔ خاصی دیر تک وہ گدھوں کی طرح کام میں جتا رہا حتیٰ کہ نیل بوٹوں سے مزین جالی کا نمونہ تیار ہو گیا۔

فارغ ہو کر مورتی، بلد یو داس کو بلالایا اور جب اس نے ہر زاویے سے گھوم پھر کر جالی کا جائزہ لیا تو وہ دل ہی دل میں مورتی کی صلاحیتوں کو خراج تحسین پیش کیے بغیر نہ رہ سکا۔ اسے جالی بہت پسند آئی تھی لیکن اس کی حتمی منظوری شہنشاہ کو خود دینی تھی۔

”جب تم جالی پر اصل کام شروع کرو گے تو بخشی تمہیں چار سکے روزانہ دے گا۔“ بلد یو نے مورتی کو خوش خبری سنائی۔

مورتی کے لیے یہی بہت تھا حالانکہ وہ جانتا تھا کہ بلد یو کو روزانہ سونے کے بائیس سکے مل رہے ہیں لیکن وہ امیروں میں شمار کیا جاتا تھا۔

”صاحب۔“ مورتی نے اسے مخاطب کیا۔ ”آپ نے یہاں بہت سی چیزیں دیکھی ہوں گی، کیا کبھی آپ نے ملکہ عالیہ ممتاز محل کو بھی دیکھا ہے؟“

”نہیں۔“ بلد یو نے جواب دیا۔ ”ہم میں سے کسی نے ملکہ کو نہیں دیکھا۔“

مورتی پریشان ہو گیا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ ملکہ بہت خوب صورت تھی۔۔۔ لیکن جو کچھ ہو رہا تھا کیا وہ واقعی اس کی مستحق بھی تھی یا نہیں؟

ooo

1021ھ (1611ء)

ارجمند بانو

شروع شروع میں والدہ نے مجھے ہر طریقے سے سمجھانے کی کوشش کی کہ کسی طرح میرا ذکھ کم ہو جائے لیکن یہ اُن کے بس کی بات نہیں تھی۔ محبت بے شک کسی طوفان کی طرح حملہ آور نہیں ہوتی لیکن جب کسی سے محبت ہو جائے تو پھر یہ ایک طوفان کی صورت ہی اختیار کر لیتی ہے جس پر وہی بند نہیں باندھا جاسکتا۔ اُن کی نصیحتیں سن کر مجھے یہ احساس بھی ہوتا کہ میں نے تو ایک شخص سے محبت کی ہے لیکن کسی نے مجھ سے محبت نہیں کی اور میں تنہا ہوں۔۔۔ غم کے تھپڑے کھانے کو بالکل تنہا۔۔۔

اور پھر میری والدہ کا ضبط بھی جواب دے گیا لیکن اس میں اُن کا کوئی قصور نہیں تھا، میری عمر تیزی سے بڑھ رہی تھی اور اب میں سولہ سال کی تھی۔

”تم سے اب کون شادی کرے گا؟“ والدہ نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ ”تمہاری عمر میں تو میں تمہیں جنم دے چکی تھی نہ صرف یہ بلکہ۔۔۔“

”کیا آپ نے ابا حضور سے محبت کی تھی؟“

والدہ یوں اُچھلیں جیسے بچھونے ڈنک مار لیا ہو۔۔۔ اُن کا چہرہ مارے غصے کے سرخ ہو گیا تھا۔

”تم اپنے بزرگوں سے مخاطب کا انداز بھی بھول گئی ہو۔“ انہوں نے کڑکتی آواز میں کہا۔ ”تم اپنی گستاخیوں اور بدتمیزیوں کو محبت سمجھ بیٹھی ہو۔ تم نے زندگی میں ایک بار، صرف ایک بار ایک شخص کو دیکھا اور دعوے دار ہو کہ تم اُس سے محبت کرنے لگی ہو۔“ والدہ کی آواز

”جی، جہاں پناہ، لیکن ان کی قیمت بہت زیادہ۔۔۔“

”اخراجات کی فکر مت کرو، مغل خزانہ لبالب ہے، ارجمند کے لیے ہم اس سلطنت کا ذرہ ذرہ خرچ کر سکتے ہیں۔“

میر عبد الکریم نے خاموشی اختیار کر لی۔ کچھ کہنے کے بجائے اُس نے تعظیم دی اور اُلٹے قدموں دروازے کی طرف بڑھ گیا لیکن اُس کا ذہن اینٹوں پر اٹھنے والے گراں قدر اخراجات کا اندازہ کر رہا تھا۔

عیسیٰ نے بھی ساتھ ہی جانے کی کوشش کی لیکن شہنشاہ نے اُسے ٹھہر نے کا حکم دیا تھا۔ شہنشاہ خاموش ہو گیا۔ وہ اس وقت دکن کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ اُس کے دل میں ہوک سی اٹھی۔ کاش ارجمند اس وقت اُس کے پاس ہوتی۔ وہ اُسے اور سلطنت پر اکثر مشورے دیا کرتی تھی۔ اُس نے اُسے مغلوں کی طاقت کا سب سے بڑا نشان، مہر ازاں دے رکھی تھی۔

”ہم نے دکن کے معاملے کا بغور جائزہ لیا ہے۔“ شاہ نے میر بخشی کو مخاطب کیا۔ ”اُن بد معاش شہزادوں کو سزا دینا اب ضروری ہو گیا ہے۔ ہم شہزادہ اورنگ زیب کو مغل سپاہ کا سالار اعلیٰ مقرر کرتے ہیں۔ تم اُس سے مل کر باقی تفصیلات طے کر لو۔ باقی رہ گئی برسات، تو ہم اس سلسلے میں کیا کر سکتے ہیں۔ ہم نعوذ باللہ خدا تو نہیں۔“

ایک ایک کر کے شہنشاہ نے تمام وزراء کو فارغ کر دیا اور پھر عیسیٰ کو لے کر بالکونی میں کھڑا ہو گیا۔۔۔ جہاں سے جمنہ کا پانی اور اس کے کنارے اُس کی محبوب ملکہ کا مقبرہ تعمیر کرنے والے مزدور صاف دکھائی دے رہے تھے۔

○○○

شادی کی ہے ورنہ اُن دونوں کا آپس میں کوئی تعلق نہیں ہے۔“
والدہ کو چپ لگ گئی۔ وہ کھا جانے والی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔ ایسے لگتا تھا جیسے ابھی میرا گلا دبا دیں گی۔
”اس طرح کی اخلاق سے گری ہوئی باتیں تمہیں کون بتاتا ہے؟ مجھے لگتا ہے کہ تمہارے صرف ہاتھ ہی کاٹنے نہیں پڑیں گے۔۔۔ زبان بھی داغی ہوگی۔“
”ہر کوئی جانتا ہے۔“
”میں نہیں۔“

”اس میں میرا قصور کیا ہے امی؟ شہزادی نے خود اپنی مصاحب خواتین کو بتایا ہے کہ ولی عہد سلطنت شب عروسی کو باتیں کرتے رہے اور پھر وہ کمرے سے چلے گئے تھے۔“
”تم وہاں کھڑی سُن اور دیکھ رہی تھیں؟“ والدہ نے طنز کیا۔
”دوسرے تو تھے۔“ میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ”شب عروس گزرے دو سال ہو گئے ہیں لیکن اُن کی کوئی اولاد نہیں۔“

”بکواس بند کرو۔“ وہ حلق کے بل دھاڑیں۔ ”اولاد کا تحفہ اللہ تعالیٰ کے ہاں سے عنایت ہوتا ہے۔“
”لیکن صاحبِ عالم نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ مجھے اپنے ملکہ بنائیں گے، میں اُن کا انتظار کروں گی۔“

”ثبوت؟“ والدہ نے آنکھیں دکھائیں۔ ”اگر تمہارے پاس تمہارے دعوے کا کوئی ثبوت ہے تو میں تمہیں کبھی کچھ نہیں کہوں گی۔“
”مجھے عیسیٰ نے۔۔۔“

”تم اُس دو نکلے کے ملازم پر اعتماد کرتی ہو لیکن اپنی ماں پر بھروسہ نہیں کرتیں۔“
میں خاموش رہی تھی۔ میں انہیں کیا بتاتی، لیکن میں نے خود زخمی عیسیٰ کی مرہم پٹی کی تھی اُس کا سارا سر خون میں لتھڑا ہوا تھا۔ جب وہ بولنے کے قابل ہوا تو اُس نے مجھے صاحبِ عالم کی طلبی کے بارے میں آگاہ کیا۔ پھر اُس نے اُن کا خط نکالنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا لیکن جملہ آراء سے چھین لے گئے تھے البتہ شہزادے کی طرف سے ملنے والی آنکھوں کی بدستور

بلند اور لہجہ سخت تھا۔

میں کیا جواب دیتی۔۔۔ منی کے مادھو کی طرح خاموش بیٹھی رہی۔ وہ بولتی رہیں اور مجھ پر اپنا غصہ اتارتی رہیں۔

”تمہاری طرف سے بہت حماقتیں ہو چکیں۔“ بالآخر انہوں نے فیصلہ سنایا۔
”تمہارے دادا حضور نے تمہارے لیے ایک نوجوان کا انتخاب کر لیا ہے اور ہم سب نے بھی اُسے پسند کیا ہے۔ وہ ایرانی النسل ہے اور اُس کا نام جمال بیگ ہے۔ تمہارے دادا حضور اُس کے خاندان کو اصفہان سے جانتے ہیں۔ وہ بہت باصلاحیت نوجوان ہے اور ہمیں امید ہے کہ وہ شہنشاہ کی نظروں میں نہایت بلند مقام حاصل کرے گا۔“

میں اپنی قسمت کے فیصلے پر سُن ہو گئی۔
”میں اُس سے شادی نہیں کروں گی۔“

والدہ کا ہاتھ اٹھا لیکن جانے کیا سوچ کر انہوں نے واپس گرالیا۔ ”اگر یہ الفاظ میں نے اپنی والدہ سے کہے ہوتے تو وہ مجھے زندہ زمین میں گاڑ دیتیں، تمہیں اُس سے ملنا ہوگا۔“
”نہیں۔“ میں نے مضبوطی سے کہا۔

”بے وقوفی نہیں، ارجمند۔“ وہ دوبارہ چلائیں۔ ”تم پہلے ہی شادی کی عمر سے تین سال بڑی ہو چکی ہو لیکن جمال نے ہمارے خاندان سے اظہارِ مروت کے طور پر تم سے شادی کی حامی بھری ہے۔“

”آپ مجھے اپنے مفادات کی تکمیل کا ذریعہ نہیں بنا سکتیں۔“ میں والدہ سے مکمل طور پر بغاوت پر آمادہ تھی اور اُس ہستی کے سامنے بول رہی تھی جس نے اپنی کوکھ سے مجھے جنم دیا تھا۔

”تمام عورتیں تم پر ہنستی ہیں۔ اور کہتی ہیں کہ تم ولی عہد کا انتظار کرتی رہیں اور اُس نے ایک دوسری عورت سے شادی رچالی ہے۔ وہ اب تم سے بہت دُور چلا گیا ہے۔“

”یہ غلط ہے۔“ میں نے فوراً تردید کی۔ میں خود اس بات پر حیران ہو رہی تھی کہ آج تک کبھی میں نے اپنی والدہ کے سامنے اس انداز میں بات نہیں کی تھی۔ شاید یہ جرأت یا میری والدہ کے بقول گستاخی مجھے محبت نے بخشی تھی۔ ”صاحبِ عالم نے صرف دکھاوے کو

شہاب الدین

میں اُن دنوں حسن فیروز کی عظیم الشان جاگیر میں اپنے والد کا نائب تھا۔ یہ عظیم جاگیر دہلی کے شمال میں چالیس کوس کے فاصلے سے شروع ہوتی تھی اور لاہور تک پھیلی ہوئی تھی۔ لاہور ہی اس جاگیر کا صدر مقام تھا۔ تمام رانے، نواب، امیر، کسان اور تاجر مجھے عشیرہ ادا کرتے تھے۔ میری آمدنی آٹھ لاکھ سالانہ تھی اور میں دس ہزار گھڑ سواروں کی سپاہ کا سالار اعلیٰ تھا۔ یہیں رہ کر میں نے آداب بادشاہی سیکھے اور یہیں رہ کر میرے دل میں وہ درد ہوا جو میری محبوب کی دوری سے جاگ اٹھا تھا۔

اسی درد کی وجہ سے میں اپنی بیوی، شہزادی گلبدن پر کوئی توجہ نہیں دے سکا تھا۔ ارجمند کے علاوہ کسی دوسری عورت کا بہ طور بیوی تصور میرے لیے ممکن نہ تھا۔ وہ بھی سب کچھ سمجھتی تھی لیکن خاموش تھی۔ شاید اگر اسے اپنی حیثیت کا علم ہوتا تو وہ کبھی فارس سے یہاں تک کا طویل سفر اختیار نہ کرتی۔ لاہور بہت خوب صورت شہر تھا لیکن یہ خوبصورتی بھی اُس کے دل میں کوئی امنگ پیدا نہ کر سکی تھی کیونکہ اس خوب صورت ماحول کے باوجود اُس کا شوہر قریب رہتے ہوئے بھی اُس سے دور تھا اور اُسے علم تھا کہ یہ دوری ارجمند کی وجہ سے ہے۔

میں نے سنا تھا کہ وہ اب بھی میری منتظر ہے۔ اُس کے غلام نے یقیناً اُسے میرے جذبات اور الفاظ سے آگاہ کر دیا تھا اور اب وہ انہی الفاظ کے سہارے زندگی بسر کر رہی تھی۔ اس صورت میں بھلا میں کیوں کر اُسے فراموش کر سکتا تھا۔

میں نے ارجمند سے شادی کا وعدہ کیا تھا اور اُسے اپنی اکلوتی بیوی کی حیثیت سے حرم میں داخل کرنا چاہا تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ ایرانی شہزادی میرے راستے سے ہٹ

اُس کی انگلی میں موجود تھی۔ اس صورت میں۔۔۔ میں کیسے اُس پر اعتماد نہ کرتی؟ آخر ہم بن دیکھے اللہ تعالیٰ پر بھی تو اعتماد کرتے ہیں پھر اُس کا کوئی بندہ، اعتماد کا مستحق کیوں نہیں تھا۔ ”تم شام کو جمال بیگ سے ملو گی اور اُس کے بعد ہم دیکھیں گے کہ ہمیں تمہارا کیا کرنا ہے۔“ والدہ پیر پختی ہوئی باہر کی طرف چلیں۔ دروازے پر پہنچ کر وہ مڑیں۔ ”یاد رکھنا۔ ارجمند، یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔“

انہوں نے دروازہ زور سے بند کیا اور باہر نکل گئیں۔

○○○

حمیری

جاتی۔ میرے لیے یہ بہت آسان تھا کہ میں تین بار۔ ”میں نے تمہیں طلاق دی۔“ کے الفاظ دہرا دیتا لیکن مجھے یہ علم بھی تھا کہ ان الفاظ سے پوری مغل قلمرو تھرا اٹھے گی اور ان الفاظ کی بازگشت ادھر ادھر ہر جگہ سنائی دے گی۔ اس لیے میں اس وقت یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔

چنانچہ میں منتظر تھا۔۔۔ جیسے ارجمند میری منتظر تھی۔

000

ارجمند بانو

میں نے سنا تھا کہ صاحبِ عالم نے اپنے اشعار اور اپنا ایک نامہ مجھے بھجوایا تھا لیکن یہ دونوں چیزیں کبھی مجھ تک نہ پہنچ سکیں۔ عیسیٰ پر جس وقت حملہ ہوا تھا وہ اندھیرے کی وجہ سے کسی کو پہچان نہ سکا تھا لیکن پھر ایک دن اُس نے وہی خط ایک محلی کپڑے میں لپیٹے ہوئے میز کے پاس دیکھے جو اُسے دیوانِ قصی الملک کے ایک ہرکارے نے میری پھوپھو کے ملاحظے کے لیے دیے تھے۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ میری پھوپھو بھی اس سازش میں شریک تھیں کہ صاحبِ عالم کا پیغام مجھ تک نہ پہنچ سکے۔ ظلِ الہی ابھی سے پھوپھو کے ہاتھ میں کھلونا بن چکے تھے لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ جب دونوں ہی ایک دوسرے کو چاہتے تھے تو انہیں انتظار کس بات کا تھا؟ میں نے ایک سال قبل پھوپھو سے یہ سوال کرنے کی جسارت بھی کی تھی۔

”ظلِ الہی، ہندوستان کے بادشاہ اور یہاں کی ہر شے کے بلا شرکتِ غیرے مالک ہیں۔“ پھوپھو نے جواب دیا تھا۔ ”وہ اپنی ہر خواہش کسی بھی رکاوٹ یا پریشانی کے بغیر پوری کر سکتے ہیں۔ اگر وہ مغرب، مشرق، شمال یا جنوب کی طرف ہاتھ اٹھادیں تو پوری مغل قوت اُس طرف چلنا شروع کر دے گی لیکن زندگی میں بعض منازل ایسی بھی ہوتی ہیں جو چاہنے کے باوجود ایک بادشاہ بھی سر نہیں کر سکتا۔ میں انہی منزلوں میں سے ایک ہوں۔ میں نے ظلِ الہی کی نگاہوں میں اپنے لیے تخت سے زیادہ قدر و منزلت دیکھی ہے۔۔۔ لیکن اگر میں فوری طور پر اُن کی خواہشوں کے سامنے سر جھکا دوں تو میری یہ قدر و منزلت۔۔۔ ریت کے گھروندے کی طرح ڈھکے جائے گی۔۔۔ ظلِ الہی مجھے اپنی نظموں میں، نورِ محل، کے نام سے پکارتے

صاحبِ عالم کے خط کیوں روکے تھے؟“
 ”ظلِ الہی نے اس کا حکم دیا تھا۔“ پھوپو نے بائیں کان میں بالی ڈالتے ہوئے بے نیازی سے جواب دیا۔

”گستاخی معاف پھوپو، لیکن پتا نہیں کیوں جی نہیں مان رہا۔“
 پھوپو میری طرف پلٹیں۔

”ارجمند!“ اُن کے لہجے میں کوئی ختی نہیں تھی۔ ”تم میری پیاری پیاری بھتیجی ہو پھر بھلا میں تمہارے اور ولی عہد کے درمیان کیوں آؤں گی؟ مجھے تم دونوں کے ملاپ سے بے حد خوشی ہوگی۔ بہت جلد میں مغل سلطنت کی ملکہ بننے والی ہوں اور میں نہیں چاہوں گی کہ میری بھتیجی کے بجائے کوئی اجنبی لڑکی، شاہ جہاں سے بیاہی جائے۔“

مجھے اُن کی آواز میں خلوص محسوس ہو رہا تھا۔ مسکراہٹ بھی ہمدردانہ اور مشفقانہ تھی۔

”لیکن ظلِ الہی ہماری خط و کتابت میں دیوار کیوں بنے؟“

”یہ رموز مملکت ہیں۔“ پھوپو نے کندھے اچکائے۔ ”ایرانی شہزادی پہلے ہی بہت ناخوش ہے اور اُس نے ایک قاصد کے ذریعے اپنے چچا، شہنشاہِ ایران کو تمام حالات سے باخبر کرنے کی کوشش کی تھی اُس نے۔۔۔“

آپ کو کیسے پتا چلا پھوپو؟“

”ظلِ الہی نے مجھے بتایا تھا کیونکہ وہ قاصد کبھی ایران نہیں پہنچ سکا۔ وہ شاہِ ایران سے فی الحال مخاصمت مول لینا نہیں چاہتے لیکن انہیں تم دونوں سے بھی ہمدردی ہے۔ انہیں محبت کے جذبات کا بھی مکمل ادراک ہے لیکن ابھی نہیں چاہتے کہ تمہارا تعلق زبانِ زدِ عام ہو۔“
 ”لیکن وہ خط تو شہنشاہ نے منیر کے ذریعے آپ کو بھجوائے تھے۔“

”وہ میرے پاس محفوظ ہیں۔“ پھوپو کے چہرے پر شرمندگی کے کوئی آثار نہیں تھے
 ”میں قسم کھا سکتی ہوں کہ میں نے اُن کا ایک لفظ بھی نہیں پڑھا اور نہ ہی کبھی پڑھوں گی۔“
 ”تو پھر وہ خط مجھے دے دیں۔“

”اُس وقت تک نہیں، جب تک ظلِ الہی مجھے ایسا کرنے کا حکم نہیں دیتے۔“

میرے آنسو نکل آئے۔ پھوپو نے فوراً آگے بڑھ کر مجھے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

ہیں لیکن میں ابھی یہ نور اُن کے محل میں پھیلا نا نہیں چاہتی۔“
 ظاہر ہے پھوپو کے اس لمبے چوڑے جواب کے بعد میرے پاس کچھ اور کہنے کی گنجائش نہیں تھی، سو میں چپ رہی۔

اُن دنوں ہماری حویلی میں شادی کی چہل پہل تھی۔ خیاطوں، سناروں، باورچیوں، مولویوں، رقاصاؤں، ماہرینِ آرائش اور گویوں کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا۔ ظلِ الہی کے اشعار کو حقیقت کا رُوپ ملنے والا تھا۔ یہ اشعار اب بھی پابندی کے ساتھ پھوپو تک پہنچتے۔ وہ کبھی کبھی تو ان پر بڑی خوشی کا اظہار کرتیں لیکن کبھی بالکل خاموش ہو جاتیں۔ ایسے ہی موقعوں پر میں سوچتی کہ پھوپو نے ظلِ الہی سے محبت کی ہے یا شاہی تخت سے؟

پھوپو اپنے عروسی لباس کی تیاری اپنے ہاتھوں کر رہی تھیں۔ اُن کا چوڑی دار پاجامہ روئے زمین پر میسر سب سے بہترین بنارس ریشم سے تیار کیا گیا تھا۔ گرتا بھی اسی ریشم سے تیار ہوا تھا اور ان پر بے تحاشا سونے کے تاروں کا کام ہوا تھا۔ ایک ریشمی غرارہ اور چولی بھی تیار کی گئی تھی۔ یہ مہین ریشم تھا جس سے سُسن جھلکتا تھا۔ ایک سُرخ رنگ کی زنا نہ پگڑی تھی جو شہزادیاں اور ملکانیں تاج کی جگہ پہنا کرتی تھیں۔ اس پر ہیرے جواہرات نکلے ہوئے تھے جب کہ چہرے کے لیے ایسا نقاب تیار کیا گیا تھا جس سے اُس کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھی جاسکتی تھی۔

ظلِ الہی نے انہیں بہت سے تحائف بھیجے تھے۔ ایک جڑاؤ ہار، جس کا ایک ایک ہیرا انگوڑ جتنا بڑا تھا۔ ایک دوسرا ہار، جو اُن کی پتلی کمر تک لمبا تھا۔ یہ سونے کا تھا اور اس میں نیلم اور زمررد نکلے ہوئے تھے۔ کانوں کی بالیاں تھیں جن کے ہیرے اُن کی آنکھوں جتنے بڑے تھے۔ پہنچیاں بھی خالص سونے کی تھیں۔ ایک پنجا نگلا تھا۔ پازیبیں تھیں جن میں سونے کی ننھی منی گھنٹیاں لگی ہوئی تھیں۔ پانچوں انگلیوں کی انگشتریاں اور ناک کے لیے بڑی سی نتھ بھی تھی۔

پھوپو یہ تمام تحفے پا کر بے حد خوش تھیں اور انہیں بار بار پہن کر آئینے میں اپنے سُسن کا جائزہ لے رہی تھیں۔

ایسے ہی ایک موقع پر میں نے آہستگی کے ساتھ اُن سے دریافت کیا۔ ”آپ نے

”جنش مکن، ہوشیار باش! شاہ بلند نام، خداوند ثروت و احتشام، مالک تخت ہندوستان، عالم پناہ، شہنشاہ نور الدین محمد جہانگیر۔۔ صاحب ذی جاہ، سالار انجم سپاہ، ولی عہد اقلیم ہند، صاحب عالم، شہزادہ شہاب الدین محمد خرم کی سواری جلوہ افروز ہوتی ہے۔۔۔“

چوب داروں کے غلغلے کے ساتھ ہی شہنشاہ کی سواری ہماری حویلی کے عین سامنے نمودار ہوئی۔ میرا محبوب، اپنے جلیل القدر والد کے پہلو میں ہمارے باغ میں قدم افروز ہوا۔ اُس کے دوسرے بھائی پیچھے پیچھے تھے اور اُن کے بعد امراء سلطنت اور دارالسلطنت کے بڑے بڑے لوگوں کا ایک جم غفیر تھا۔ شاہی جلوس پر پھولوں کی پیتاں، ابر رحمت کی طرح برسنے لگیں جو عورتیں، حویلی کی دیواروں اور جلوس کے راستے میں لیے کھڑی تھیں۔

ظل الہی اگر چاہتے تو یہ ساری رسومات شاہی محل میں ہی انجام پاسکتی تھیں لیکن چونکہ ہندوستان کی روایات کے مطابق دلہا، بیاہ کے لیے اپنی دلہن کے گھر جاتا ہے چنانچہ شہنشاہ نے ان روایات کی پاسداری کا فیصلہ کیا تھا۔

پوری فضا خوشبو سے معطر تھی۔ لوگ باگ اٹھکیلیوں میں مصروف تھے۔ شہنشاہ کی جانب سے دلہن کے لیے آنے والے تحائف کا جائزہ لیا جا رہا تھا لیکن میں ان میں سے کسی شے کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ میری نگاہیں مسلسل اپنے محبوب کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ خود ولی عہد کی نگاہیں بھی بے قرار تھیں اور بار بار اُس بھاری پردے سے ٹکرا کر لوٹ جاتی تھیں جس کے عقب میں حرم کی دوسری خواتین کے ساتھ میں موجود تھی۔ مجھے اُن کی نگاہوں میں اپنے لیے کئی پیغام نظر آئے لیکن میں اُن میں سے کسی پر بھی لبیک نہیں کہہ سکتی تھی کیونکہ تقریب چھوڑ کر کہیں اور جانا میرے لیے ناممکن تھا۔

”میں مجبور ہوں ارجمند۔“ پھوپو نے میرے کانوں میں سرگوشی کی۔ ”تم نے جہاں کے بارے میں کیا سوچا؟“ انہوں نے فوراً موضوع بدل دیا۔

”میں انکار کر چکی ہوں۔“ میں نے اُن کی گرفت سے آزاد ہوتے ہوئے جواب دیا۔ ”آپ یہ بتائیں کہ کیا ظل الہی، صاحب عالم سے میری شادی کی اجازت دے دیں گے؟“

”میں وعدہ کرتی ہوں کہ ظل الہی سے اس موضوع پر بات کروں گی۔“ پھوپو نے رخساروں پر بہ نکلنے والے میرے آنسو پونچھے۔ ”لیکن اس میں کچھ وقت لگے گا، انتظار کرنا۔۔۔ اب تم جاؤ۔“

○○○

حمیری

شہاب الدین

”عیسیٰ، اُسے ہمارے پاس لے آؤ، اس تاریک کو نے میں جہاں ہمیں کوئی نہ دیکھ سکے۔“

ساتھ ہی میں نے ارد گرد کا جائزہ لیا لیکن مجھے کوئی تاریک گوشہ نظر نہ آیا جہاں محبت کرنے والے دودل، راز و نیاز کر سکتے ہوں۔ پورا باغ روشنیوں میں نہایا ہوا تھا۔ کچھ امراء اور معزز خواتین، باغ میں چہل قدمی کر رہی تھیں اور جب میں اُن کے قریب سے گزرتا تو وہ پلٹ پلٹ کر مجھے دیکھتے اور تعظیم دیتے جب کہ میری خواہش تھی کہ اس وقت وہ مجھے نظر انداز کر دیں اور بھول جائیں کہ میں شہاب الدین محمد خرم ہوں۔

میں باغ کے آخری سرے پر چلا گیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ درختوں کی چھاؤں نے مجھے بھی ایک سایہ بنا دیا تھا۔ پھر میں نے اُسے دیکھا۔ اپنی محبوب کو دیکھا۔ وہ عیسیٰ کے پیچھے چھوٹے قدم اٹھاتی چلی آ رہی تھی۔ وہ یوں ڈری اور سہمی ہوئی تھی جیسے کوئی جرم کرنے جا رہی ہو۔ اُس کے کان آہٹوں اور نظریں تاریکی پر تھیں۔۔۔ جیسے مجھے تلاش کر رہی ہوں۔

میں اُس کی چال میں کھو گیا۔ اُس کے قدم اٹھانے میں ایک عجیب سا سحر، عجیب سا انداز تھا۔ وہ واقعی حسین ترین لڑکی تھی۔ اُس جیسا حسن کم از کم میں نے پہلے کہیں نہیں دیکھا تھا۔ وہ سرتاپا پرستش کے قابل تھی۔ دوسروں سے مختلف اور ماورا۔ وہ چوڑی دار پا جاے اور گرتے میں کوئی حور نظر آتی تھی۔ گہرے پیلے رنگ کے ملبوس میں آکاش سے اُتری کوئی اپسرا تھی۔ سر پر زنا نہ پگڑی تھی جو لباس سے ملتے جلتے رنگ کی تھی۔ میں نے غور سے کوہ قاف کی اُس پری کو دیکھا۔ وہ بالکل نہیں بدلی تھی۔

ooo

ارجمند بانو

”صاحب عالم کہاں ہیں؟“

”یہیں ہوں گے۔“ عیسیٰ نے جواب دیا لیکن میں محض آنکھیں پٹپٹا کر رہ گئی۔ آگے

تاریکی تھی۔

”تم مجھے کہاں لیے جا رہے ہو؟“

”ان درختوں کے پیچھے آغاچی، صاحب عالم وہیں تمہارے منتظر ہیں۔“

میں نے خود کو مجتمع کیا اور روشنیوں سے تاریکی میں داخل ہو گئی۔۔۔ نہیں بلکہ تاریکی سے روشنیوں میں داخل ہو گئی۔

”ارجمند۔“ دفعتاً تاریکی میں مجھے ایک سرگوشی سنائی دی اور پھر ایک مضبوط ہاتھ نے مجھے درخت کے پیچھے کھینچ لیا۔۔۔ کوئی اور موقع ہوتا تو میں چیخ اٹھتی لیکن میں اُس سرگوشی کو اور اُس گرفت کو پہچانتی تھی۔

”میں خوفزدہ ہوں، صاحب عالم۔“ میں بانہوں کے مضبوط حصار میں کسی چڑیا کی طرح پھڑپھڑائی۔

”کس شے سے جان خرم؟“

”آپ مجھے چھوڑ کر چلے جو گئے تھے، صاحب عالم۔“

ہلکا سا قہقہہ گونجا۔ ”اور اسی لیے ہم ان درختوں کی آڑ میں چوروں کی طرح تمہارے منتظر تھے۔ ساتھ ہی یہ سوچ رہے تھے کہ تم آنے سے انکار کر دو گی اور عیسیٰ سے کہلوادو گی کہ ہم چلے جائیں۔“

”کون جانتا ہے؟“ شہزادے نے زیر لب کہا۔ ”لیکن اگر تم ہمیں مل جاؤ تو اس کی پروا کسے ہے؟ اگر ہمیں کبھی تاج اور ارجمند میں سے کسی ایک کے انتخاب پر مجبور کیا گیا تو ہمارے ہاتھ اور قدم تمہاری طرف بڑھیں گے، جانِ خرم، ہم کتنے خوش قسمت ہوں گے جس روز تمہارا یہ ملکوتی حسن ہمارے تصرف میں ہوگا۔“

”آپ آج بھی میرے مالک ہیں، جانِ ارجمند۔“

”نہیں، صرف یہ یاد رکھو کہ تم جانِ خرم ہو، کہو کہ تم جانِ خرم ہو۔“

”کنیز یہ گستاخی نہیں کر سکتی صاحبِ عالم، میرے جسم و جاں آپ پر قربان، لیکن

میں۔۔۔“

”ہمارے حکم کی تعمیل ہو۔“

میں خاموشی سے سر جھکائے کھڑی رہی۔ میں صاحبِ عالم کے اتنے قریب تھی کہ اُن کے دل کی بڑھتی ہوئی دھڑکن صاف سنائی دے رہی تھی۔

”ہم نے تمہیں حکم دیا ہے ارجمند۔“

”آپ کا حکم کنیز کی زندگی ہے، صاحبِ عالم لیکن پہلے آپ ایک وعدہ کریں۔“

”کہو۔“

”شادی کے بعد آپ کبھی مجھے خود سے جد نہیں کریں گے۔“

”ہم وعدہ کرتے ہیں کہ تمہیں ایک پل کے لیے بھی اپنی نگاہوں سے اوجھل نہیں

ہونے دیں گے۔ اب ہمارے حکم کی تعمیل ہونی چاہیے۔“

”مم۔۔۔ میں۔۔۔ صاحبِ عالم۔۔۔ میں جانِ خرم ہوں۔۔۔ ارجمند، جانِ خرم

ہے۔“

صاحبِ عالم نے مجھے خود میں چھپالیا۔ جانے کتنی دیر ہم دنیا و مافیہا سے بیگانہ رہے حتیٰ

کہ عیسیٰ کی تیز سرگوشی ہمیں عالمِ ہوش میں لے آئی۔

”ظلی الہی کا ایک وزیر اس طرف آ رہا ہے، آغاچی۔“

میں تڑپ کر پیچھے ہٹ گئی۔ صاحبِ عالم نے جلدی سے ایک چھوٹی سی ڈبیا مجھے تھا

دی۔

”اور آپ چلے جاتے، شہزادے؟“

”نہیں، جانِ خرم، ہم زندگی بھر تمہارا انتظار کرتے اور موت کی زردی پھیلنے تک تمہارے قدموں کی بہار کی راہ دیکھتے رہتے۔“ صاحبِ عالم نے مجھے کچھ اور قریب کر لیا۔ ”تم اور زیادہ خوب صورت ہو گئی ہو، میری محبوب، لیکن یہ تمہاری آنکھوں میں غموں کے سائے کیوں ہیں؟ اب تو تم ہماری پناہ میں ہو۔“

”کب تک شہزادے؟ کب تک؟ آپ تو یوں مجھے دیکھ رہے ہیں جیسے آج کے بعد کبھی نہ دیکھ پائیں گے۔“

”نہیں، ہم اس لیے آنکھیں داکھے ہوئے ہیں۔۔۔ کہ تمہاری خوب صورتی ہماری بینائی کی وسعت سے کہیں زیادہ ہے۔ ہم صرف تمہیں دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ دنیا تمہاری آنکھوں سے شروع ہو کر یہیں ختم ہو جائے۔۔۔ تم نے ہمیں کمزور کر دیا ہے ارجمند۔۔۔ کمزور کر دیا ہے۔“

”نہیں شہزادے، میں تو آپ سے پیار کرتی ہوں، بالکل یوں جیسے قریب المرگ، زندگی سے کرتے ہیں۔“

”ہم بھی ارجمند۔۔۔ ہم بھی تم سے پیار کرتے ہیں۔“ صاحبِ عالم میرے چہرے پر جھک گئے۔ ”ہم تمہیں زندگی سے بھی زیادہ چاہتے ہیں۔“

”لیکن ہمیں کب تک انتظار کرنا ہوگا، شہزادے۔“

”زیادہ نہیں، ہماری محبوب، بہت جلد ظلی الہی ہمیں اجازت مرحمت فرمادیں گے کہ ہم ایرانی شہزادی کو طلاق دے دیں۔۔۔ تم خود بھی یہ خبر سن لوگی۔“

”میں نے بھی پھوپھو سے بات کی ہے اور انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ ظلی الہی سے میرے بارے میں بات کریں گی۔“

”لیکن اگر خانم مہر النساء نے ظلی الہی کو کسی اور راستے پر ڈال دیا تو۔۔۔؟“ صاحبِ عالم کا جسم تن گیا۔۔۔ میں اُن کی بات کا مطلب سمجھ گئی تھی۔

”نہیں صاحبِ عالم۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”وہ آپ کے بارے میں ظلی الہی کی سوچ تبدیل نہیں کر سکیں گی۔“

”اسے ہمیشہ اپنے پاس رکھنا جان خرم، یہ تمہیں ہماری محبت کی یاد دلاتا رہے گا۔“
صاحبِ عالم درخت کی آڑ سے نکلے اور اُس وزیر کی طرف چل دیے جو باغ میں داخل
ہوا تھا۔ میں اندھیرے میں ہی کھڑی ہونٹوں پر زبان پھیرتی رہی جو اب مجھے بیٹھے محسوس ہو
رہے تھے۔

حویلی میں واپس آ کر، روشنی میں، میں نے اُس ڈبیا کا جائزہ لیا۔ وہ گلاب کا ایک
پھول تھا جس کی پتیاں یا قوت کو تراش کر بنائی گئی تھیں۔ ڈنٹھل اور پتے زمرہ کے تھے جب کہ
وسط میں ایک بڑا سا ہیرا پیوست تھا۔ میں کچھ دیر تو اس کا جائزہ لیتی رہی اور پھر فرطِ محبت سے
اسے ہونٹوں سے لگا لیا۔

ooo

تمہیری

عیسیٰ نے مجھے بتایا کہ شہنشاہ اور ان کے ساتھ آنے والے مہمانوں کی تواضع کے لیے
ایک سو اقسام کے کھانے پکائے گئے ہیں۔ یہ انواع و اقسام کے کھانے، سونے کی رکابیوں
میں کنیروں نے معزز مہمانوں کے لیے لگائے۔

شہنشاہ کے سامنے جو کھانا رکھا گیا وہ باقاعدہ مقفل تھا اور انہی کے سامنے اُس پر سے
خوان ہٹائے گئے۔۔۔ کھانا شروع ہونے سے پہلے اسے کنیروں نے چکھا اور پھر معزز
مہمانوں نے شاہ کی اجازت سے کھانے کی طرف ہاتھ بڑھائے۔

دستر خوان پر آگ پر بھنے ہوئے پچاس دہنے، جنہیں مسالے دار دہی کے ساتھ تیار کیا
تھا، مرغِ چاٹ، تیخ کباب، شامی کباب، پسندے، دو پیازہ، روغنِ جوش، شامی قورمہ،
مرغِ مسالے کے پیالے، گوشت، ساگِ گوشت نان، چپاتی، پرائٹھے، برنی، بادام پستے،
گلاب جامن اور آموں، انگوروں، ناشپاتیوں، کیلوں، اناروں، قندھاری اور ہندوستانی
سیبوں، تربوزوں، خربوزوں، نارنگیوں، امرودوں اور پلچی سمیت ہر وہ کھانا اور پھل موجود تھا
جو ہندوستان کے کسی بھی گوشے میں تیار ہوتا تھا یا پیدا ہوتا تھا۔

میں نے اس میں سے کچھ نہیں کھایا۔۔۔ حتیٰ کہ کھانے کی خوشبو تک نہیں سونگھی کیونکہ
میری آنکھیں مسلسل اپنے محبوب کے چہرے سے چپکی ہوئی تھیں۔۔۔ جو اپنے والد کے پہلو
میں بیٹھا تھا۔

ظلِ الہی، دستر خوان پر پھوپھو مہر النساء کی محبت کی شراب پیے بیٹھے تھے۔ انہوں نے
دستر خوان پر موجود تمام افراد کو اپنی موزوں کی ہوئی ایک نظم سنائی جس میں پھوپھو کو روئے
زمین کی تمام شان دار اور عالی شان چیزوں سے تشبیہ دی گئی تھی۔ سورج، چاند، ستارے،
آکاش، پھول، ہیرے، یا قوت، نیلم، زمرہ، ہاتھی دانت اور جانے کیا کیا شے اُن پر قربان کر

دی گئی تھی۔

پھوپھو بھی کم خوش نہیں تھیں۔ شہنشاہ کے پہلو میں بیٹھی وہ ملکہ، حسن نظر آ رہی تھیں۔ بالآخر آج اُن کے خوابوں کی تکمیل ہو گئی تھی۔۔۔ غریب غیاث بیگ کی غریب لیکن حسین بیٹی ہندوستان کی ملکہ بن گئی تھی۔۔۔ اُس نے اپنے حسن سے فاتحین کے فاتح کو پچھاڑ دیا تھا۔ ظل الہی، حاضرین محفل کی موجودگی کی پروا کیے بغیر اُن سے باتوں میں مصروف تھے اور وہ چہرے پر مسکراہٹوں کے بھول سجائے ظل الہی کی جانب متوجہ تھیں۔

پھر یہ سارا ہنگامہ بھی ختم ہو گیا۔ تمام رسومات ہو چکی تھیں۔ روانگی کے لیے شہنشاہ کے حکم کا انتظار تھا جو پھوپھو کے ساتھ کمرہ خاص میں موجود تھے۔ ذرا دیر بعد ظل الہی اور پھوپھو قدم بہ قدم چلتے ہوئے باہر آئے۔ تمام لوگ شہنشاہ ہند اور مغلیہ سلطنت کی نئی ملکہ کو تعظیم دینے کے لیے جھک گئے۔

”ہم اعتماد الدولہ غیاث بیگ کی بیٹی اور اپنی اہلیہ خانم مہر النساء کو ملکہ نور جہاں کا خطاب دیتے ہیں۔“

شہنشاہ کے حکم کا گرم جوشی سے خیر مقدم کیا گیا اور ظل الہی ”مہرو، ہماری نور جہاں ہے۔“ کا ورد کرتے ہوئے شاہی سواری کی جانب روانہ ہو گئے۔

○○○

1021ھ (1611ء)

ارجمند بانو

پھوپھو کی شادی کا ہنگامہ کیا ختم ہوا۔ میری زندگی کے گلشن میں بھی خزاں اتر آئی کیونکہ دوسرے لوگوں کے ساتھ میرا محبوب بھی واپس چلا گیا تھا۔ رخصتی کے بعد میں واپس باغ کی طرف نکل آئی۔ چند ایک لوگوں کے سوا سبھی چلے گئے تھے۔ ایک جانب ایک شخص بیٹھا ہوا تھا اور دوسرے اس کے گرد کھڑے تھے۔

بیٹھا ہوا شخص شہزادہ خسرو تھا۔

سونے کی زنجیر، اس کی کلائی میں تھی جسے اس کے استادہ محافظ نے تھام رکھا تھا اور خود شہزادہ خالی خالی نگاہیں سامنے جمائے۔۔۔ اندھیروں میں اندھیرے تلاش کر رہا تھا۔ میں اس کے قریب بیٹھ گئی۔

”کون ہے؟“ شہزادے نے پلٹ کر میری طرف رخ کیا لیکن ظاہر ہے اسے اندھیرے کی چادر کے سوا کیا نظر آیا ہوگا۔

”بیگم ارجمند بانو، شہزادے۔“

”اوه، ہمارے پیارے کی محبت، ہماری مستقبل کی بھابی۔“ اس نے ہاتھ بڑھا کر میرے گال تھپتھپائے۔ ”برامت ماننا ارجمند بانو، ہمیں بہت سی مراعات حاصل ہیں۔“ اس نے غالباً میرے گال چھونے کا جواز پیش کیا تھا۔ ”ہمیں بتایا گیا ہے کہ تم ایک انتہائی خوب صورت لڑکی ہو لیکن افسوس کہ ہم قدرت کے اس حسین شاہکار کو دیکھنے سے محروم ہیں۔“ میں نے اس کی آنکھیں نمناک ہوتے دیکھیں۔

یہ ہمارا آقا ہے۔“ الفاظ شہزادے کے منہ سے گرم سیسے کی طرح برآمد ہوئے تھے۔

شہزادہ محل کی طرف روانہ ہو گیا۔ محافظ اس کے ساتھ اور میں اس کے عقب میں تھی مختلف غلام گردشوں سے گزر کر ہم محل کے درمیان پہنچ گئے۔ یہاں ہر جانب محافظ ہی محافظ نظر آ رہے تھے۔ شہزادہ خسرو نے محافظوں کے سالار سے سرگوشی میں کچھ کہا۔ اس نے غور سے میرا جائزہ لیا اور پھر ہمیں گزرنے کی اجازت دے دی۔ ہم مزید سپاہیوں کے پاس سے گزرے حتیٰ کہ آخری دروازے تک پہنچ گئے۔ راستے میں کئی جگہ ہمیں ان کتابوں میں اپنے نام درج کرنے پڑے جو محافظ لیے کھڑے تھے۔ ہمیں اپنے تمام زیورات اور ہتھیار بھی جمع کرانے پڑے تھے۔ شہزادہ خسرو نے اپنا خنجر اور پنکا سونے کے بازو بند اور تمام انگشتریاں اور میں نے اپنا ہار، کانوں کی بالیاں اور اپنی پازیبیں بھی اتار دیں۔ گلاب کا وہ پھول بھی مجھے ان محافظوں کے حوالے کرنا پڑا جو آج رات ہی مجھے ملا تھا۔

”معلوم ہے تم کیا دیکھنے جا رہی ہو بانو؟“ خسرو نے مجھے مخاطب کیا۔ بھاری دروازہ اب رفتہ رفتہ کھلنا شروع ہو گیا تھا۔ مغل بادشاہت کا دل، جو شخص اس کمرے کا مالک ہو گا وہی ہندوستان کا بلا شرکت غیرے آقا ہو گا۔“

وہ اپنے محافظ کی طرف مڑا۔ ”ہمیں کھول دو، کم از کم اس جگہ سے ہم فرار نہیں ہو سکتے۔“

محافظ نے حکم کی تعمیل کی اور ہم دونوں تنہا اندر داخل ہو گئے۔ ایک سپاہی نے مجھے ایک ہنڈا دیا اور دروازہ ہم دونوں کے عقب میں بند ہو گیا۔

میں نے چراغ بلند کیا اور میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔ ایک دیے کے جواب میں لاکھوں دیے جل اٹھے تھے۔ جیسے وہ اس چراغ کے آنے کے منتظر تھے۔ تمام کمرہ جل اٹھا تھا صرف یہی نہیں، ارد گرد بھی کئی کمرے مجھے نظر آئے تھے اور ان کمروں میں بھی اسی طرح کی آگ جل اٹھی تھی۔

”کیا محسوس کر رہی ہو، بانو؟“ شہزادہ خسرو نے جھک کر سرگوشی کی۔

”خوف۔“

”ہاں یہ خوف ہی ہے، جو ہر کوئی پہلی مرتبہ محسوس کرتا ہے۔ یہاں خوف کی لامحدود

”تم ہمارے قریب کیوں آئی ہو، بانو؟“

”میں تنہا تھی شہزادے۔“

”تم صرف خوب صورت ہی نہیں عقل مند اور ہوشیار بھی ہو۔ اگر تم تنہا ہو تو ہم تمہارا ساتھ دیتے ہیں۔ پہلے ارد گرد دیکھ کر یہ بتاؤ کہ کوئی ہمیں دیکھ تو نہیں رہا!“

”کچھ عورتیں موجود ہیں، شہزادے۔“

”ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ وہ اس وقت کیا تبصرے کر رہی ہوں گی۔ یہی کہ ارجمند، شہزادے خسرو کے پاس بیٹھ کر وقت ضائع کر رہی ہے۔ بھلا ایک اندھا شہزادہ اس کے لیے کیا کر سکتا ہے! تم بتاؤ کہ ہمارے باپ کو اس ایرانی بیسوا کی آغوش میں سکون ملا یا نہیں!“

”گستاخی معاف شہزادے۔۔۔ یہ ایک ظالمانہ لفظ ہے بہر حال وہ میری پھوپھو ہیں۔“

”ظلم؟“ شہزادہ طنز سے ہنسا۔ ”ظلم دیکھنا چاہتی ہو تو ہماری آنکھوں میں جھانکو، یہ کیسی

راج نیتی ہے کہ تخت بچانے کے لیے ایک باپ اپنے بیٹے کی آنکھیں لے لے۔“ وہ ایک لمحے کو رک پھر گیا ہوا۔ ”لیکن شاید اس میں ہمارا بھی کوئی قصور رہا ہوگا۔ دوڑ میں اول آنے والے گھوڑے کی طرح ہم نے بھی تیز رفتاری دکھائی اور گھٹنوں کے بل زمین پر آ رہے۔“

وہ پھر خاموش ہو گیا۔۔۔ جیسے اب وہ تنہائی چاہتا ہو، میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ کپڑوں کی سرسراہٹ محسوس کرتے ہی اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

”کہاں جا رہی ہو، بانو؟“

”بہت تاخیر ہو گئی، شہزادے۔“

”آؤ ہم تمہیں دکھائیں کہ مہابلی نے ہمارے ذہن میں کیا خناس بھرا ہے۔ آؤ ہم تمہیں وہ ظلم دکھائیں۔۔۔ جس نے ایک نوجوان، کھلنڈرے اور خوش شہزادے کی زندگی میں زہر گھول دیا۔“

اس نے اٹھ کر اس زنجیر کو جھٹکا دیا جو اس کی کلائی سے بندھی ہوئی تھی اور جس کا دوسرا

سرا محافظ کے ہاتھ میں تھا۔

”ہم نہیں جانتے کہ ہم میں سے کتنا کون ہے۔ یہ صرف ایک محافظ ہے اور اسے ہر حال میں ہماری شہزادگی کا خیال رکھنا پڑتا ہے لیکن ہم زنجیر سے جان نہیں چھڑا سکتے۔ اس لحاظ سے

وجوہات ہیں۔ اس سے کسی شہنشاہ کی روح خریدی جاسکتی ہے۔ یہ سب انسان کو اندھا کرنے اور اسے لالچ اور طمع کی سولی پر چڑھادینے کے لیے بہت کافی ہے۔ یہاں کہیں ایک ہی کھاتہ رکھا ہوگا، یہ ہمیں دو۔“

میں نے چڑے کا مجلد ہی کھاتہ اٹھا کر شہزادے کو تھما دیا۔ وہ بہت وزنی تھا۔
 ”ایک اندھے کو انتخاب کرنے دو۔“ شہزادے نے ہی کھاتہ کھول کر ایک صفحہ میرے سامنے کر دیا۔ ”ہمارے کان بھرو اور اپنی آنکھوں سے ضیافت اڑاؤ۔“
 میں نے انگشت شہادت صفحے پر رکھ کر پڑھنا شروع کر دیا۔
 ”۔۔۔ ساڑھے سات ہزار قیراط موتی، ایک سو نوے سیر زمر، ڈیڑھ سو ہیرے۔۔۔“

میں نے نگاہیں اٹھا کر دیکھا۔ یہ سب لکڑی کے ڈبوں۔۔۔۔۔ صندوقوں اور بڑے بڑے برتنوں میں ایک دوسرے کے اوپر یوں رکھے ہوئے تھے جیسے پھل کی دکان پر انگور پڑے ہوں۔ وہاں صرف موتی، زمر اور ہیرے ہی نہیں تھے بلکہ دنیا جہان کے قیمتی پتھر اور جواہر بھی موجود تھے۔

شہزادے نے پھر صفحے پلٹے اور دوسرا صفحہ میرے سامنے کر دیا۔

میں نے دوبارہ پڑھنا شروع کر دیا۔
 ”۔۔۔ دو سو طلائی خنجر، ہیرے لگے ہوئے۔ سونے سے مزین دو ہزار کاٹھیاں (گھوڑے کی زینیں)۔ دو طلائی تخت ہیرے جڑے ہوئے، تین نفرتی تخت۔۔۔۔“

شہزادے نے پھر صفحہ پلٹ دیا۔

”۔۔۔ پچیس ہزار سیر سونے کی ڈلیاں۔ آٹھ طلائی دیوان، ایک سونقرئی دیوان، ہاتھی کے ایک سو پچاس طلائی جیسے، ہیرے جڑے ہوئے۔۔۔۔“
 ”ہم جانتے ہیں کہ یہ سب پڑھنے کے ساتھ ساتھ سانس لینا کس قدر محال ہے۔“
 شہزادہ خسرو نے تبصرہ کیا اور آگے بڑھ کر ہیروں سے بھرے ہوئے صندوقے میں ہاتھ ڈال کر ہیروں سے چھیڑ چھاڑ۔۔۔ کرنے لگا۔

”ہم نے اس عظیم خزانے کو دس سال کی عمر میں دیکھا تھا، جب پہلی بار مہابلی ہمیں

یہاں لائے تھے۔ اسی لمحے ہمارے دل میں اس کے حصول کا لالچ پیدا ہوا اور مہابلی نے ہمیں یقین دلایا تھا کہ یہ ایک روز تمہارا ہوگا۔ کیا ظلم ہے؟“

بازو سے پکڑ کر وہ مجھے دوسرے کمروں میں لیے پھرا۔ دولت کے اس نظارے سے میرے دل میں طمع پیدا نہیں ہوئی بلکہ مجھے سر میں گرانی محسوس ہونے لگی۔ وہاں بہت کچھ تھا۔ سونے اور چاندی کے شمع دان، سونے کے پیالے، چاندی کی رکابیاں، چاندی کے آئینے، مونگے کے مرتبان، پکھراج، ہاروں اور انگشتریوں سے لبالب بھرے ہوئے بڑے بڑے صندوق، چاندی کے لاکھوں پیالے اور ناتراشیدہ ہیروں کے انبار وہاں موجود تھے۔ سب پر خاک پڑی ہوئی تھی، سب زندگی سے عاری تھے، اگر یہی بادشاہت کا دل تھا تو پھر یہ مردہ تھا۔ یہ دھڑک نہیں سکتا تھا۔ اپنی زمین پر بسنے والوں کو لہو پہنچانے کے۔۔۔ بجائے بے مصرف پڑا تھا۔

”میں اب جانا چاہتی ہوں۔“

شہزادے نے اپنی بے نور آنکھیں مجھ پر مرکوز کر دیں۔ ”یہی وہ سب کچھ ہے جس نے اُس ایرانی بیسوا کو خرید لیا ہے۔“

”جیسے مہابلی نے آپ کو خریدا تھا، شہزادے۔“ میں اپنی پھوپکی دوبارہ توہین پر تملتا اٹھی اور لحظہ بھر کے لیے بھول گئی تھی کہ میرے سامنے کوئی عام شخص نہیں بلکہ ایک مغل شہزادہ ہے جو بے شک معتبوب تھا لیکن اس کی شہزادگی کا احترام ہم پر فرض تھا۔

”ہاں۔“ خلاف توقع شہزادے نے نرمی کے ساتھ مجھ سے اتفاق کیا۔ ”یہی تو وہ سب کچھ ہے جو نظروں میں اجنبیت اور دلوں میں تفریق پیدا کر دیتا ہے بانو۔“

اس نے چلنے کا اشارہ کیا اور ہم دونوں، دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ ایک بار پھر پلٹ کر اس نے اندھیروں میں گھورا۔

”تم نے وہاں سے کچھ اٹھایا یا کسی شے کو چھوا تو نہیں بانو؟“

”نہیں شہزادے۔“

”ناراض مت ہونا، ہماری ہونے والی بھابی، یہ جگہ ہماری کمزوری ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ یہاں سے موتی کا ایک ٹکڑا بھی ادھر ادھر نہ ہو۔ یہ روزانہ پابندی کے ساتھ شمار کیے

1047ھ (1637ء)

ممتاز محل

تاجدار ہندوستان شہنشاہ شہاب الدین محمد شاہ جہاں کے۔۔۔ چہرے سے آج خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ اسے بتایا گیا تھا کہ مقبرے کی بنیادوں کا کام مکمل ہو گیا ہے اور مقبرے کی دیواروں کی چٹائی کا کام شروع ہو گیا ہے۔

شہنشاہ کو آگاہ کیا گیا کہ زمین سے اس کی بلندی دو سو تینتالیس ہاتھ ہوگی جبکہ گنبد کے ساتھ یہ مزید چھپن ہاتھ بڑھ جائے گی۔ عمارت چوکور شکل میں تعمیر ہوگی اور ہر جانب کی لمبائی ایک سو ستاسی ہاتھ ہوگی لیکن چاروں کونوں پر بننے والے چھتیس ہاتھ چوڑے ایوانوں کی تعمیر سے یہ مشن (ہشت پہلو) لگے گی۔ مقبرے کی تعمیر کے لیے زمین کے نیچے جو کھدائی کی گئی تھی۔ وہاں سے لے کر زمین کی سطح تک اس کی بھرائی اور تعمیر میں پانچ برس صرف ہو گئے تھے اور ابھی بلند و بالا دیواروں اور بنیادوں کی چٹائی باقی تھی۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک بار پھر اس شک کا اظہار کیا جا رہا تھا کہ جہنا کی منہ زور لہریں مقبرے کو بہا لے جائیں گی۔

شہنشاہ کی خواہش تھی کہ مقبرہ اس کی زندگی میں مکمل ہو جائے کیونکہ اسے علم تھا کہ ادھر زندگی کی ڈور ٹوٹی اور ادھر مقبرے کی تعمیر کا کام بند ہوا۔ وجہ یہ تھی کہ جس طرح اس نے ارجمند سے پیار کیا تھا اس طرح کسی اور نے نہیں کیا تھا۔

”اسماعیل آفندی، شرف بازیابی چاہتے ہیں جہاں پناہ“۔ عیسیٰ نے شہنشاہ کو آگاہ کیا۔ شہنشاہ نے سر کی جنبش سے اسے پیش کرنے کا حکم دیا فوراً تعمیل ہوئی۔

مقبروں کے ماہر نقشہ جات نے جھک کر تعظیم پیش کی اور مؤدب کھڑا ہو گیا۔ اس کے عقب میں آنے والے غلاموں نے مقبرے کا نمونہ شہنشاہ کے سامنے رکھ دیا جو دو فٹ بلند تھا۔

جاتے ہیں اور اس کی اطلاع براہ راست ظل الہی کو دی جاتی ہے۔ اگر ان میں۔۔۔ کچھ کمی ہو جائے تو ہماری زندگی کے دن کم ہو جاتے ہیں۔ ابھی محافظ ہمیں اور تمہیں تلاشی کے لیے روکیں گے۔“

ایسا ہی ہوا۔ میرے ساتھ ساتھ شہزادہ بھی تلاشی سے نہ بچ سکا۔ اس کے محافظ نے آگے بڑھ کر زنجیر دوبارہ اس کی کلائی میں پہنا دی تھی۔

”ایک بار پھر ہم اپنی ننھی فوج کی تحویل میں ہیں۔“ شہزادے نے دُکھ سے کہا۔ میں خاموش ہی رہی تھی۔

ہم دوبارہ باغ میں لوٹ آئے۔ مجھے دولت کے جہنم سے کھلی فضا اور باغ کی جنت میں آ کر بے حد مسرت ہوئی تھی۔

”کیا مغلوں کی دولت دیکھ کر تمہارے دل میں ہمارے بھائی کی محبت زیادہ بڑھ گئی ہے، بانو؟“

”نہیں شہزادے، میرا محبوب اگر شہزادہ نہ بھی ہوتا تو میں اس سے محبت کرتی۔“

وہ خاموش ہو گیا۔ شاید کچھ اور کہنے کے لیے الفاظ منتخب کر رہا تھا۔

”اندھے پن کے بہت سے فائدے ہیں بانو۔“ بالآخر اس نے خود ہی خاموشی کا قفل توڑا۔ ”چہرے جھوٹ بول سکتے ہیں۔۔۔ آوازیں نہیں۔ ہم تم پر اعتماد کرتے ہیں۔ اس وقت ہمارے قریب کون ہے؟“

”کوئی نہیں شہزادے۔“

”ہم چونکہ دیکھ نہیں سکتے اس لیے توجہ سے سنتے ہیں تم بھی ہمیں توجہ دینا۔۔۔“

ارجمند۔“ شہزادے نے ہاتھ بڑھا کر میری کلائی تھام لی۔ ”تمہارا کیا خیال ہے کہ تمہاری پھوپھوتہائی میں ہمارے محبوب والد سے ارجمند، ارجمند کے نام کی سفارش کرے گی؟۔۔۔ نہیں۔۔۔ ہم تمہیں وہ نام بتاتے ہیں جو وہ ظل الہی کے کان میں شہزادہ خرم کے لیے ڈالے گی۔۔۔ لاڈلی، لاڈلی، لاڈلی۔۔۔“

1048ھ (1638ء)

دیوان خاص میں تشریف فرما شہنشاہ کی نگاہیں بار بار ملکہ ارجمند کے اس چھوٹے سے بد صورت مقبرے سے ٹکرا کر لوٹ رہی تھیں جو عارضی طور پر اینٹوں سے تعمیر کیا گیا تھا۔ شاہ کے دل میں ہوک سی اٹھتی۔ اس کی محبوب اس سے اتنی قریب ہونے کے باوجود اس سے اسی قدر دور تھی جس قدر روز اول تھی۔

ایک لمحے کے لیے شاہ کے دل میں خیال آیا کہ کاش وہ اپنی آنکھوں سے تاج محل کو لمحہ بہ لمحہ دھرتی کے سینے سے بلند ہوتے دیکھتی۔ اسے یاد آ رہا تھا کہ ایک بار اس نے ارجمند سے کہا تھا کہ تمہارے بغیر ہماری زندگی لقا و دق صحرا سے کم نہیں اور اب جب کہ وہ اسے چھوڑ کر افق کے اس پار جا چکی تھی صحرا کا یہ سفر شروع ہو گیا تھا۔ ایک لامتناہی سفر جو کبھی اختتام پذیر نہیں ہوتا تھا۔ وہ۔۔۔ قدرت کی ستم ظریفی پر مسکرا دیا۔ وہ مغلیہ سلطنت کا تاجدار تھا لیکن ننگے پاؤں تنہائیوں کے خارزار پر چل رہا تھا۔ وہ ناخوش اور تنہا تھا۔ کیونکہ اسے خوشیاں دینے والی اور تنہائیاں بانٹنے والی، منوں مٹی تلے جاسوئی تھی۔

شاہ کی نگاہیں دیوان خاص کی دیواروں سے ٹکرانے لگیں۔ یہ وہی ایوان تھا۔ جہاں اس نے سالوں پہلے اپنے والد شہنشاہ جہانگیر سے، ارجمند کے لیے بات کی تھی۔ شہنشاہ جہانگیر اس وقت دختر رز کے نشے میں مدہوش اور خانم مہر النساء اور بعد کی ملکہ نور جہاں کی محبتوں سے پُور تھا اور اس نے نہایت بے دردی کے ساتھ اس کی درخواست مسترد کر دی تھی۔ ان یادوں کو مٹانے کے لیے اس نے دیوان خاص کی سرخ دیواروں کا رنگ تبدیل کرا دیا تھا لیکن یہ ایسی بات نہ تھی جسے کوئی یاد رکھتا بلکہ اس کی اصل یادگار دریا کے کنارے بن رہی

”شباباش“ شہنشاہ کی آواز ابھری۔ ”تم ہماری ہدایات کو بہتر سمجھتے ہو۔“ شہنشاہ نے مردارید کا ہار اتار کر آفندی کی طرف اچھال دیا۔

”غلام، جہاں پناہ کا شکر یہ ادا کرتا ہے۔“

شہنشاہ، دیوان سے اٹھ کر چھوٹے سے مقبرے کا جائزہ لینے میں مصروف ہو گیا۔ آغاز میں شاہ کا چہرہ ہر جوش تھا لیکن پھر ایک دم تفکرات نے آڈیرہ جمایا۔

”یہ بہت خوب صورت ہے آفندی، لیکن ہمیں یہ بتاؤ کہ مقبرہ اپنا وزن کس طرح برداشت کر پائے گا؟ لکڑی کے نمونے میں تو یہ درست ہے لیکن بھاری سنگ مرمر کی صورت میں کیا یہ منہدم نہ ہو جائے گا؟“

”گستاخی معاف، جہاں پناہ، غلام آپ سے اختلاف رائے کا مرتکب ہو رہا ہے، لیکن ایسا نہیں ہوگا۔ آپ کے حکم کے مطابق اسے مطلوبہ بلندی تک پہنچانے کے لیے اس کی دہری بنیادیں اور دھرا فرش بھرا گیا ہے۔ اندرونی بنیادیں صرف بیرونی بنیادوں کو سہارا ہی نہیں دیں گی بلکہ مقبرے کا وزن بھی برداشت کریں گی۔ اس نہج کی اور اس طرح کی عظیم عمارت آج سے قبل کبھی تعمیر نہیں ہوئی ہے، جہاں پناہ۔“

شہنشاہ کے چہرے کی رونق لوٹ آئی۔ وہ نمونے کے بارے میں پوری طرح پُر اعتماد نہیں تھا لیکن یہ کوئی ایسا اہم مسئلہ نہیں تھا۔

”تم بے شک بہت ہوشیار ہو، آفندی۔“ شہنشاہ نے ذومعنی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”ہم نے بھی بہت سے مقبرے ملاحظہ کیے ہیں۔ کیا دہلی میں سکندر لودھی کا مقبرہ اور ہمارے دادا حضور کا مقبرہ اس طرز تعمیر کا شاہکار نہیں ہے۔ ہم بے شک تسلیم کرتے ہیں کہ ایسی بلند عمارت آج سے قبل روئے زمین پر تعمیر نہیں ہوئی لیکن کیا یہ درست نہیں کہ یہ طرز تعمیر اس سے قبل استعمال ہو چکا ہے؟“

”غلام، جہاں پناہ کو جھٹلانے کی تاب نہیں رکھتا۔“ آفندی نے لرزتے ہوئے جواب دیا۔

”میں نے خود ان عمارتوں کا معائنہ کیا ہے لیکن اس مقبرے کو مطلوبہ بلندی تک لے جانے کا صرف یہی ایک ذریعہ تھا۔“

”بہت اچھے۔ ہمیں واقعی دوسروں سے سیکھنا چاہیے۔“ شہنشاہ نے کہا تو اسماعیل آفندی یوں خوش ہو گیا جیسے کسی نے اس کے مردہ جسم میں نئی روح پھونک دی ہو۔

تھی جس کی وجہ سے وہ لوگوں کے ذہنوں میں صدیاں گزرنے کے باوجود زندہ رہتا اور لوگ کہتے کہ۔

”فرمانروائے عالم۔۔۔ عظیم مغلیہ شہنشاہ شہاب الدین محمد شاہ جہاں نے اسے اپنی محبتوں کو امر کرنے کے لیے تعمیر کرایا تھا اور یہاں اس کی محبوبہ ملکہ ارجمند بانو ممتاز محل ابدی نیند سو رہی ہے۔“

ارجمند کی یاد آتے ہی اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

”ہم نے اسے تباہ کر دیا۔۔۔ ہم نے اسے مار ڈالا۔“

الفاظ زیر لب ادا کیے گئے تھے لیکن دیوان خاص میں ایک شخص ایسا بھی موجود تھا جس نے شاہ کے الفاظ کو اپنے کانوں کے پردوں پر محسوس کیا۔۔۔ اور وہ عیسیٰ تھا۔ وہ آگے بڑھ کر شاہ کے روبرو پہنچ گیا۔

”میر بخشی، شرف بازیابی چاہتے ہیں، جہاں پناہ“

شاہ نے سر کی جنبش سے اجازت مرحمت فرمائی اور مالیاتی امور کا وزیر اندر داخل ہوا۔ شاہ کو تعظیم ادا کر کے وہ ایک جانب باادب کھڑا ہو گیا۔ اس کی جہاندیدہ نگاہوں نے شاہ کے چہرے کا ستاپن دیکھ لیا تھا۔ شاہ پر ان دنوں صرف مقبرہ مسلط تھا۔ ایسی حالت میں کچھ کہنا فضول تھا لیکن حالات ایسے تھے کہ میر بخشی انتظار نہیں کر سکتا تھا۔

”غلام کچھ کہنے کی اجازت چاہتا ہے، جہاں پناہ۔“

”اجازت ہے۔“ شہنشاہ نے سر اُپر اٹھایا۔

”جہاں پناہ۔“ میر بخشی چند ثانیے رکا۔ ”دکن کے چوہے اب زیادہ پریشان کر رہے ہیں۔ ہمیں ہر حال میں انہیں دیکھنا ہے۔ مہابلی کا ارشاد ہے کہ ایک شاہ کو ہمیشہ فتوحات پر نظر رکھنی چاہیے لیکن ہم نے ان کے خلاف کچھ نہیں کیا اور وہ دوبارہ سر ابھار رہے ہیں۔“

”تم ہمیشہ حضرت بابر، مہابلی اور پدر بزرگوار کا حوالہ دیتے ہو۔ کیا معاملے کی نوعیت اسی قدر اہم ہے۔“

”جی، جہاں پناہ۔ ہمیں مغل سپاہ جنوب کی سمت روانہ کرنی ہوں گی۔“

”لیکن ہم آگرہ نہیں چھوڑ سکتے۔“

”جہاں پناہ کا اقبال بلند ہو، آپ کی عدم موجودگی میں مغل سپاہ کی سربراہی کا فریضہ کون انجام دے گا؟“ میر بخشی نے ڈرتے ڈرتے دریافت کیا۔ ”جہاں پناہ کی موجودگی ہی ان چوہوں کو خوفزدہ کرنے کے لیے کافی ہوگی۔“

”ہم نے کہہ دیا کہ ہم آگرہ نہیں چھوڑ سکتے۔“ شاہ کی آواز اس بار نسبتاً بلند تھی۔ ”شہزادہ اورنگ زیب، مغل سپاہ کے سالار اعلیٰ ہوں گے۔“

”غلام، جان کی امان پائے تو کچھ عرض کرے۔“

”اجازت ہے۔“

”بہتر یہ ہے کہ افواج کی سربراہی سب سے بڑے شہزادے داراشکوہ کے سپرد کی جائے۔ دکن کے باغی۔۔۔ شہزادہ اورنگ زیب کو بہت نوجوان تصور کریں گے اور ممکن ہے ان پر وہ خوف۔۔۔“

”کیا تمہیں اپنا سر شانوں پر اچھا نہیں لگتا میر بخشی۔۔۔۔“ شہنشاہ نے سرخ آنکھوں سے اُسے گھورا۔ ”تم نے سنا نہیں کہ شہزادہ اورنگ زیب، مغل سپاہ کی قیادت کریں گے۔ دارا ہمارا سب سے پیارا بیٹا ہے وہ ہمارے پاس رہے گا۔ تم نہیں جانتے کہ پیاری ارجمند اسے سب سے زیادہ چاہتی تھی۔ اسے کچھ ہو گیا تو وہ ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گی۔ وہ ہمارے بعد ہندوستان کا ہونے والا بادشاہ ہے۔“ شہنشاہ چند ثانیوں کے لیے خاموش ہوا۔ ”ایک ماہ کے اندر اندر مغل سپاہ کو دکن کی طرف کوچ کرنے کے لیے تیار کرو، اورنگ زیب ہماری نیابت کرے گا۔“

اس کے حوالے کر دی۔

سیتا نے بھی اتنے سارے سکوں کو بڑی حیرت سے دیکھا۔ ”میں نے صرف ایک دن کام کیا ہے صاحب۔“

”مگر یہ سب تمہارے ہیں۔“ محرر نے اس سے نظریں چرائیں ”تم مورتی اچاریہ کی بیوی ہونا؟“

”ہاں۔“

”تو پھر انہیں لے جاؤ۔ یہ تمہارے ان دنوں کی اجرت ہے جن میں تم نے کوئی کام نہیں کیا لیکن کسی اور کو اس کی بھنگ نہیں پڑنی چاہیے۔۔۔“

”آپ بہت اچھے ہو صاحب، لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ میری وجہ سے آپ مشکلات کا شکار ہو جائیں۔“

”میں اپنی حفاظت خود کر سکتا ہوں۔“ محرر نے جواب دیا۔ ”اب تم جاؤ۔“

سیتا نے قدم آگے بڑھا دیے لیکن وہ اتنی خوش تھی کہ بے اختیار ڈگمگا گئی۔

ooo

سیتا ہجوم میں کھڑی اپنی روزانہ اجرت ملنے کی منتظر تھی۔ وہ اب بہت کمزور ہو گئی تھی۔ اس کی نگاہیں ہجوم کے اوپر افق کے۔۔۔ اس پار جمی ہوئی تھیں جہاں اس کا گاؤں واقع تھا اور جہاں وہ اپنی ماں کے ساتھ رہتی تھی۔

وہ اپنے گاؤں کے ایک لڑکے سے منسوب تھی، جسے وہ چاہتی بھی تھی۔ وہ بہت خوب صورت نوجوان تھا اور سیتا کی دلی خواہش تھی کہ ان دنوں کی شادی ہو جائے مگر شاید بھگوان کو یہ منظور نہ تھا۔ ایک روز وہ نوجوان مویشی چرانے گیا اور پھر لوٹ کر نہ آیا۔ سیتا نے اس کا بہت انتظار کیا لیکن جب ہر طرف سے مایوسی کے سائے اسے گھیرنے لگے تو اس کی شادی اسی نوجوان کے چھوٹے بھائی مورتی سے کر دی گئی۔

”تم۔۔۔؟“ محرر کی آواز اس کے خیالات کی دنیا میں در آئی۔

”میں سیتا ہوں“ اس نے چونک کر جواب دیا۔ ”مورتی کی بیوی۔“

اس نے اپنے بھی کھاتے پر نگاہ دوڑائی اور پھر سیتا کا جائزہ لینے لگا۔ مٹی میں لتھری ہوئی عورت کو نظروں میں تو لے لگا۔

”تم نے کچھ دن کام نہیں کیا۔“

”میں اچھی نہیں تھی۔“ سیتا نے جواب دیا۔ ”میرے گھر ایک مردہ لڑکے نے جنم لیا تھا۔“

”اوہ۔“ محرر کے لہجے میں ہمدردی سمٹ آئی۔ اس نے دوبارہ بھی کھاتے کو دیکھا۔

سیتا کے نام کے سامنے کچھ ہدایات درج۔۔۔ تھیں۔ اسے حیرت ہوئی کہ اس عام سی دیہاتی عورت میں کون دل چسپی لے رہا ہے؟ مگر اس حیرت کے باوجود وہ کھاتے پر لکھی ہوئی ہدایات سے سرتابی کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے سر جھٹکا اور پورے مہینے کی اجرت گن کر

مسئلے کا شکار ہوں۔ ان کے پیٹ بھوک سے بلبلارہے ہیں۔۔۔“ اور میرا دل محبت کے درد سے تڑپ رہا ہے۔“

”لیکن آغاچی، تمہاری طرف سے میں بھی تو یہ سب کچھ کر سکتا ہوں۔۔۔“

”ہاں کر سکتے ہو۔“ اس نے مجھ سے اتفاق کیا۔ ”لیکن میں خود کرنا چاہتی ہوں۔ قرآن کا حکم ہے کہ ہم خیرات کریں اور غریبوں کا خیال رکھیں۔“

”لیکن یہ تمام مسلمان تو نہیں۔“

”میں جانتی ہوں۔“ اس نے تیز لہجے میں کہا ”قرآن نے یہ تو نہیں کہا کہ صرف مسلمان کا خیال رکھو۔“ اس نے غور سے میری جانب دیکھا۔ ”کیا یہ درست نہیں۔ عیسیٰ؟“

”درست ہے، آغاچی۔“

”کیا تم واقعی مسلمان ہو؟“

”ہاں، آغاچی۔“

اور وہ کھل کھلا کر ہنس دی جیسے وہ ایک ایسے راز سے واقف رہی ہو جو کبھی منکشف نہ ہو سکتا ہو۔

اچانک ٹاپوں کی آواز سنائی دی تو ہم دونوں نے چونک کر اُدھر دیکھا۔ دو گھڑ سوار ہمیں اپنی جانب بڑھتے نظر آئے۔ گھوڑے اور ان کے سوار گرد میں اٹے ہوئے تھے اور انہوں نے جو کپڑے پہن رکھے تھے وہ میرے لیے اجنبی تھے۔ تنگ پاجامے تھے، عبائیں انہوں نے پاجاموں کے اندر ٹھونس رکھی تھیں۔ اور ان کی ٹانگیں پیروں سے گھٹنوں تک چمڑے میں منڈھی ہوئی تھیں۔ ان کے رنگ بھی صاف تھے اور وہ یوں گھوڑے دوڑا رہے تھے، جیسے گھوڑوں پر نہیں بادلوں پر سفر کر رہے ہوں۔ ان کی نگاہیں ہم دونوں پر جمی ہوئی تھیں۔

”یہ کون ہیں؟“ ارجمند نے دریافت کیا۔

”فرنگی۔“ میں نے آہستگی سے کہا۔

”اوہ! میں نے ان کے بارے میں سُن رکھا ہے۔“ آغاچی نے جواب دیا۔ ”یہ میرے دادا حضور سے تجارتی مراعات کے متمنی ہیں لیکن وہ انہیں پسند نہیں کرتے ان کا کہنا ہے کہ یہ لوگ بڑے مشکل اور پے چیدہ ہیں اور اپنے وعدوں کی پاسداری نہیں کرتے۔ ان

”تم کہاں سوتی ہو؟“ آغاچی نے ایک نوجوان لڑکی سے دریافت کیا جو ایک بازو سے محروم تھی اور جس کے بدن پر لباس کے نام پر چیتھڑے جھول رہے تھے۔

”جہاں بھی جگہ ملے۔“

”آج کل موسم گرم ہے آغاچی۔“ میں نے سرد آواز میں کہا ”ستارے انسان کی بہترین چھت ہے۔ میں خود بھی کئی بار۔۔۔“

”میں تم سے نہیں، ان سے پوچھ رہی ہوں، اور ہاں تمہیں۔۔۔ آزرده ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ صرف میرا حق ہے۔“

”لیکن تم کبھی بکھارا سے استعمال کرتی ہو، آغاچی۔“

وہ ہنس دی۔ سارے فقیر بھی مسکرا دیے۔ جیسے اس نے ان بے وقوفوں کو کوئی لطیفہ سنایا ہو۔ میں نے سوچا کہ اگر میں یہاں نہ ہوں تو یہ خانہ خراب جانے اس نازک سی لڑکی کا کیا حشر کریں۔

”تم جانتے ہو کہ میرے دادا حضور بھی بہت غریب تھے۔“ آغاچی نے مجھے بتایا، کچھ فقیر ابھی باقی تھے لیکن وہ تھک کر ایک پتھر پر بیٹھ گئی تھی۔ ”لیکن میں نے اپنی زندگی میں صرف سہولتیں دیکھی ہیں، دولت دیکھی ہے، غربت کی صرف کہانیاں سنی ہیں، مگر اس کے باوجود میں ان کے لیے افسردہ ہوں۔ ان کی مدد کے لیے کچھ نہ کچھ تو ہونا چاہیے۔“

”یہ جہاں پناہ کی ذمہ داری ہے۔“

”شاہوں اور امیروں کو ایسی چیزیں نظر نہیں آتیں۔“

”تو پھر ان کا کیا درد ہے، آغاچی۔“

”میں نے اکثر وہ کہانیاں سنی ہیں جو دادا حضور بیان کرتے ہیں۔“ آغاچی نے جواب دیا۔ ”ایران سے ہندوستان کے سفر کے دوران جب ان کے قافلے کو لوٹ لیا گیا تو انہیں کئی کئی دن بھوکا رہ کر گزارا کرنا پڑا۔۔۔ لیکن عیسیٰ۔۔۔ جب تک انسان پر خود نہ گزرے، کہانیاں اسے صرف کہانیاں ہی نظر آتی ہیں۔۔۔ تمہارا کیا خیال ہے، محبت کا درد، بھوک کے درد سے مختلف ہے۔۔۔ نہیں۔۔۔ دونوں ہی بدن میں اٹلٹھن پیدا کرتے ہیں۔ دونوں ہی ملتتی ہیں۔۔۔ سائل ہیں۔ دونوں کو ہی مطمئن کرنا پڑتا ہے ان لوگوں کی طرح میں بھی اسی

کی خواہش ہے کہ دنیا ان کی تعظیم کرے۔ ہم ان کی طرف کوئی دھیان نہیں دیں گے۔“

ہاں، آغاچی۔“

وہ پتھر سے اٹھ کر فقیروں کی طرف بڑھی جو صرف تین رہ گئے تھے۔

فرنگی اب ہمارے قریب آ کر رک گئے تھے۔ وہ آپس میں کوئی اجنبی زبان بول رہے تھے اور قہقہے لگا رہے تھے۔ ان کی نگاہیں بہ دستور ارجمند پر جمی ہوئی تھیں جو فقیروں کے کشتول بھرنے میں مصروف تھی۔ پھر ان میں سے ایک نے اپنا گھوڑا میری طرف بڑھایا تو میں بڑھ کر آغاچی اور اس کے درمیان حائل ہو گیا تاکہ اپنی مالکن کو ان کی نگاہوں سے محفوظ رکھ سکوں، لیکن پھر کسی قسم کا کوئی انتباہ دیے بغیر اگلے سوار نے گھوڑا اور آگے بڑھایا اور مجھے دھکادے کر زمین پر گرا دیا۔ گرتے ہی میں نے اپنے خنجر کو تھام لیا تھا۔

ooo

حمیری

ارجمند بانو

عیسیٰ کا انتباہ سنتے ہی میں پلٹی۔

وہ گھوڑے کے بالکل سامنے زمین پر گرا ہوا تھا۔ میں فوراً اس کی مدد کو لپکی لیکن موٹا فرنگی ہمارے درمیان حائل ہو گیا۔ میرے ہاتھ میں اس وقت ایک ڈوئی (چمچہ) تھی، میں نے وہی اس کے گھوڑے کے منہ پر دے ماری اور وہ دو ٹکڑے ہو کر نیچے گر پڑی۔

”دور ہٹ جاؤ۔“ میں نے چلا کر کہا لیکن میرا حکم ماننے کے بجائے وہ دونوں کھل کھلا کر ہنس دیے۔

تمام ملازمین خوف زدہ نگاہوں سے دونوں فرنگیوں کو دیکھ رہے تھے۔ عیسیٰ بار بار اٹھنے کی کوشش کرتا تو اس کے قریب گھوڑے پر سوار فرنگی اسے ٹھوکر مار کر نیچے گرا دیتا۔

”ہمیں تنہا چھوڑ دو۔“

”ہم تمہارا خوب صورت چہرہ دیکھے بغیر نہیں جائیں گے۔“۔۔۔ موٹے فرنگی کے منہ سے مجھے اپنی زبان سن کر بے حد حیرت ہوئی اور پھر اس سے پہلے کہ میں اس کی حرکت کا اندازہ کر سکتی۔۔۔ اس نے آگے جھک کر میرے منہ سے نقاب نوچ لیا۔

شرم کی ایک لہر میرے پورے بدن میں سرایت کر گئی۔ میرا چہرہ ان دونوں کے سامنے کھلا ہوا تھا۔ افسوس کہ مجھے ایسے لوگوں سے نمٹنے کی تربیت نہیں دی گئی تھی کیونکہ میری زندگی حویلی کی اونچی اونچی دیواروں کے حصار میں گزری تھی۔ آج تک کسی اجنبی نے میری جھلک تک نہیں دیکھی تھی اور اس وقت میں دو فرنگیوں کے سامنے بے نقاب کھڑی تھی۔

انہوں نے پھر قہقہہ لگایا اور میری شرم، غصے میں بدلنے لگی۔ ”دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔“

”کیا خوب صورت لڑکی ہے؟“ ان میں سے ایک نے تبصرہ کیا اور پھر زندگی میں پہلی

انسان بھی کس قدر ناشکرا ہے کہ انصاف کے لیے انسان کے سامنے ہی ماتھا ٹیکتا ہے اور اللہ سے اس وقت رجوع کرتا ہے، جب وہ اپنے ہم جنسوں سے مایوس ہو جاتا ہے۔ میں بھی اب اپنے اللہ سے رجوع کر رہی تھی۔

رہ رہ کر مجھے شہزادہ خسرو کا انتباہ یاد آ رہا تھا۔ ہر وقت اس کی سرگوشی سنائی دیتی تھی۔ ”لاڈلی، لاڈلی۔“ یہ نام ایک پتھر کی طرح مجھے لگتا تھا۔ یہ ممکن تھا۔۔۔ کیونکہ شاید پھوپھو جتنی آسانی سے لاڈلی کو اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے استعمال کر سکتی تھیں، مجھے نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ بھتیجی سے زیادہ اپنی بیٹی کے ذریعے، ولی عہد ہند پر حکومت کر سکتی تھیں۔ اس کے باوجود کہ میرے محبوب نے مجھے اپنانے کا وعدہ کیا تھا۔۔۔ میری راتوں کی نیند اور دنوں کا سکون برباد ہو گیا تھا۔ مجھے ہر جانب شہزادہ خسرو کی سرگوشی سنائی دیتی تھی۔

”لاڈلی۔۔۔ لاڈلی۔۔۔ لاڈلی۔۔۔“

پھر مجھے ایک روز شاہی محل طلب کر لیا گیا۔ پھوپھو کا ذاتی خواجہ سر امیر میری طلبی کا حکم لے کر آیا تھا۔ وہ اب امیر ہو گیا تھا۔ اس کی تمام انگلیوں میں سونے، ہیروں، زمرد اور نیلم جڑی انگشتریاں تھیں۔ سونے کا بازو بند بھی اس نے پہن رکھا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ فربہ ہو گیا تھا۔

ملکہ کے خواجہ سراؤں کے سردار کی حیثیت سے وہ خاصے اثر و رسوخ کا مالک تھا۔ بڑے بڑے لوگ اپنی عرضیاں، ملکہ تک پہنچانے کے لیے اسے بیش قیمت تحائف سے نوازتے رہتے اور اس میں کوئی مبالغہ نہیں تھا کہ اس کی ایک سرگوشی کی قیمت ایک لاکھ۔۔۔ اشرافیوں سے کم نہ تھی۔

پھوپھو نے حرم میں اپنے لیے مخصوص حصے کے دروازے پر میرا استقبال کیا۔ خوب

بار مجھے احساس ہوا کہ نفرت کسے کہتے ہیں۔ میں انہیں جان سے مار ڈالنا چاہتی تھی۔ میں نے جھک کر عیسیٰ کا عصا اٹھا لیا اور پوری قوت سے اُسے ایک گھڑسوار کی ٹانگوں پر دے مارا۔ وہ بری طرح بلبلا اٹھا لیکن میں نے ہاتھ نہیں روکا۔ دوسری اور تیسری بار وار کیا تو اس کا گھوڑا بدک کر ڈور ہٹ گیا۔

میں دوسرے کی طرف بڑھی اور اسے مارنے کے لیے عصا اٹھایا لیکن اس نے میرے وار کو ہاتھ پر روکا اور عصا میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے اب وہ یہی عصا مجھ پر برسائے گا۔ ”تم جانتے ہو کہ میں کون ہوں؟“ میں غصے میں دہاڑی۔ ”ملکہ نور جہاں، میری پھوپھو ہیں۔“ موٹے فرنگی نے فوراً عصا چھوڑ دیا۔ یوں لگا جیسے کسی بچھونے اسے ڈنک مارا ہو۔ اس نے کچھ کہے بغیر گھوڑا موڑا اور اسے ایڑ لگا دی۔ دوسرے نے اس کی تقلید کی۔

میں عیسیٰ کی طرف بڑھی، جواب بھی راستے کے وسط میں پڑا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اٹھنے میں اس کی مدد کی اور اس نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔

”کوئی بات نہیں عیسیٰ۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”وہ دو تھے اور تم تنہا۔“

عیسیٰ نے سر نہیں اٹھایا۔

”لیکن تم گھردالوں کو اس واقعے کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں بتاؤ گے۔“ ”مگر آغا جی اگر تم اپنی پھوپھو کو آگاہ کر دو گی تو وہ ظلم الہی کی معرفت انہیں پھانسی پر چڑھا دیں گی۔“

”نہیں“ میں نے سختی سے کہا۔ ”میرے خاندان میں سے کسی کو اس کی بھنک بھی۔۔۔ پڑ گئی تو آئندہ میرے گھر سے نکلنے پر پابندی عائد کر دی جائے گی۔ تم فکر نہ کرو، یہ ایک نہ ایک دن میرے قابو میں ہوں گے۔“

لیکن اپنے کمرے میں پہنچ کر میں بری طرح بلک اٹھی۔ مجھے رہ رہ کر ان فرنگیوں پر غصہ آ رہا تھا، کیا میں کوئی دیوداسی تھی؟ یا کوئی ایسی سستی لڑکی۔۔۔ جسے وہ اپنی خواہشوں کے لیے استعمال کر سکتے تھے؟

میں نے گڑگڑا کر اور ہچکیاں لیتے ہوئے اللہ سے دعا کی کہ وہ مجھے دشمنوں کے شر سے محفوظ رکھے۔

”ہمیں یاد ہے۔“ پھوپو نے جواب دیا اور میں نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ محل میں آتے ہی پھوپو کی بول چال کا انداز بھی بدل گیا ہے۔ پہلے اُن کی زبان سے مہر النساء بولتی تھی اور اب ملکہ نور جہاں الفاظ ادا کرتی تھی۔ ”اور ہم اسے ہر صورت پورا کریں گے مگر تم تو سدا کی بے صبری ہو۔“

”بے صبری؟“ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”میں نے پہلی بار پانچ سال قبل صاحبِ عالم کو مینا بازار میں دیکھا تھا۔“

وہ ہنس دیں۔ ”ہم تو تمہارا امتحان لے رہے تھے۔“

پھوپو نے آگے بڑھ کر تپائی پر پڑے کاغذات اٹھالیے۔

”ہمارے مسائل براہِ راست تم سے متصادم نہیں ہیں۔“۔۔۔ ہندوستان کی ملکہ نے کہنا شروع کر دیا۔ ”فارس کے ساتھ اچھے اور بہتر تعلقات ہمیشہ ظلِ الہی کی خواہش رہی ہے۔ ہم فارس سے کبھی جنگ نہیں چاہتے۔ اسی لیے شہزادہ خرم کی شادی، ایرانی شہزادی سے طے کی گئی تھی لیکن شہزادہ خرم نے ہمیں مطلع کیا ہے کہ ایرانی شہزادی بانجھ ہے اور وہ اسے کوئی ولی عہد نہیں دے سکتی۔ دوسری جانب ایرانی شہزادی نے اس کا ذمہ دار شہزادے کو ٹھہرایا ہے اور الزام لگایا ہے کہ شادی کے بعد سے اب تک ولی عہد نے اپنے حقوق زوجیت ادا نہیں کیے، لیکن ہم بھلا کیسے اس بات پر بھروسہ کر سکتے ہیں؟ چنانچہ اس صورتِ حال میں ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ شادی کا خاتمہ کر دیا جائے۔۔۔ لیکن طلاق نہیں۔۔۔ یہ بات ذہن میں رکھنا۔۔۔ شہنشاہ نے اس کی منظوری نہیں دی۔۔۔ اور اب شہزادی کو واپس فارس بھیجا جا رہا ہے بہت سے تحائف کے ساتھ۔۔۔ پانچ اونٹوں پر طلائی سبکے، آٹھ اونٹوں پر نقرئی سبکے۔ شہنشاہ کی جانب سے جو زرد جواہر اسے دیے گئے ہیں، وہ دو اونٹوں پر لاد کر اس کے ساتھ روانہ کر دیے جائیں گے۔ اس کے علاوہ جتنے تحائف وہ لائی تھی۔۔۔ اسی قدر ہاتھی، گھوڑے اور پانچ سو غلام اس کے ساتھ ہوں گے“ پھوپو آنکھوں پر آ جانے والی بالوں کی لٹ کی اوٹ سے مجھے دیکھ کر مسکرائیں۔۔۔ ”اب تو تم مطمئن ہو۔“

”ہاں، پھوپو۔“ میں بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔۔۔ لیکن اندر سے میرا دل بلیوں اُچھل رہا تھا۔

صورتِ لباس میں وہ ہندوستان کی ملکہ نہیں، جنت کی کوئی اپسر نظر آ رہی تھیں۔ میں فوراً ملکہ کی تعظیم کو جھک گئی۔ ”کنیر۔۔۔ ملکہ ہند کے حضور کورنش بجالاتی ہے۔“

پھوپو نے ایک سریلاتہ قہقہہ لگایا اور مجھے سیدھا کر کے سینے سے لپٹا لیا۔

”تمہارا مقام یہ نہیں ارجمند۔“ پھوپو نے میرا رخسار چومتے ہوئے کہا اور مجھے لے کر اپنے کمرہ خاص میں داخل ہو گئیں۔ کمرے کی خوبصورتی دیکھ کر میری آنکھیں کھل گئیں۔ کاش میرے پاس یہ حُسن، بیان کرنے کو الفاظ ہوتے۔ جتنا کی طرف سے خنک ہوائیں، جالی کے راستے کمرے میں داخل ہو رہی تھیں۔

جالی کے بالکل برابر۔۔۔ چاندی کی ایک تپائی تھی جو، رانا گوالیار نے ملکہ کو تحفے میں پیش کی تھی۔ تپائی پر کچھ کاغذات تھے اور ان کے اوپر مغلوں کی طاقت و عظمت کا واحد نشان، شاہی مہر اُڑا تھا۔

میں نے اس سے قبل شاہی مہر کبھی نہیں دیکھی تھی یہ خاص سونے سے پھیلی ہوئی بالشت کی شکل میں بنی ہوئی تھی۔ اس کے اوپر ایک بڑا سا ہیرا لگا ہوا تھا اور نچلی جانب فارسی الفاظ کندہ تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر مہر اٹھالی۔ وہ خاصی بھاری تھی۔ جب میں نے اسے قریب پڑے موم پر لگایا۔۔۔ تو اُلٹے الفاظ، سیدھے رُخ سے اس پر کندہ ہو گئے۔۔۔

مغلوں کا امتیازی نشان شیر اور اس کے نیچے صرف ایک نام درج تھا جہانگیر۔۔۔

یہ وہ شے تھی، جس میں مغلوں کی تمام تر قوت پوشیدہ تھی اور یہ قوت اس وقت میری پھوپو اور ملکہ ہند کی تحویل میں تھی اور وہیں رہتی تھی۔

پھوپو نے آگے بڑھ کر مہر مجھ سے لے لی۔

”یہ کوئی کھلونا نہیں، ارجمند۔“ انہوں نے مہر کو دوبارہ اس کے صندوقچے میں رکھتے ہوئے کہا اور مجھے وہاں سے دُور ہٹا لے گئیں۔

”تم خوش تو ہو؟“ ذرا دیر بعد انہوں نے مجھ سے دریافت کیا جیسے انہیں خوف ہو کہ میں

شاہی مہر کی بات نہ شروع کر دوں۔

”بہت۔“ میں نے عام سے لہجے میں جواب دیا۔ ”آپ نے مجھ سے ایک وعدہ کیا تھا

پھوپو۔“ میں نے انہیں پرانی بات یاد دلائی۔

میری تو خواہش تھی کہ دن کا سورج غروب ہونے سے پہلے میرے خوابوں کی تعبیر میرے سامنے آ جائے لیکن ہر چیز کے رونما ہونے کا ایک دن معین ہے اور میری زندگی کا یہ معینہ دن پھوپھو کی شادی کے ٹھیک ایک برس بعد آیا۔

پھوپھو نے میری شادی کا جوڑا براہ راست اپنی نگرانی میں تیار کرایا تھا۔ پیلے ریشم کا چوڑی دار پاجامہ، جس پر سونے کے۔۔۔ تاروں کا کام ہوا تھا۔ میرا کرتا بھی اسی رنگ کا تھا اور اس پر بھی سونے کا کام کیا گیا۔ تھا جو پگڑی مجھے پہنائی گئی، اس کے اطراف موتیوں اور یاقوت کی جھالریں تھیں جبکہ وسط میں ایک بڑا سا ہیرا تھا، جو میرے ماتھے پر ایک تیسری آنکھ لگتا تھا۔

شاہی خزانے سے پھوپھو نے میرے لیے کچھ تحائف بھجوائے تھے۔ ایک جڑاؤ ہار تھا جس کی لمبائی میری کمر تک تھی اور بازو کہنیوں سے کلائیوں تک سونے کے کنگنوں سے پیلے ہو رہے تھے۔ پازیبوں میں لاتعداد سونے کی گھنٹیاں لگی ہوئی تھیں جو پیر کی ذرا سی حرکت کے ساتھ بج اٹھتی تھیں۔

اس رات میں سونہ سکی۔ طلوع سحر کے ساتھ ہی ولی عہد سلطنت کی بارات کو ہماری حویلی آنا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میرا محبوب سفید گھوڑے پر سوار ہوگا۔ میں اُسی کے خواب اپنی کھلی۔۔۔ آنکھوں میں سجائے بیٹھی تھی کہ لاڈلی میرے کمرے میں داخل ہوئی۔ میں نے کافی دنوں سے اُسے نہیں دیکھا تھا۔ وہ آہستگی سے میرے قریب بیٹھ گئی اور میرا ہاتھ سہلانے لگی۔

”مجھ سے ناراض ہو، ارجمند۔“ اس نے پیار سے پوچھا۔

”نہیں، لاڈلی۔“

”ہماری ایک بات یاد رکھنا، ارجمند۔“ پھوپھو نے میرے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے کہا۔ ”شادی، گڈے گڑیا کا کھیل نہیں، اگر آدمی ایک گدھا ہے تو اُس کی بیوی کو بھی اسی قدر بوجھ اٹھانا پڑتا ہے جو آدمی نے اپنی پشت پر لا د رکھا ہے۔۔۔ ہم ظل الہی سے مشورہ کر چکے ہیں اور اب راج جوتشی سے بات کریں گے۔ وہ تم دونوں کی شادی کے لیے کسی سعد دن کا انتخاب کرے گا۔“

ooo

تعمیری

چوب داروں کی آوازیں مجھے اپنے کمرے میں سنائی دے رہی تھیں۔
 ”سجدے میں نگاہ رہے، تمام ہوش و خرد، پیش بادشاہ رہے۔۔۔ شاہ گنج فشاں،
 آقائے ولایت ستاں، تاجدار ہندوستان، شہنشاہ نور الدین محمد جہانگیر۔۔۔ صاحب رستم
 رکاب، گوہر عالم تاب، ولی عہد کشور ہند، صاحب عالم، شہزادہ شہاب الدین محمد خرم کی سواری
 جلوہ افروز ہوتی ہے۔۔۔ سجدے میں۔۔۔“

میرے خوابوں کا شہزادہ آن پہنچا تھا۔ شہنشاہ کی سواری آگے اور شہزادہ خرم کی چند قدم
 پیچھے تھی۔ ایک نے گہرے عنابی اور دوسرے نے سرخ رنگ کی عبا زیب تن کر رکھی تھی۔
 دونوں سونے میں نہائے ہوئے لگ رہے تھے۔ شہنشاہ کا گھوڑا جہاں جہاں سے گزرتا تھا۔
 ارد گرد کھڑے لوگوں پر سونے اور چاندی کے سٹکوں کی بارش کرتا جا رہا تھا۔ حویلی کے مرکزی
 دروازے پر پہنچ کر شاہ نے کئی بار ہیرے اور جواہرات بھی لٹائے تھے۔

شہنشاہ اور ولی عہد کے گھوڑوں سے اترتے ہی موسیقی تھم گئی۔ ہر سو خاموشی چھا گئی۔
 شاید لوگوں نے سانس بھی اپنے سینوں میں دفن کر لی تھیں۔ دونوں بادقار انداز میں قدم
 اٹھاتے، اس تخت کی جانب بڑھ گئے جو ان کی نشست کے لیے تیار کیا گیا تھا۔

پھر مجھے بھی وہاں لے جایا گیا۔ ایک طرف تمام مرد تھے اور دوسری جانب خواتین،
 جب کہ درمیان میں مولوی حضرات بیٹھے ہوئے تھے۔ میں اپنے محبوب کو دیکھ سکتی تھی لیکن میرا
 چہرہ چونکہ بھاری نقاب میں پوشیدہ تھا اس لیے شہزادے کی نگاہیں محض نقاب سے ٹکرا کر لوٹ
 جاتی تھیں۔

مولوی صاحب نے قرآنی آیات کی تلاوت شروع کر دی اور پھر نکاح کے کلمات ادا
 کرنے کے بعد چمڑے اور سونے کی ایک مجلد کتاب شہزادہ خرم کی طرف بڑھادی۔ شہزادے

”تم ہو۔۔۔ میں جانتی ہوں۔“ اس نے میرے کندھے پر سر رکھ دیا۔ ”لیکن اس میں
 تمہارا کوئی قصور نہیں، مجھے بہت بعد میں پتا چلا کہ تم مجھ سے ناراض ہو، ورنہ میں تمہیں آکر منا
 لیتی، ہم تو بچپن کے ساتھی ہیں، ارجمند اور بچپن کے ساتھی اک دوسرے سے جدا تھوڑی ہوا
 کرتے ہیں۔ میں نے جب امی سے دریافت کیا کہ تم مجھ سے ناراض کیوں ہو؟ تو انہوں نے
 مجھے بتایا کہ تمہارے ذہن میں یہ بات ہے کہ میں شہزادہ خرم سے شادی کرنے جا رہی
 ہوں۔“ اس نے کندھے اچکائے۔ ”لیکن میں اسے ایک ظالمانہ مذاق سے زیادہ اہمیت نہیں
 دیتی، ارجمند۔“

”یہ مذاق نہیں تھا، لاڈلی، اگر یہ ممکن ہوتا تو پھوپھو ضرور کر گزرتیں۔“ میں کچھ اور بھی کہنا
 چاہتی تھی لیکن پھر یہ سوچ کر رک گئی کہ میری باتوں سے لاڈلی مزید پریشان ہو جائے
 گی۔ ”تم مجھ سے ملنے آؤ گی نا؟“

”اکثر، ارجمند۔“ اس نے میرے گلے میں بائیں حائل کر دی۔ ”اب تو تم بھی محل
 میں آ جاؤ گی، امی کو تو سلطنت کے کاموں سے ہی فرصت نہیں ملتی اور میں تمہارہ جاتی ہوں۔“
 ”کیا پھوپھو، میری شادی سے خوش ہیں؟“

”کیوں نہیں۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”تمہاری خوشی امی کی خوشی ہے۔ تم کل ولی عہد
 سلطنت کی بیوی بننے والی ہو اور ایک دن ملکہ ارجمند بن جاؤ گی۔“
 ”ہاں۔“ میں نے جواب دیا اور دل ہی دل میں ”انشاء اللہ“ کا اضافہ کر لیا لیکن اس
 سوچ کے ساتھ، کہ جب یہ دن آئے گا تو پھوپھو کا رد عمل کیا ہوگا؟

ooo

نے اپنا نام تحریر کیا اور پھر وہ کتاب میرے سامنے لائی گئی۔ میں نے اپنے محبوب کے نام کے نیچے اپنا نام تحریر کر دیا۔

فوراً ہی میری والدہ آگے بڑھیں اور مجھے سہارا دے کر حویلی کے اندر لے آئیں۔ میں نے پلٹ کر دیکھا، سب سے پہلے میری پھوپھو اور ملکہ نور جہاں نے بڑھ کر شہزادے کو گلے لگایا اور شادی کی مبارک باد پیش کی۔ پھر میری دادی حضور اور دوسری خواتین آگے بڑھی تھیں۔

پھوپھو نے شادی کی خوشی میں محل کے سبزہ زار پر ایک۔۔۔ زبردست جشن کا اہتمام کیا۔ رقص سرود کی محفل رات ڈھلے تک جی رہی۔ کچھ دیر تک میں بھی محفل میں شریک رہی لیکن پھر پھوپھو، والدہ اور دوسری خواتین مجھے وہاں سے اٹھالے گئیں اور کنیروں کے حوالے کر دیا۔

غسل کے بعد مجھے شادی کی نئی پوشاک پہنائی گئی اور پھر حجلہ عروسی میں تنہا چھوڑ دیا گیا۔ مجھے کپڑوں کی گٹھڑی بنے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ آہٹ ہوئی۔ میں نے سر جھکائے جھکائے کن انکھیوں سے دیکھا۔ میرے خوابوں کا شہزادہ بالآخر تعبیر بن کر میرے سامنے تھا۔ آج میں نے ہمیشہ کی طرح اپنے شہزادے کو اٹھ کر تعظیم دینے کی کوشش نہیں کی۔

”آخر کار۔“ شہزادے نے جھک کر میرے کان میں سرگوشی کی۔ ”ہماری محبت آج ہماری ہوگئی۔“

”اور آپ میرے ہو گئے۔“ میں نے لب کشائی کی۔

میری نگاہیں صاحبِ عالم کی نگاہوں سے ٹکرائیں اور واپسی کا راستہ بھول گئیں۔

”کیا تم خوش ہو، جان خرم؟“

”کیا میری نگاہیں اچھی گواہ ثابت نہیں ہو رہیں شہزادے؟“ میں نے پلکیں جھپکائے بغیر کہا۔ ”کیا آپ کو ان نگاہوں میں محبتوں کے روشن چراغ محسوس نہیں ہو رہے؟ یا آپ کو خوشی نہیں ہوئی۔“

”بہت ہماری محبوب، بہت۔۔۔ ہم بھی تو تمہیں بہت چاہتے ہیں۔۔۔ اور آج دوبارہ اس وعدے کو دہراتے ہیں کہ تمہیں خود سے کبھی الگ نہیں ہونے دیں گے۔ جہاں ہم

جائیں گے وہاں تم جاؤ گی اور جہاں تم رہو گی، وہاں ہمیں اپنے پہلو میں موجود پاؤ گی۔“

”آپ کو اپنا وعدہ یاد ہے نا، شہزادے؟“

”ہاں۔“

”تو پھر میں آپ کو، یہ وعدہ توڑنے کی اجازت کبھی نہیں دوں گی، میرے محبوب، زندگی کی آخری سانسوں تک۔“

”ہمارا وعدہ، ہماری زندگی کی سانسوں کے ساتھ ساتھ چلے گا، جان خرم۔“

ooo

کبھی نہیں بھولتا۔ ہم اس جنگ پر اکٹھے جائیں گے۔ میں نے آپ کی جدائی کے بہت صدمے جھیلے ہیں، آپ کی یاد میں بہت برس تنہا گزارے ہیں لیکن اب مجھ میں تنہائیوں کے عذاب سہنے کی تاب نہیں، صاحب عالم۔“

”مگر اب صورت حال کسی قدر مختلف ہے، ارجمند، جلد ہی تم بھی ماں بن جاؤ گی اور پھر اب تم ہماری بیوی ہو۔ یہاں تمہارا پورا خاندان ہے، اس محل میں تمہاری توقیر ہے۔“

”لیکن آپ تو نہیں ہوں گے صاحب عالم، آپ کی کمی اور کوئی پوری نہیں کر سکتا۔ بے شک محل میں میری توقیر ہے، لیکن شہزادی کہلانے سے میری وہ محرومیاں ختم نہیں ہو جائیں گی جو آپ کی عدم موجودگی سے پیدا ہوں گی۔“

”تم تو سدا کی بے وقوف ہو۔“ میرے سر تاج نے قہقہہ لگایا ”دیکھو، میواڑ کے راجپوت اس وقت سے ہمارے خلاف نبرد آزما ہیں جب سے ہمارے آباؤ اجداد نے اس سر زمین کو فتح کیا ہے حتیٰ کہ مہابلی بھی انہیں شکست نہیں دے سکے۔ انہوں نے چتوڑ کو تباہ ضرور کیا لیکن راجپوتوں کو سرنگوں نہ کر سکے۔ یہ بد خیال ہمارے ذہن میں ہے کہ وہ ناقابل شکست ہیں اور تم ضد کر رہی ہو کہ اس ناقابل تسخیر مہم میں ہمارے ہم رکاب ہوگی۔“

”آپ کو یہ کلام بد اپنے لبوں سے نہیں نکالنا چاہیے شہزادے۔“ میں نے اپنے محبوب کا سر دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر جھکایا اور صاحب عالم کی آنکھوں میں جھانکنے لگی۔ ”آپ شاہ جہاں ہیں، فاتح عالم، میں جانتی ہوں کہ آپ میواڑ کے راجپوتوں کے خلاف فتح کے جھنڈے گاڑیں گے۔“

صاحب عالم مسکرا دیے لیکن ان کی آنکھوں میں شکوک کے سائے رقصاں تھے۔ میں نے غیر یقینی کی یہ کیفیت پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

”آپ کا کیا خیال ہے کہ پھوپھو نے آپ کو مغل سپاہ کی قیادت کیوں کرسوچی ہے؟“

”اس لیے کہ ہم ولی عہد ہیں اور ظل الہی اب کسی جنگ میں شریک نہیں ہونا چاہتے۔“

”نہیں، ظل الہی صرف وہ کرتے ہیں جو پھوپھو انہیں کہتی ہیں۔ ظل الہی، دیوان خاص میں بے شک شہنشاہ ہوتے ہیں لیکن کمرہ خاص میں یہ کردار پھوپھو ادا کرتی ہیں کیونکہ مہرازا انہی کے قبضے میں ہے۔ میں نے خود اسے ان کے کمرے میں دیکھا ہے۔“

1023ھ (1613ء)

”تم ہمارے ساتھ نہیں جا سکتیں۔“

”میں جاؤں گی، صاحب عالم، آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا اور میں ہندوستان کے ہونے والے بادشاہ کو اپنا وعدہ توڑنے کی اجازت ہرگز نہیں دوں گی۔“

ہم دونوں اس وقت شاہی محل کے لان میں چاندنی رات کا نظارہ لے رہے تھے۔ شادی کے بعد سے یہ ہمارا معمول تھا۔ محل کے دوسرے افراد، خادماں اور کنیریں، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہماری بڑھتی ہوئی محبت دیکھ کر حیران تھیں۔ ہم ہر آنے والی ساعت ایسے گزارتے تھے کہ دیکھنے والی نظریں۔۔۔ پہلے گزری ہوئی ساعت کو فراموش کر دیتی تھیں۔ پہلی رات سے اب تک ہم زیادہ دیر کے لیے ایک دوسرے سے جدا بھی نہیں ہوئے تھے۔

”آخرا اب آپ مجھ سے کیا ہوا وعدہ کیوں کر فراموش کر رہے ہیں؟“ میں نے اپنے محبوب کی گود میں سر رکھ کر پوچھا۔

”خود پر نظر ڈالو، ارجمند، یہ بڑی سخت جاں مہم ہے اور ہم اس مہم پر تمہیں لے جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔“

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ مہم کتنی سخت ہے یا راستہ کس قدر کٹھن ہے، میں صرف آپ کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔“ میں نے ضد کی۔

”لیکن ارجمند، تم ماں بنے۔۔۔“

”آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا صاحب عالم۔ ایک شوہر، اپنی بیوی سے کیا ہوا وعدہ

شہاب الدین

میواڑ کی ریاست، جے پور سے پرے، آگرہ کے مغرب میں چھ سو کوس کے فاصلے پر تھی۔ راجپوتوں کی سرزمین نامہوار علاقوں، صحراؤں اور جنگلوں سے اٹی ہوئی تھی اور میرے خیال میں یہ کسی۔۔۔ مصرف کی نہیں تھی۔ کبھی کبھی میں یہ سوچتا تھا کہ وہ آخر کس شے کا دفاع کرتے ہیں؟ کیا صحراؤں اور پہاڑوں کا؟ لیکن یہ بات بھی تاریخ کے صفحات پر موجود تھی کہ راجپوت سپاہ وہ واحد قوت تھی جنہوں نے عظیم مغلوں کی مخالفت کبھی ترک نہیں کی۔ بہت سے راجپوت سردار مفتوح قرار پائے اور متعدد سے رشتے دار یاں استوار کر کے انہیں دوست اور حلیف بنایا گیا لیکن کچھ سر پھرے اب بھی باقی تھے۔

میواڑ کے رانے ایک سو سال سے برسرِ پیکار تھے۔ پچاس سال قبل مہابلی نے رانا میواڑ کے آہنی قلعے کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی، جو ایک پہاڑی پر استادہ تھا لیکن اس مہم میں سیاست استعمال کرنے کے باوجود انہیں ایک برس لگا تھا۔ رانا خود تو۔۔۔ محاصرے سے قبل ہی فرار ہو گیا لیکن بچے کچھے راجپوتوں نے مہابلی کے دانت کھٹے کر دیے۔

راجپوتوں نے مہابلی کو اتنا زچ کیا کہ وہ اپنے عہد میں پہلی اور آخری مرتبہ ضبط کا دامن ہاتھوں سے چھوڑ بیٹھے اور فتح کے بعد انہوں نے مدافعیین کے قتل عام کا حکم صادر کر دیا۔ راجپوت عورتوں نے بھی شجاعت کے ناقابل یقین جوہر دکھائے اور جب ان کی شکست قریب پہنچی تو انہوں نے خود کو مغلوں کے حوالے کرنے کے بجائے چٹاؤں میں کود جانا اپنے لیے زیادہ مناسب تصور کیا۔

صرف یہی نہیں کہ راجپوت محض مغلوں سے لڑتے تھے۔ لطف کی بات یہ تھی کہ جب وہ

”ہم نے سنا تھا کہ شاعی مہر، حرم میں ہے، لیکن ہمارے خیال میں یہ محض افواہ تھی۔“
”یہ افواہ نہیں، حقیقت ہے شہزادے، پھوپھو کو مجھ سے بہتر آپ نہیں سمجھتے، ہماری شادی ان کی زندگی کی بڑی شکست ہے لیکن انہوں نے جنگ ختم نہیں کی بلکہ اب وہ دوسرے رخ سے اس لڑائی کو اپنی خواہشوں کے مطابق لڑنا چاہتی ہیں۔ انہوں نے جرنیل مہابت خان کے ہوتے ہوئے آپ کو مغل سپاہ کا سالار اعظم منتخب کیا ہے کیونکہ وہ آپ کی صلاحیتوں کا امتحان لینا چاہتی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ آپ جنگ ہار جائیں گے۔ ان کے ذہن میں یہی ہے کہ اگر اکبر اعظم، راجپوتوں کو شکست نہیں دے سکے تو نو جوان ولی عہد، جس کے پاس جنگی تجربہ بھی نہ ہونے کے برابر ہے۔ کس طرح یہ معرکہ سر کرے گا۔“

”ہم یہ موقع کبھی نہیں کھوئیں گے، جانِ خرم۔“ شہزادے کا انداز ایک دم بدل گیا۔
”ایسا ہی ہوگا، میرے سرتاج، اگر ایسا نہ ہوا تو پھوپھو کی۔۔۔ طاقت مزید بڑھ جائے گی لیکن اگر کامیاب ہوئے تو بھی بازی انہی کے ہاتھ رہے گی۔ وہ اپنے انتخاب کی صلاحیتوں پر ناز کریں گی، لیکن آپ سے قدرے محتاط ہو جائیں گی۔“
میں خاموش ہو گئی کیونکہ میری درخواست، شہزادے کے دل سے نہیں دماغ سے تھی اور مجھے یقین تھا کہ فیصلہ میرے حق میں ہوگا۔ مہابلی کو جرنیل بیرم خان، جیسے اتالیق کی رہنمائی حاصل رہی تھی لیکن میرے محبوب کو کوئی بیرم خان، نہیں ملا تھا۔ اُن کی اتالیق، شیر، محبوبہ، بیوی اور دوست صرف میں تھی۔ میں سمجھتی تھی کہ انہیں اس وقت صرف دوست کی ضرورت تھی اور دوست ہر حال میں کامیاب ہوتے ہیں۔

ooo

پہلے سے جا کر ارجمند کے آرام کا بندوبست کرتا۔ خود ارجمند بھی اس کا بے حد خیال رکھتی تھی۔ اس کے ساتھ بھی اس کا تعلق خاطر اسی طرح کا تھا جس طرح میرے ساتھ تھا۔ ہم آگرہ سے بیس دن کی مسافت پر تھے اور پوری سپاہ بیرم کے نقش قدم روندتی چلی آرہی تھی۔

مجھے اطلاع ملی کہ رانا میواڑ نے ہماری آمد کی خبر پا کر خود کو اودے پور کے قلعے میں محصور کر لیا تھا۔ مجھے اس کی توقع تھی کیونکہ وہ ہم سے کھلے میں مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں پاتا تھا۔

اس رات میں ہزاری سرداروں کے اجلاس سے فارغ ہو کر تنہا اپنے خیمے میں بیٹھا آئندہ کی حکمت عملی پر غور کر رہا تھا کہ عیسیٰ نے اندر داخل ہونے کی اجازت طلب کی۔ رات کے اس پہر اس کی آمد خالی از علت نہیں تھی۔ اس کے چہرے سے بھی مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی اچھی خبر نہ لایا ہو۔ تمام تر بہادری کے باوجود بھی میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

”کیا خبر لائے ہو عیسیٰ؟“

”شہزادی کی حالت تشویش ناک ہے، صاحبِ عالم۔“

ooo

ہمارے خلاف برسرِ پیکار نہیں ہوتے تھے تو ایک دوسرے کے خلاف تلواریں سونت کر میدان میں کود پڑتے تھے اور پھر وہ گھمسان کارن پڑتا تھا کہ دھرتی کا سینہ ان سے پناہ مانگتا تھا۔ میرے ساتھ جو مغل سپاہ روانہ کی گئی تھی، اس میں ایک لاکھ پچاس ہزار سپاہی شامل تھے۔ ان میں سے پچھتر ہزار شہسوار تھے، جو گھوڑوں اور ہاتھیوں پر سوار تھے۔ ان میں راجپوت، جاٹ، مغل اور ڈوگرے شامل تھے۔ باقی ماندہ پیادے اور بندوچی تھے۔ چالیس توپیں، ہاتھیوں پر لدی ہوئی تھیں۔ اس مغل سپاہ کے علاوہ ہزاروں کی تعداد، عقب میں سفر کر رہی تھی جن کے ذمے فوج کے کھانے پینے اور دوسری ضروریات کا خیال رکھنا تھا۔ پچاس ہزار اناج کے چھکڑے اور بے حساب حلال جانور اور مرغ، مغل افواج کے ہمراہ تھے۔ اگر کہیں رُسد کم پڑ جاتی تو نزدیکی دیہات سے ضرورت کی اشیاء خرید لی جاتیں لیکن ڈاکے نہیں ڈالے جاتے تھے، کیونکہ ہم صرف فاتح ہی نہیں حکمران بھی تھے۔

میرے آگے آگے پانچ ہاتھی چل رہے تھے جن پر مغلوں کے امتیازی نشان استادہ تھے۔ ہمیشہ کی طرح میں خود، بیرم پر سوار تھا۔ میں نے اپنے ہاتھی کا نام مہابلی کے عظیم جرنیل کے نام پر رکھا تھا۔ وہ ایک ایسا بہادر اور نڈر جانور تھا جسے میں نے آج تک کسی سے خوفزدہ ہوتے نہیں دیکھا تھا۔

بیرم کی ایک جانب سائیس میرا گھوڑا لیے چل رہا تھا۔ اس کا نام شیطان تھا۔ میرے پیچھے ارجمند کا رتھ تھا جس میں چار افراد کے سونے کی گنجائش تھی لیکن صرف اس کی ملازمہ معنیوم النساء خانم اس کے ساتھ سفر کر رہی تھی۔ رتھ کے بالکل ساتھ شاہی طبیب وزیر خان کی سواری تھی جس کے خیال میں ارجمند کو اس حالت میں محل میں رہنا چاہیے تھا۔

اس بات کا مجھے خود احساس تھا لیکن ساتھ ہی مجھے اس کی وفاداری اور محبت پر فخر بھی تھا۔ اس کے بجائے کوئی دوسری عورت ہوتی تو وہ محل کے جھروکے سے ہاتھ ہلا کر اپنے شوہر کو خدا حافظ کہتی اور ابھی گھوڑے کی ٹاپوں کی گرد بھی نہ بیٹھی ہوتی کہ اپنی مصاحب خواتین کے ساتھ چہلوں میں مصروف ہو چکی ہوتی۔

ارجمند کا ذاتی ملازم عیسیٰ بھی اس کے ہمراہ تھا۔ وہ بے چارہ سارا دن اسے آرام پہنچانے کے مختلف طریقوں میں مصروف رہتا۔ وہ سپاہ کے آگے سفر کرتا تھا اور قیام کی جگہ

”بادب، با ملاحظہ، ہوشیار۔۔۔ صاحب مہر و تاجور، زینبدہ ہفت کشور، شاہ گیتی نور، تاجدار سلطنت ہندوستان، شہنشاہ ابو مظفر شہاب الدین محمد شاہ جہاں۔۔۔ در بچہ دیدار میں جلوہ افروز ہوتے ہیں۔۔۔ بادب۔۔۔“

تمام امراء بادب کھڑے ہو گئے اور جونہی شاہ نے بارگاہ سے باہر قدم رنجہ فرمایا وہ سب تعظیم کے لیے جھک گئے۔ شاہ نے جب در بچہ دیدار میں اپنی مخصوص نشست سنبھالی تو صرف عیسیٰ آگے بڑھا۔ باقی تمام امراء، طلائی زنجیر کے اس پار ہنوز بادب کھڑے تھے۔ شہنشاہ نے معمول کے مطابق پہلے مقبرے کو دیکھا اور پھر دُور دُور تک پھیلے ہوئے ہجوم پر نگاہیں گاڑ دیں۔

”یہ اپنے کام پر حاضر کیوں نہیں؟“ شہنشاہ نے دریافت کیا۔

اسی وقت زنجیر عدل کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔

”یہ تمام بھوکوں مر رہے ہیں، جہاں پناہ۔“ عیسیٰ نے ادب سے کہا۔

لیکن شہنشاہ کو آج عیسیٰ کا انداز کچھ اجنبی محسوس ہوا۔ شاہ نے غور سے عیسیٰ کا جائزہ لیا۔ کتنے سالوں سے وہ ایک دوسرے کو جانتے تھے؟ اُسے شاہی مینا بازار میں ارجمند کے پہلو میں کھڑا اس کا ذاتی ملازم آج بھی یاد تھا لیکن اب وہ لڑکا، اس شخص میں کہیں کھو گیا تھا۔ اب ان کی زندگیاں ایک دوسرے سے منسلک ہو کر رہ گئی تھیں۔ عیسیٰ نے جان سے بڑھ کر اس کی خدمت کی تھی لیکن کبھی اپنی حدود سے تجاوز نہیں کیا تھا۔ اس نے کبھی ارجمند کا نام نہیں لیا تھا۔ یوں جیسے اس نے اپنی آقا زادی کو فراموش کر دیا ہو۔ وہ اسے آغاچی کہتا تھا۔ شاہ نے اس کے علاوہ اس کے منہ سے کوئی اور نام نہیں سنا تھا۔ ”آغاچی۔“ شاہ نے زیر لب دہرایا۔ ”خاتون، بانو۔۔۔“ لیکن شاہ کے لہجے میں وہ محبت نہ آ سکی، جو عیسیٰ کے لہجے میں ہوتی

”وہ کیسی خاتون تھیں؟“

”ایک بہادر خاتون۔“ طیب نے فخر سے جواب دیا اور آگے بڑھ گیا۔ ظاہر ہے وہ ملکہ عالیہ کے بارے میں زیادہ بات نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن مورتی کو اس بات کی بے حد خوشی تھی کہ اُس نے ایک ایسے آدمی سے بات کی ہے جس نے ملکہ کو دیکھا تھا۔ آج سے پہلے اُس کے خیال میں بہادری صرف بھیم اور ارجن جیسے لوگوں کی میراث تھی لیکن اب اس نے بہادروں کے نام میں ایک نام اور شامل کر لیا تھا اور وہ نام تھا۔۔۔ ملکہ ارجمند ممتاز محل۔

ooo

حمیری

تھی۔۔۔ کیا عیسیٰ اس سے پیار کرتا تھا۔ ممکن ہے۔ وہ اس سے ارجمند کے بارے میں بات کرنا چاہتا تھا، تاکہ اس کے بارے میں عیسیٰ کے خیالات بھانپ سکے لیکن شاہ نے کبھی اس ارادے کو عملی جامہ نہ پہنایا۔

”ہمارے انصاف کو کس نے پکارا ہے، عیسیٰ؟“ زنجیر عدل کی گھنٹیاں اب بھی بج رہی تھیں۔

”ان فاقہ زدگان نے، جہاں پناہ۔“

”ان کی فریاد، مابدولت کے حضور پیش کی بجائے۔“

وزیر نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ اُس نے زنجیر کے ساتھ بندھی تحریری فریاد اوپر کھینچ لی اور پھر اجازت طلب نگاہوں سے شاہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

عیسیٰ نے عرضی وزیر کے ہاتھ سے لے لی اور شہنشاہ کا اشارہ پا کر اُسے پڑھنا شروع کر دیا۔

”عزت مآب، جنت مکانی، ستاروں کے جھرمٹ کے دوسرے آقا، عظیم مغل، شاہوں کے شاہ، فاتح عالم، ظل الہی، شہنشاہ شہاب الدین محمد شاہ جہاں، ہم آپ کے غلام، جان کی امان پاتے ہوئے آپ سے فریاد کرتے ہیں کہ گزشتہ دو برسوں سے مغلیہ سلطنت کی حدود میں بارش نہیں ہوئی۔ دریا خشک ہو گئے ہیں اور فصلیں جل گئی ہیں۔ ہمارے کھانے کو کچھ نہیں، سو ہم زندہ نہیں رہ سکتے، ہمارے بچوں کے منہ میں کئی دن سے ایک کھیل بھی اڑ کر نہیں گئی۔ وہ موت کے اندھیرے گڑھوں کے کنارے پر ہیں۔ ہم شہنشاہ کے اقبال کی سر بلندی کی دعا کرتے ہیں اور التجا کرتے ہیں کہ ہمیں اناج فراہم کیا جائے۔“

شہنشاہ نے عرض سن کر نیچے دیکھا۔ سارے ہجوم کی نگاہیں اوپر نگران تھیں۔ شاہ کو ان کی آنکھوں میں بھوک کا سمندر ٹھانھیں مارتا نظر آیا۔

”ان کی قیادت کون کر رہا ہے؟“

”کوئی مورتی نام کا شخص ہے، جہاں پناہ۔“ عیسیٰ نے عرضی پر نگاہیں دوڑاتے ہوئے

جواب دیا۔

”یہ کون ہے؟“

”ایک سنگ تراش، جہاں پناہ، جس نے آغاچی کے مقبرے کی جالی کا نمونہ بنایا تھا۔“

”تمہیں کیسے علم ہوا؟“

”میں جانتا ہوں۔ جہاں پناہ۔“

شہنشاہ خاموش ہو گیا۔ ذرا دیر وہ خلاؤں میں گھورتا رہا اور پھر اس نے عیسیٰ کو قریب ہونے کا اشارہ کیا۔

”تمہاری آقا زادی اس صورت حال میں کیا کرتی؟“ شاہ نے سرگوشیاں انداز میں دریافت کیا۔

”وہ انہیں غلہ فراہم کرتی، جہاں پناہ۔“

”تو پھر انہیں اناج فراہم کیا جائے۔“ شاہ جہاں نے فوراً حکم دیا۔ ”اناج گاہوں کے منہ کھول دیے جائیں۔ شاہی خزانے۔۔۔ پر سے پہرہ ہٹا لیا جائے۔۔۔ انہیں ہر قیمت پر اناج فراہم ہونا چاہیے اور جن لوگوں نے اناج ذخیرہ کر رکھا ہے، ہم ان کے لیے موت کی سزا کا اعلان کرتے ہیں۔“

ooo

جڑے۔۔۔ بوئے تھے۔

”تم مورتی ہو۔ جس نے شہنشاہ کے حضور فریاد پیش کی تھی؟“ آنے والے نے دریافت کیا اور مورتی فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”جی بہادر۔“ مورتی نے آہستگی سے جواب دیا لیکن اندر سے وہ بری طرح کانپ اٹھا تھا۔ یہ سچ ہے کہ ان کی فریاد کے نتیجے میں فاقہ زدگان وانا ج حاصل ہو گیا تھا لیکن شاید شاہ کو اس کی یہ ادا نہ بھائی تھی اور اب اسے سزا دینے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔

”میرے ساتھ آؤ؟“

”کک۔۔۔ کہاں۔۔۔؟“ مارے خوف کے مورتی کی زبان لڑکھڑکی رہی تھی۔

”سوال مت کرو۔“ اجنبی نے اسے ڈانٹا۔ ”تم جانتے نہیں میں شہنشاہ کا وزیر ہوں،

میرے ساتھ چلو۔“

ooo

1051ھ (1640ء)

مقبرہ بلند ہو رہا تھا۔ ہر سورج کے غروب ہونے کے ساتھ دنیا کی یہ عظیم عمارت کچھ اور طلوع ہو چکی ہوتی۔ ہنرمندوں کی۔۔۔ بیک وقت دو کمزیاں کام میں مصروف تھیں اور یوں کام کر رہی تھیں جیسے ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی خواہش مند رہی ہوں۔ مقبرے کے ساتھ ساتھ بیس کوس طویل ایک بند بھی بنایا جا رہا تھا جو ممتاز آباد کے پتوں بچ گزرتا تھا۔ اس کی چوڑائی ایک چھکڑے کے برابر تھی لیکن بعض ایسے مقامات بھی بنائے گئے تھے کہ دو چھکڑے پہلو پہ پہلو گزر سکتے۔

ہاتھی اور نیل، سنگ مرمر کے بڑے بڑے ٹکڑے اس پتے پر لے آتے۔ پتے پر موجود مزدور، سنگ مرمر کے ٹکڑے کے گرد رسی لپیٹتے اور پھر اسے چرخی کی مدد سے اوپر کھینچ لیا جاتا جو عمارت کی بلندی سے ہمیشہ ایک ہاتھ کی بلندی پر۔۔۔ نصب کی جاتی تھی۔ چرخی کے دوسرے سرے پر بندھی رسی کو ہاتھی کے ہودے کے ساتھ باندھا جاتا تھا اور وہی سنگ مرمر کی سل کو کھینچتا تھا۔

دوسری طرف مورتی بھی اپنے کام میں مصروف تھا۔ تین سال گزر گئے تھے لیکن اب تک وہ ایک ہاتھ لمبی اور ایک ہاتھ چوڑی جالی ہی تراش پایا تھا۔ ہر روز طلوع آفتاب کے ساتھ وہ اپنا کام شروع کرتا اور اس وقت تک مصروف رہتا جب تک ہر طرف۔۔۔ تاریکی اپنا راج نہ جمالیتی۔

اس روز مورتی اپنا کام ختم کر کے اٹھنے ہی والا تھا کہ اس نے کن اکھیوں سے قیمتی جوتے پہنے ہوئے ایک شخص کو اپنے قریب آتے دیکھا۔ اس کی پوشاک میں زرو جواہر

دھوپ سے اس کی رنگت سیاہی مائل ہو گئی تھی اور جنگ کے سخت دنوں نے اس کے بدن میں بھی سختی بھر دی تھی۔ وہ پہلے سے دبلا لیکن مضبوط دکھائی دے رہا تھا۔ اُس نے اپنے بھائی کا جائزہ لیا جو شہنشاہ کے پہلو میں براجمان تھا لیکن خود اُسے شاہ نے بیٹھنے کی اجازت نہیں دی تھی۔

”شاباش۔“ شہنشاہ کی آواز ابھری۔ ”ہم تمہیں دکن کی مہم میں کامیابی پر مبارک باد پیش کرتے ہیں۔“

”ہم جہاں پناہ کے شکر گزار ہیں۔“ شہزادہ اورنگ زیب کے انداز سے بھی تقاخر جھلک رہا تھا۔

”تم ہمیں خاصے پر اعتماد دکھائی دیتے ہو، حالانکہ یہ بات تاریخ کے صفحات پر محفوظ ہے کہ جب بھی ہم نے دکن کے بایسوں سے منہ موڑا، انہوں نے تلوار اٹھالی۔“

”اب ایسا نہیں ہوگا، جہاں پناہ۔“

”سبب؟“

”اس لیے کہ ہم اورنگ زیب ہیں۔“ شہزادے نے اعتماد سے جواب دیا۔ ”وہ جانتے ہیں کہ معافی اور رحم کے الفاظ ہماری لغت میں موجود نہیں۔“

شہنشاہ نے اپنے تیسرے بیٹے کا بہ غور جائزہ لیا جو شاہین سے مشابہ تھا۔

”اس کا مطلب ہے کہ ہمیں ان پر مستقل نگاہ رکھنی ہوگی۔“ شاہ نے خیال ظاہر کیا۔

”صرف یہی نہیں جہاں پناہ، ہمیں سختی سے ان پر حکمرانی بھی کرنی ہوگی۔“

”بہت خوب۔“ شہنشاہ نے اطمینان سے کہا۔ ”تو پھر ہم تمہیں دکن کا صوبے دار مقرر کرتے ہیں۔“

”کرتے ہیں۔“

اورنگ زیب نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں۔ اس نے اپنے بھائی کی طرف دیکھا جو خاموش تھا لیکن اس کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔ اسے اپنا یہ تقرر پسند نہیں آیا تھا کیونکہ وہ آگرہ سے دور رہنے کا خواہش مند نہیں تھا۔ دربار سے دوری کا مطلب، تمام قوتوں سے دوری تھی اور یہ دوری شہزادے کے لیے کسی طور بھی سودمند ثابت نہیں ہو سکتی تھی۔

”جہاں پناہ کے احکامات کی تعمیل ہمارا فرض اولین ہے۔“ شہزادہ جھک کر تعظیم

شہنشاہ شاہ جہاں، ایوان خاص میں اپنے دیوان پر نیم دراز تھا۔ دائیں جانب خوشبو میں نہائی ہوئی خوب صورت کنیریں تھیں جو اس کا سر سہلار ہی تھیں جبکہ بائیں جانب اُس کا محبوب فرزند شہزادہ داراشکوہ براجمان تھا۔ اس کی موجودگی ہمیشہ شہنشاہ کو تسکین دیتی تھی کیونکہ اس کی آنکھیں ملکہ ارجمند سے بہت ملتی جلتی تھیں۔

”تم ہم سے کیا توقع رکھتے ہو، شہزادے؟“

”کچھ نہیں، جہاں پناہ، انہوں نے اپنی عبادت کے لیے ایک مندر تعمیر کیا ہے اور میری خواہش ہے کہ اسے منہدم کرنے کے احکامات واپس لے لیے جائیں۔“

”لیکن وہ ہم سے اجازت تو طلب کرتے؟“

”وہ اس گستاخی پر جہاں پناہ سے معافی کے طلب گار ہیں۔“ داراشکوہ نے سرخم کرتے ہوئے کہا۔

شہنشاہ اپنے فرزند کے انداز پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ ”ہم اپنے محبوب فرزند کی خواہش پر ممتاز آباد کے مکینوں کو ان کی پسند کی عبادت کرنے کی اجازت مرحمت فرماتے ہیں۔“

شہزادے نے دوبارہ جھک کر تعظیم دی۔ اسی وقت وزیر نے اندر داخل ہونے کی اجازت طلب کی۔ شہنشاہ کے سر کی جنبش کے ساتھ ہی وہ اندر داخل ہوا اور کورنش بجالایا۔

”شہزادہ اورنگ زیب، شرف بازیابی کی اجازت چاہتے ہیں، جہاں پناہ۔“

”اجازت ہے۔“ شہنشاہ نے پات در آوز میں کہا اور چند ہی ثانیوں بعد شہزادہ

اورنگ زیب اندر داخل ہوا۔ ایک لمحے کے لیے اس نے دروازے پر رک کر حاضرین کا جائزہ لیا اور پھر شہنشاہ کی تعظیم کے لیے جھک گیا۔

بجای لایا۔

شاہ نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اسے گلے لگالیا لیکن اس میں کسی محبت کو دخل نہیں تھا بلکہ شاہ نے صرف ایک رسم پوری کی تھی۔

”آؤ دیکھو۔“ شہنشاہ نے بالکل سامنے جھروکے سے نظر آنے والے مقبرے کی محراب کی سمت اشارہ کیا۔ ”ہمیں بتاؤ کہ یہ تمہیں کیسا لگتا ہے؟“

”ہم اسے ملاحظہ کر چکے ہیں، جہاں پناہ۔“ شہزادے نے جواب دیا لیکن اُس کے انداز میں بیزاری تھی۔

”ہم نے ایک اور مقبرہ تعمیر کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔“ شہنشاہ نے اپنے فرزندوں کو مخاطب کیا۔ ساتھ ہی اس نے تاج محل کے بالمقابل دریا کے پار اشارہ کیا تھا۔ ”مجوزہ مقبرہ، ہو بہو تاج محل سے مشابہ ہوگا۔ دونوں میں صرف ایک فرق ہوگا کہ دوسرا مقبرہ سنگ سیاہ سے بنایا جائے گا اور دونوں کے مابین دریا پر چاندی کا ایک پل ہوگا۔“

”میں تصور کی آنکھ سے اسے تعمیر ہوتا دیکھ رہا ہوں۔“ شہزادہ دارا شکوہ نے تبصرہ کیا۔

شاہ نے داد طلب نگاہوں سے شہزادہ اور نگ زیب کی طرف دیکھا لیکن شہزادہ تعظیم ادا کر کے روانگی کی اجازت کا منتظر تھا۔

000

1023ھ (1613ء)

شہاب الدین

وہ اوپر ہمارے منتظر تھے اور ہم نیچے ان کا انتظار کر رہے تھے۔ ہمیں شہر کا محاصرہ کیے پورا ایک ماہ ہو گیا تھا۔ اودے پور کی سپاٹ اور ڈھلوان زمین پر بنی فصیل ہمارے سامنے تھی۔ ایک راستہ لکڑی کے بھاری بھر کم دروازے کی طرف جاتا تھا لیکن فصیل یا دروازے کی طرف بڑھنے والا ایک قدم، موت کے کچھ اور نزدیک ہو جاتا تھا۔

کبھی کبھی کوئی جزائل فائر ہو جاتی۔ کوئی آدمی گر کر مر جاتا۔۔۔۔۔ ہماری جانب سے اس کے جواب میں توپ کا ایک آدھ گولہ داغ دیا جاتا لیکن بات بنتی نظر نہ آتی تھی۔

”صاحب عالم اگر مناسب سمجھیں تو مہابلی کے طریقہ کار پر عمل کریں۔“ بالآخر میرے مشیروں نے مشورہ دیا۔ ”سبات کی تعمیر شروع کر دی جائے۔“

”ہم مہابلی نہیں، خرم ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔۔۔۔۔ ”سبات کی تعمیر میں ایک برس لگ سکتا ہے اور اس کی تعمیر کا طلب اتنے ہی لوگوں سے ہاتھ دھونا ہے جتنے مہابلی نے سبات پر قربان کر دیے تھے۔“

سبات، زمین کی سطح پر بنائی جانے والی ایک سرنگ ہوتی تھی جو کسی شیش ناگ کی مانند رفتہ رفتہ بلند ہو کر قلعے کی فصیلوں تک پہنچتی تھی۔ اسے لکڑی، اینٹوں اور گارے کی مدد سے بنایا جاتا تھا اور یہ اتنی چوڑی ہوتی تھی کہ بیک وقت دس گھڑ سوار اس میں۔۔۔۔۔ گھوڑے دوڑا سکیں۔ اس کی چھت میں مضبوط قسم کی لکڑی استعمال کی جاتی تھی اور اس پر جزائل کی گولی اثر انداز نہیں ہوتی تھی۔ یہ تو صحیح ہے کہ اس کے اندر فصیل کی۔۔۔۔۔ طرف بڑھنے والے لوگ

محفوظ رہتے تھے لیکن اسے تعمیر کرنے والے کھلے میں ہوتے تھے اور قدرتی طور پر وہ دشمن کا نشانہ بنتے تھے۔ مہابلی نے جو سب سے تعمیر کرائی تھی اس کے دوران ایک سال تک مسلسل، روزانہ بیس آدمی دشمنوں کا نشانہ بنے تھے اور کم از کم میں اتنے بڑے نقصان کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

میرے مشیر اور سالار، نامراد واپس چلے گئے لیکن ان کی سرگوشیاں میرے کانوں تک ضرور پہنچیں کہ۔ ”شہزادہ عالم ایک بہتر سالار نہیں ہیں۔“ میں نے ان سرگوشیوں پر کوئی توجہ نہ دی اور انتظار کرتا رہا جو طویل بھی ثابت ہو سکتا تھا اور مختصر بھی، کیونکہ میری معلومات کے مطابق قلعے کے محصورین کے پاس کم از کم ایک سال کا اناج ذخیرہ تھا۔

ooo

ارجمند بانو

میرا محبوب جب بھی دن بھر کا تھکا ماندہ میرے پاس آتا تو میں ہر طرح سے اسے آرام اور سکون پہنچانے کی کوشش کرتی۔ میں اپنی باتوں، اداؤں اور لگاؤ سے شہزادے کی دن بھر کی تھکن دھو ڈالتی تھی۔ وہ کچھ دیر تو بے چین رہتے لیکن پھر مجھ میں کھو کر سب کچھ بھول جاتے۔

شاہی خیمے، اودے پور کے قلعے سے تین کوس کے فاصلے پر ایک جھیل کے کنارے لگائے گئے تھے۔ ہمارے ارد گرد ایک محل کے پرانے کھنڈرات تھے جس کی اونچی اونچی دیواریں کسی خراب دانت کی طرح کرچی کرچی ہو کر ٹوٹ رہی تھیں۔ رات کو جب ہم دونوں تنہا ہوتے تو جنگلی جانوروں کی بڑی بھیانک آوازیں سنائی دیتیں۔ میں اگر کبھی گھبراتی تو شہزادہ مجھے اپنے حصار میں چھپا کر گویا ان سے محفوظ کر دیتا۔

محبت کی یہ چنگاریاں صرف میرے دل میں ہی نہیں تھیں بلکہ صاحب عالم بھی مجھے بے تحاشا چاہتے تھے۔ ان کی اسی محبت کی وجہ سے میں بہت جلد صحت یاب ہو گئی تھی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ صحت یابی کی جانب گامزن تھی۔ بس افسوس اس بات کا تھا کہ میں صاحب عالم کی خواہشوں کے مطابق انہیں ننھا شہزادہ نہ دے سکی تھی۔ یہی سوچ، آنسو بن کر میری آنکھوں سے بہہ نکلی تھی۔

”تمہارے آنسوؤں سے خرم کو تکلیف ہوتی ہے ارجمند۔“ صاحب عالم نے اپنے ہاتھ کی پشت سے میرے آنسو صاف کیے۔ ”ہمیں اس بات کا۔۔۔ دکھ نہیں کہ تم ماں نہیں بن سکیں۔ ہمیں دکھ صرف تمہارے آنسوؤں کا ہے، جانے والے پر گریہ کناں ہونے کے

سنائی دے رہی تھیں۔

وہ رانا کا برہمن پردھان تھا۔ اسے میرے حکم پر فوراً میرے سامنے پیش کیا گیا۔ اس نے مجھے تعظیم دی اور ایک جانب مؤدب کھڑا ہو گیا۔

”قاصد سے آنے کی وجہ دریافت کی جائے۔“ میں نے اپنے مشیروں کو حکم دیا لیکن اس کی ضرورت پیش نہیں آئی، پردھان نے خود ہی بولنا شروع کر دیا۔

”والہی اودے پورسودیا نے صاحب عالم کے حضور نیک تمناؤں کا پیغام بھجوایا ہے۔“ پردھان نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہنا شروع کیا۔ ”لیکن سوسودیا کو اس بات پر حیرت ہے کہ شہزادے نے اردگرد کے علاقے کو تاخت و تاراج کر دیا ہے، مہابلی نے۔۔۔“

”تم مہابلی سے نہیں، خرم سے مخاطب ہو۔“ میں نے اسے ٹوک دیا۔ ”اگر تم سوسودیا کی جانب سے ہتھیار ڈالنے اور شہر کے دروازے کھولنے کا پیغام لائے ہو تو درست ورنہ ہمارے پاس فضول باتوں کے لیے وقت نہیں۔“

”سوسودیا کا یہی پیغام ہے، صاحب عالم۔“ پردھان نے سر جھکا کر کہا۔ ”ساتھ ہی ہم یہ درخواست کرنے کی گستاخی بھی کریں گے کہ راجپوتوں کے قتل عام کو بند کر دیا جائے۔“

میرے رواں رواں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی لیکن میں نے اسے دبا دیا۔

”سوسودیا کو ہمارا پیغام دو کہ وہ خود ہماری خدمت میں حاضری دے، وہ اگر چاہے تو ایک مسلح افراد اپنے ہمراہ لاسکتا ہے۔“

پردھان، کورنش بجالایا اور میں نے اسے جانے کا حکم دے دیا۔ اس کے جاتے ہی میں نے عرضی نوایں کو طلب کر لیا۔ میں جلد از جلد اپنی ارجمند کے پاس جا کر اسے یہ خوش خبری سناتا چاہتا تھا۔

عرضی نوایں فوراً حاضر ہو گیا۔

”شہنشاہ ہند کو پروانہ ارسال کر دیا جائے کہ میواڑ فتح ہو گیا ہے۔“

ooo

ارجمند بانو

صاحب عالم نے اپنے جوتے اتارے اور آہستگی کے ساتھ نرم گدیوں پر بیٹھ گئے۔ احساس تفاخر ان کے چہرے پر چمک رہا تھا۔ میری نظریں اپنے محبوب کے چہرے سے چپک کر رہ گئی تھیں۔ کچھ دیر بعد بڑی مشکل سے میں نے اپنی نظریں اٹھائیں اور دیوان عام کا جائزہ لیا۔ درباری امراء میرے شہزادے کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے ایک دوسرے کے اوپر گرے جا رہے تھے۔ شہزادہ خسرو۔۔۔ شہزادہ پرویز اور شہزادہ شہریار، اپنے بھائی کے عقب میں مؤدب کھڑے تھے۔ مجھے ان کے چہروں پر عجب سے۔۔۔ تاثرات نظر آ رہے تھے۔ میں نے مبین پردے کو سختی سے اپنی گرفت میں لے لیا، شاید یہ ان کے جذبات کے خلاف میرے غصے کا اظہار تھا۔

”ہمیں معلوم تھا کہ شہزادہ کامیاب کامران لوٹے گا۔“ میرے پہلو میں بیٹھی سلطنت مغلیہ کی محبوب ملکہ اور میری پھوپھو، نور جہاں نے میری توجہ اپنی جانب مبذول کرائی۔ ”وہ ایک عظیم شہزادہ ثابت ہوگا۔“ پھوپھو نے مجھے اپنے ساتھ لپٹا لیا جیسے یہ کامیابی میری مرہون منت رہی ہو۔

”ہم ہمیشہ اس کی مدد کریں گے ارجمند، شہزادے کو ہمارا پیغام دینا کہ وہ ہم پر بھروسہ کر سکتا ہے۔“

میں خاموش رہی کیونکہ مجھے علم تھا کہ ملکہ کے لہجے کی۔۔۔ تبدیلی صرف فتح میواڑ کی وجہ سے تھی۔ میں دوبارہ دیوان عام کی طرف متوجہ ہو گئی۔

چاندی کے کٹہرے کے ساتھ ایک حیران و پریشان نوجوان کھڑا تھا۔ وہ رانا میواڑ کا چھوٹا بیٹا تھا۔

”کیا وحشی نوجوان ہے۔“ پھوپھو نے ہنستے ہوئے تبصرہ کیا تو میں نے پہلی مرتبہ غور سے اس کا جائزہ لیا۔

”ہمیں میواڑ کی فتح سے بے حد مسرت ہوئی ہے کیونکہ جہاں مہابلی کو کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ وہاں ہمیں فتح نصیب ہوئی ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ کاش مہابلی یہاں تشریف فرما ہوتے اور اپنے مبارک ہاتھوں سے ہماری فتح کے جشن کا آغاز کرتے۔“

”ظل الہی کو میواڑ کی فتح مبارک ہو۔“ درباری امراء نے بیک زبان ہو کر مبارک باد پیش کی۔

”راجپوتانہ کے باسیوں کو خبر ہو کہ ہم اپنی حدود میں امن وامان سے رہنا چاہتے ہیں۔ اسی لیے ہم نے رانا میواڑ سے۔۔۔“ ظل الہی نے ایک لمحے کے لیے رک کر کرن سنگھ کی طرف دیکھا۔ وہ شاہ کی تعظیم کے لیے جھک گیا لیکن صحیح طور پر کورنش ادا نہ کر سکا، ظل الہی نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے اپنا کلام۔۔۔ جاری رکھا۔۔۔ ”سوائے اس کے بیٹے کو کچھ عرصہ اپنے پاس بطور مہمان ٹھہرائے جانے کے، اور کسی شے کا مطالبہ نہیں کیا۔ رانا بدستور اپنی ریاست کا حاکم رہے گا، ہم صرف اس سے اپنے لیے وفاداری اور محبت۔۔۔“

”نتھنے مت بھلاؤ۔“ پھوپھو شاید بدستور میرے چہرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ ہم سب جانتے ہیں کہ یہ شرائط و ضوابط، شہزادہ خرم نے طے کی ہیں اور وہی میواڑ کا فاتح ہے لیکن اگر ظل الہی اپنے حوالے سے کوئی بات کہہ رہے ہیں تو اسے برداشت کرو۔“

”ظل الہی کو کم از کم میرے شوہر کا نام تو لینا چاہیے!“ میں نے تنک کر جواب دیا۔

”۔۔۔ ہمیں ولی عہد سلطنت اور اپنے بیٹے شہزادہ۔۔۔ خرم پر فخر ہے۔“ فوراً ہی ظل الہی کی آواز مجھے سنائی دی ”کہ اس نے من و عن ہماری ہدایات پر عمل کیا۔ ہم آج سے شہزادے کے مرتبے میں دس ہزار ذات اور پانچ ہزار سواروں کا اضافہ۔۔۔“

”اب تو تم خوش ہونا؟“ پھوپھو نے دخل اندازی کی۔ ”آج کے بعد تم خاصی امیر ہو جاؤ گی۔“ میں مسکرا دی۔

”ہم نے کہا تھا نا کہ ظل الہی تمہارے شہزادے کو فراموش نہیں کریں گے۔“

”۔۔۔ ہم آج سے ولی عہد سلطنت کو سرخ شاہی چتر استعمال کرنے کی اجازت بھی مرحمت فرماتے ہیں۔“ ظل الہی کا آخری جملہ میں نے سنا اور خوشی سے میرا رواں رواں کانپ اٹھا۔ آج میرے محبوب کی ولی عہد سلطنت کی حیثیت مسلم ہو گئی تھی۔

اس کی پگڑی راجپوتوں کے خالص انداز میں سر سے لپٹی ہوئی تھی۔ اس کی پوشاک بھی مغلوں جیسی نہیں تھی جبکہ چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے وہ اس درباری رکھ رکھاؤ اور مغل شاہ سے سخت خوف زدہ ہو۔ اس کا نام کرن سنگھ تھا جسے رانا میواڑ نے اپنی شکست کے اعتراف کے طور پر مغل دربار سے وابستہ کر دیا تھا۔

میواڑ سے اجیر تک کے سفر کے دوران، میں نے کرن سنگھ کو بہت معصوم پایا تھا۔ وہ بڑی معصومیت سے شہزادہ خرم سے مختلف معاملات کے بارے میں دریافت کیا کرتا، لیکن اجیر پہنچتے ہی اس کی معصومیت خوف میں بدل گئی تھی۔

اس وقت ہم اجیر میں تھے۔ یہاں پہنچنے کے بعد کچھ عرصہ ہمیں شہنشاہ ہند کی آمد کا انتظار کرنا پڑا تھا۔ اسی انتظار کے دوران اللہ تعالیٰ نے ہمیں پہلے بچے سے نوازا۔ اس کی آمد سے میرا وہ دکھ زائل ہو گیا۔

جونو ماہ پہلے ہوا تھا۔ ہم نے اللہ سے بیٹے کی دعا کی تھی لیکن اس نے ایک بیٹی عطا کی۔ ہم نے اس کا نام شہزادی جہاں آراء تجویز کیا تھا۔

شہنشاہ جہانگیر کو میرے شہزادے کی فتح کی اس قدر خوشی ہوئی تھی کہ انہوں نے فتح کا دن آگرہ کے بجائے اجیر آکر منانے کا فیصلہ کیا جو میواڑ سے کوئی سو کس کے فاصلے پر تھا۔ مہابلی نے اجیر میں ایک چھوٹا سا قلعہ تعمیر کرایا تھا لیکن شہنشاہ نے قلعے میں قیام کے بجائے شاہی خیمے جھیل ساگر کے کنارے نصب کرنے کا حکم صادر فرمایا اور اب ہم خیموں کے اسی شہر کے دیوان عام میں شاہ کے منتظر تھے۔

داخلی دروازے پر چوبدار نمودار ہوا اور اس نے ظل الہی کی آمد کا اعلان کیا۔

”عہدے میں نکال دیا ہے۔ تمام ہوش و خروش بادشاہ رہے۔۔۔ صاحب کاہ وقت۔ شاہ خزانہ، منج ظل الہی، عالم پناہ شہنشاہ نور الدین محمد جہانگیر جوہ افروز ہوتے ہیں۔“

حاضرین دربار مہربان ہو گئے۔ شہزادہ خرم بھی اپنی نشست سے کھڑے ہو گئے۔ جو نہی ظل الہی اندر داخل ہوئے، تمام افراد نے بیک وقت جھک کر انہیں تعظیم دی اور اس وقت تک گردنیں جھکا کر کھڑے رہے، جب تک ظل الہی تخت پر فروکش نہیں ہو گئے۔ انہوں نے سامنے۔۔۔ موجود ولی عہد کی طرف مسکرا کر دیکھا اور پھر حاضرین محفل سے مخاطب ہوئے۔

”مبارک ہو، ارجمند۔“ پھوپو نے اسی مسکراہٹ کے۔۔۔ دوران کہا۔ ”ہمیں تو یہ شہزادہ خرم جیسا لگتا ہے۔ ظل الہی کو اس خبر سے بے حد خوشی ہوئی ہے اور انہوں نے ایک تحفہ بھیجا ہے۔“

کنیروں نے سونے کا بنا ہوا ایک بھاری جھولا لا کر سامنے رکھ دیا۔ اس کی اونچائی ایک لمبے آدمی کے قد کے برابر تھی۔ دونوں اطراف دو ہاتھی بنے ہوئے تھے جنہوں نے جھولے کو سنبھال رکھا تھا۔

پھوپو نے پہلے میرے رخسار کو بوسہ دیا پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد ہچکچا کر دارا کا ماتھا چوما اور بچے تلے قدم اٹھاتی باہر نکل گئیں۔

آہ! ہماری حرکات، الفاظ سے زیادہ ہم سے دعا کرتی ہیں۔

○○○

عیسیٰ

میں دارا سے یوں محبت کرتا تھا جیسے وہ میرا اپنا بیٹا رہا ہو۔ میں جب فارغ ہوتا تو پاگلوں کی طرح اسے تلاش کرتا۔ اگر شہزادہ آغاچی یا صاحب عالم کی گود میں ہوتا تو میں خاموشی سے ادھر ادھر کھسک لیتا لیکن اگر وہ کسی کنیر کی گود میں ہوتا تو میں اسے چھیننے میں قطعی تاخیر نہ کرتا۔ مجھے وہ ہو بہو آغاچی کی تصویر دکھائی دیتا تھا۔

شہزادہ دارا کے ساتھ ساتھ آغاچی کو دیکھ کر میری سرسٹیں دوچند ہو جاتی تھیں کیونکہ وہ بے انتہائی خوش تھی۔ خاص طور پر جب وہ صاحب عالم کے پہلو میں ہوتی تو خوشی اس کے چہرے پر چاندنی کی طرح چمک رہی ہوتی۔ اس کی کوشش ہوتی کہ وہ زیادہ سے زیادہ وقت اپنے شوہر کی معیت میں گزارے۔

لیکن شاید ملکہ عالیہ کو دونوں کا یہ پیارا اور ساتھ پسند نہ آیا کیونکہ جب دکن میں ایک بار پھر باغیوں نے سر اٹھانا شروع کیا تو ملکہ نے چپکے سے ظل الہی کے کان میں صاحب عالم کا نام لے دیا تھا۔

○○○

1025ھ (1615ء)

شہزادی جہاں آراء کی پیدائش کے وقت میں خاصے کرب میں مبتلا رہی تھی لیکن جب شہزادہ دارا شکوہ نے جنم لیا تو مجھے اذیت کا کوئی احساس نہیں تھا، یا شاید اپنے محبوب کو ملنے والے مقام کی خوشی میں مجھے اذیت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ جب میں نے پہلی بار دارا شکوہ کو دیکھا تو بے اختیار اس کی آنکھیں چومنے پر مجبور ہو گئی کیونکہ اس کی آنکھیں ہو بہو مجھ سے مشابہ تھیں۔

شہزادہ دارا شکوہ کی پیدائش کے بعد سب سے پہلے جو ہستی میرے پاس پہنچی وہ صاحب عالم کی تھی۔ ایک بیٹے کا باپ بننے کی خوشی، ان کے چہرے سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ ”یہ تمہاری طرح دل فریب ہے۔“ شہزادے نے اپنے بیٹے کو گود میں اٹھاتے ہوئے کہا۔

”بیٹے دل فریب نہیں، خوب صورت ہوا کرتے ہیں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”چلو، یوں ہی سہی۔“ صاحب عالم نے کہا۔ ”دل فریب ہے یا خوب صورت، یہ ہمارا وارث ہے، ہمارا ولی عہد ہے۔“ انہوں نے اپنا منہ دارا کے ننھے سے کان کے ساتھ لگالیا۔ ”ایک دن تم عظیم مغل بادشاہ بنو گے، ہمارے بیٹے۔“

ان کے جانے کے بعد پھوپو میری خبر گیری کو آئیں۔ ان کا سپاٹ چہرہ دیکھ کر مجھے زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔ پھوپو نے ایک نظر دارا کو دیکھا اور اپنے مخصوص اظہار الفت کے طور پر اس کا رخسار چٹکی میں لے کر دبا دیا۔ شہزادہ دارا بری طرح چیخ اٹھا لیکن وہ مسکرا دیں۔

برہان پور، دریائے تپتی کے کنارے واقع اسی اجنبی وادی کا ایک شہر تھا۔ دوسرے کنارے پر سورت واقع تھا اور دونوں کے درمیان دریا میں کشتیاں چلتی تھیں، دریا محل کی۔۔۔ دیواروں سے ٹکراتا ہوا بہتا تھا اور اس کی منڈیر سے دھند میں لپٹا ہوا آسّر گڑھ کا عظیم پہاڑی قلعہ نظر آتا تھا جو ہندوستان کا بلند ترین قلعہ تھا۔ ہموار زمین سے اس کے مرکزی دروازے تک پہنچنے کے لیے ایک دن کی چڑھائی طے کرنی پڑتی تھی۔ مہابلی کو یہ قلعہ فتح کرنے میں دو سال لگے تھے۔

برہان پور کا محل، اینٹوں کی بنی ہوئی نسبتاً ایک چھوٹی۔۔۔ عمارت تھی۔ حضرت ہمایوں، مہابلی، اکبر اعظم، ظل الہی اور اب ولی عہد سلطنت سمیت تمام مغل بادشاہوں نے یہاں قیام کیا تھا اور یہیں سے ان شہزادوں کے خلاف جنگ کا آغاز کیا تھا جو وقفے وقفے سے علم بغاوت بلند کرتے رہتے تھے۔

یہیں برہان پور میں ہی شہزادی ارجمند نے چوتھے بچے کو جنم دیا جس کا نام شہزادی روشن آراء تجویز کیا گیا۔ شہزادی۔۔۔ روشن آراء، شہزادہ شجاع سے صرف نو ماہ چھوٹی تھی۔ اب شاہی جوڑے کے چار بچے تھے لیکن شہزادہ دارا سے شہزادی ارجمند جو محبت کرتی تھی وہ کسی اور کے حصے میں نہ آسکی تھی۔

”عیسیٰ! تم میدان جنگ میں میرے محبوب کے ہمراہ جاؤ گے۔“ شہزادی ارجمند نے مجھے حکم دیا۔ ”تم دشمنوں سے اس کی حفاظت کرنا۔“

”حفاظت تو اوپر والا کرے گا آغاچی، اور میں کوئی سپاہی بھی نہیں، پھر بھی کوشش کروں گا۔“ میں نے اپنے الفاظ حتی المقدور نرم رکھے تھے۔

”یاد رکھنا کہ شہزادے کو کچھ ہو گیا تو میں بھی زندہ نہ رہوں گی۔“

”مغل سپاہ کوئی کھلونا نہیں، آغاچی، جو اپنے سالار کی حفاظت بھی نہ کر سکے۔“

”درست۔“ شہزادی نے مجھ سے اتفاق کیا۔ ”لیکن کوئی بھولا بھٹکا تیر بھی تو میرے

شہزادے کی طرف آسکتا ہے۔“

وہ خوف زدہ تھی لیکن میرے پاس اس کے خوف کو ختم کرنے کا کوئی طریقہ نہ تھا۔ میں تو خود خوف زدہ تھا۔ میدان جنگ میں شہزادے کے بالکل عقب میں بیٹھا ہوا تھا۔ جنگ کے

1026ھ (1616ء)

”تمہیں ساتھ نہیں جانا چاہیے، آغاچی، تم یہیں رہو۔ میں سفر کے دوران خود صاحب عالم کی خدمت کروں گا۔“ میں نے شہزادی ارجمند کو قائل کرنے کی کوشش کی۔

”تم صاحب عالم کی بیوی تو نہیں ہو۔“ آغاچی نے کھٹ سے جواب دیا۔ ”اور پھر ہم

ایک دوسرے سے ساتھ نبھانے کا عہد کر چکے ہیں۔“

آغاچی ایک طویل سانس لے کر خاموش ہو گئی کیوں کہ دکن کے سفر کی صعوبتوں کا اُسے احساس تھا اور پھر گزشتہ سفر کی ناخوشگوار یادیں ہنوز اس کے دل میں تازہ تھیں۔

”تمہیں یاد ہے نا آغاچی، میواڑ کے سفر کے دوران کیا ہوا تھا؟“ میں نے یادوں کی

اس ناخوش گواری کو مزید پختہ کرنے کے لیے کہا۔

”تم اس وقت مجھے کوئی بوڑھی عورت دکھائی دے رہے ہو عیسیٰ! بہتر ہے کہ تم یہیں رہ

جاؤ۔“

”نہیں، آغاچی، جہاں تم رہو گی میں بھی وہیں رہوں گا، لیکن خدا کے لیے ذرا غور کرو

کہ کیا شہزادہ دارا شکوہ، اس کٹھن سفر کا متحمل ہو سکے گا؟ وہ ابھی چھوٹا ہے۔“

”وہ اس کا عادی ہو جائے گا عیسیٰ۔“ شہزادی ارجمند نے دُور خلاؤں میں کبھی نہ ختم

ہونے والے سفر پر نگاہیں جماتے ہوئے جواب دیا اور میں سر جھکا کر خاموش ہو گیا۔

ولی عہد کا قافلہ مغلیہ سلطنت کے جنوبی حصے تک پہنچا ہی تھا کہ شہزادی ارجمند نے ایک

اور بیٹے کو جنم دیا جس کا نام شہزادہ شجاع رکھا گیا۔

جس جگہ ہم موجود تھے، وہاں کے لوگ ہی نہیں علاقہ بھی اجنبی اجنبی دکھائی دیتا تھا۔

لیے ایچ پور کے قریبی علاقے کو منتخب کیا گیا تھا۔ ایک جانب مغل سپاہ تھیں اور سامنے نظام شاہی فوجیں تھیں۔

شہزادہ خرم حسب معمول بیرم پر سوار تھے اور اسی ہودے میں ان کے پیچھے میں تھا ہمارے ارد گرد احدی پھیلے ہوئے تھے۔ اُن کے بعد کے دستوں کا سالار رانا میواڑ کا بیٹا کرن سنگھ اور بائیں جانب کی سپاہ کا قائد سعد اللہ خان تھا۔ تمام سالار سر سے پاؤں تک لوہے میں ڈوبے ہوئے تھے۔

شہزادہ خرم نے البتہ ایک ہلکا سا چار آئینہ (زرہ بکتر) زیب تن کیا ہوا تھا جو سینے اور پشت کی دو آہنی تختیوں اور دائیں بائیں طرف کی حفاظت کے لیے دو ہلکی چادروں پر مشتمل تھا۔ شہزادے کا آہنی خود سونے اور ہیروں سے مزین تھا۔ شہزادے کے مقابلے میں، میں صرف جبہ اور پاجامہ پہنے ہوئے تھا اور مکمل طور پر غیر محفوظ تھا۔

شہزادہ خرم نے اپنا دایاں ہاتھ اوپر اٹھایا اور چند ٹائیوں کے بعد دائیں جانب کے دستے حرکت میں آ گئے۔ دس ہزار سوار مرکزی سپاہ سے الگ ہو کر جنوب کی سمت بڑھ گئے بندوچی اور توپیں ان کے ہمراہ تھیں۔ دُور سامنے کی جانب مخالف فوجوں میں بھی حرکت شروع ہو گئی اور انہوں نے ہماری طرف بڑھنا شروع کر دیا۔

شہزادے نے دونوں ہاتھ سر سے بلند کیے تو پوری مغل سپاہ رک گئیں۔ پھر شہزادے نے بائیں جانب والا ہاتھ اٹھایا اور بائیں طرف کے دس ہزار سوار شمال کی جانب چل دیے۔ اب صورت حال یہ تھی کہ دشمن ہمارے سامنے تھا اور شمال جنوب سے جانے والے بیس ہزار سوار ان کے دائیں بائیں سے آگے بڑھ رہے تھے۔

”تم خوف زدہ ہو عیسیٰ؟“ دفعتاً شہزادے نے مجھے مخاطب کیا۔

”میں جھوٹ بولنے کی جرأت نہیں کر سکتا، صاحب عالم۔“ میں نے سچ بول دیا۔

”ہمیں افسوس ہے کہ ہم تمہارے خوف کا علاج نہیں کر سکتے کیونکہ دونوں فوجیں فتح کا

مقصد لے کر میدان میں اتری ہیں اور اپنے اس مقصد کے حصول کے لیے وہ ہر ممکن طریقہ استعمال کریں گی۔ مخالف کی کوشش ہوگی کہ وہ کسی نہ کسی طرح ہمیں نشانہ بنائیں کیونکہ سالار کے گرنے کا مطلب پوری سپاہ کی شکست ہوتا ہے۔ لہذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تم نے غلط ہاتھی کا

انتخاب کیا ہے۔“

”آپ، آغاچی کی درخواست مسترد کر سکتے تھے صاحب عالم۔“ میں نے اظہار خیال

کیا۔ ”آپ چاہتے تو مجھے ان کے پاس چھوڑ کر آ سکتے تھے۔“

”ہمیں افسوس ہے کہ ہم ارجمند کا کہنا ٹال نہیں سکتے، عیسیٰ۔“

شہزادہ دوبارہ دشمنوں کی طرف متوجہ ہو گیا اور میں دُعا میں کرنے لگا۔ اپنی جان بچنے کی، دشمنوں سے محفوظ رہنے کی۔۔۔ لیکن اس وقت مجھے قرآن کی کوئی آیت یا کوئی دُعا نہیں یاد تھی۔۔۔ میری روح کی گہرائیاں شیوا کو پکار رہی تھیں۔ دل ہی دل میں، میں نے اپنے مذہب سے غداری کرنے پر شیوا سے معافی مانگی۔ شیوا یقیناً میری جیوریوں کو سمجھتا ہوگا۔ میں ایک غریب۔۔۔ ہندو اگر یہ بھی نہیں نہ بھرتا تو جانے کب کا صفحہ ہستی سے مٹ چکا ہوتا۔

میرے ہونٹ مل رہے تھے لیکن ان سے، شیوا، شیوا، کی خاموش صدائیں نکل رہی تھیں۔ میں وعدہ کر رہا تھا کہ زندہ بچ گیا تو اس کی پوجا کرنے ضرور جاؤں گا۔ ساتھ ہی ساتھ میں اپنے ارد گرد کا جائزہ لیتا جا رہا تھا۔

لڑائی شروع ہو چکی تھی۔ گھمسان کارن تھا۔ تلواروں کے ٹکرانے، جزائل چلنے، توپوں کے گولے داغنے اور انسانی چیخوں کے علاوہ گھوڑوں کے ہنہانے اور ہاتھیوں کی۔۔۔ چنگھاڑوں سے فضا بوجھل تھی۔ گرد و غبار میں اٹے ہوئے جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو کر زمین پر گر رہے تھے۔ میں نے شہزادے کو دیکھا وہ اپنے ہاتھوں کو سر سے بلند کر کے مختلف انداز میں حرکت دیتے اور پوری مغل فوج ان کے اشارے پر کارروائی کرتی۔

مار دھاڑ کا یہ عالم دن بھر جاری رہا اور بالآخر شام سے پہلے دشمن دُم دبا کر بھاگ گیا۔ اپنے پیچھے وہ بہت سے ہتھیار، اپنے زخمی اور مردہ سپاہی، مویشی اور زندہ سوار چھوڑ گیا تھا۔ نظام شاہی فوج کے پانچ ہزار اور مغل سپاہ کے ایک ہزار پچاس افراد اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔

چیخوں سے بھاری فضا اب ”اللہ اکبر“ اور ”شاباش، شاباش“ کے نعروں سے گونج اُٹھی تھی۔

”تمہیں کس نے کہا ہے کہ اپنے شوہر کے ساتھ دردِ در کی خاک چھانو؟“ پھوپو نے تیز لہجے میں کہا۔ ”اگر ظلِ الہی دکن تشریف لے جاتے تو ہم یہاں ٹھہرتے اور خوشی خوشی انہیں رخصت کرتے۔“

”ہم نے ایک دوسرے سے کبھی جدا نہ ہونے کا وعدہ کیا ہے، پھوپو۔“
 ”اگلی بار تم آگرہ میں ہی رہو گی۔“ پھوپو نے حکم دیا۔ ”تم اپنے ساتھ ظلم کر رہی ہو۔“
 ”نہیں پھوپو، میں اپنے شوہر کی خواہشات کا احترام کروں گی۔“

پھوپو نے سخت نگاہوں سے مجھے دیکھا لیکن انہیں کچھ کہنے کی مہلت نہیں ملی کیونکہ چوب دار کی آواز دربار میں گونجنے لگی تھی۔

”جنش مکن، ہوشیار باش، سالار جمشید ہوش، صاحب تاج پوش، شہنشاہ معظم، ظلِ الہی نورالدین محمد جہانگیر جلوه افروز ہوتے ہیں۔“

دربار میں موجود تمام افراد مودب ہو گئے۔ شہزادہ خرم بھی اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ جونہی ظلِ الہی دربار میں داخل ہوئے، پردے کے عقب میں موجود خواتین سمیت تمام افراد کورنش بجالانے کے لیے جھک گئے۔ میں نے کن اکھیوں سے دیکھا۔ میرے والد، شہنشاہ کے عقب میں تھے۔ جنہوں نے ایک بڑی مجلد کتاب اٹھا رکھی تھی۔ شہنشاہ آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہے تھے اور انہوں نے میرے دادا حضور کا سہارا لے رکھا تھا۔

”مجھے ظلِ الہی کی طبیعت درست معلوم نہیں ہوتی۔“

”خاموش۔“ پھوپو نے فوراً مجھے خاموش کرا دیا۔ ان کا ردِ عمل بڑا شدید تھا۔ ”ظلِ الہی بالکل ٹھیک ہیں اس لیے انہیں مت پھیلاؤ ورنہ تمہارے لیے مشکلات کھڑی ہو سکتی ہیں۔“
 میں خاموش ہو گئی۔ البتہ میں نے محسوس کیا تھا کہ اب خانم مہر النساء میری پھوپو نہیں رہی تھیں بلکہ وہ سلطنتِ مغلیہ کی ملکہ نور جہاں تھیں۔

ظلِ الہی تخت کی طرف جانے کے بجائے ولی عہد سلطنت کی طرف بڑھے۔ پہلے انہوں نے میرے محبوب کے رخسار کا بوسہ لیا اور پھر شہزادے کو سینے سے لگا لیا۔ وہ کافی دیر انہیں چمٹائے کھڑے رہے اور پھر اپنے ولی عہد کا رخ درباری امراء کی طرف کر دیا۔

”ہمیں ولی عہد سلطنت پر فخر ہے۔ ایک بار پھر اس نے خود کو عظیم سپہ سالار ثابت کر دیا

1028ھ (1618ء)

ارجمند بانو

شہنشاہ ہندوستان کے تخت کے برابر، سونے کی بنی ہوئی کرسی رکھی گئی لیکن صاحبِ عالم ابھی تک تخت کے سامنے گدیوں پر تشریف فرما تھے۔ ایک طرف متعدد بڑی بڑی رکابیاں رکھی ہوئی تھیں جن میں قیمتی زرد جواہر، ہیرے، نیلم، یاقوت، پکھراج اور سونے کے سکے بھرے ہوئے تھے۔ شہزادہ خرم کے پیچھے ان کے تینوں بھائی اور ان کے پیچھے درباری امراء با ادب کھڑے تھے۔

”تم خوش ہو ارجمند؟“ میرے پہلو میں بیٹھی پھوپو نے مجھ سے دریافت کیا۔

”میرا سر فخر سے بلند ہو گیا ہے پھوپو۔“ میں نے پردے کے عقب سے دربار کا جائزہ لیتے ہوئے جواب دیا۔ مجھے امید تھی کہ اب شہنشاہ ہند کو مزید فتوحات کی ضرورت نہیں ہوگی اور ہمیں آگرہ کے ٹھنڈے محلات میں کچھ عرصہ سکون سے گزارنے کا موقع مل جائے گا۔
 ”لیکن میں تھک گئی ہوں پھوپو۔“ میں نے چند ثانیے سکوت کے بعد کہا ”مجھے اپنے شہزادے پر بے حد فخر ہے کہ وہ جب بھی کسی معرکے سے واپس آتے ہیں، ظلِ الہی کی نظر میں ان کا رتبہ بلند ہو جاتا ہے۔ مگر اب میں چاہتی ہوں کہ ہم کچھ عرصہ سکون سے یہاں رہیں۔“

”شہزادہ خرم ایک عظیم سپہ سالار ہے۔“ پھوپو نے جواب دیا۔ ”ہر شے ظلِ الہی کے حکم کے تابع ہے۔“

”اگلی بار ضرورت ہو تو مہابت خان کو بھجواد بھیجے گا، پھوپو یہ میری درخواست ہے۔

میں یہاں رُکنا چاہتی ہوں۔“

وقت گزرتا رہا اور پھر محل کے در و دیوار، نواز سیدہ شہزادہ اور نگ زیب کی چیخوں سے گونج اٹھے لیکن اس کی یہ چیخیں دنیا میں آنے کے خوف سے نہیں بلکہ غصے سے نکل رہی تھیں۔ وہ اتنا دبلا تھا کہ مجھے اس کے زندہ بچنے کی کوئی امید نہ تھی۔ وہ ایک عرصے تک زمین و آسمان کے درمیان معلق رہا لیکن رفتہ رفتہ زندگی کی طرف لوٹ آیا۔ وہ دبلا تو رہا لیکن اس کے قہر و غضب میں کوئی فرق نہ آیا۔

ظل الہی کے ذاتی ستارہ شناس اور جوتشی جاتک رائے نے اس کا زائچہ بنایا لیکن جب وہ اپنے کام سے فارغ ہو کر اٹھا تو چراغوں کی روشنی میں اس کے چہرے کے تاثرات مجھے کچھ زیادہ بھلے نہ گئے۔

”عظمت۔“ بالآخر جاتک رائے کے ہونٹوں نے حرکت کی ”نومولود شہزادے کے ستارے ان کے عظیم شہنشاہ ہونے کی خبر دیتے ہیں۔ شہزادہ عالی جس سلطنت کے والی ہوں گے وہ موجودہ سلطنت سے کہیں زیادہ بڑی ہوگی۔ ثریا ان کی زندگی پر حکمرانی کرے گی اور وہ دنیا کو ہلا کر رکھ دیں گے۔“ جاتک رائے اچانک خاموش ہو گیا جیسے وہ میرے بیٹے کے مستقبل کے بارے میں مزید کچھ نہ بتانا چاہتا ہو۔

”مزید؟“ شہزادہ خرم نے حکم دیا۔

”غلام گستاخی کی معافی چاہتا ہے، صاحب عالم۔“ جاتک رائے نے سر جھکا دیا۔

”لیکن میں اس سے زیادہ نہیں بتا سکتا۔ کیونکہ یہ زیادہ خوش گوار نہیں۔“

جاتک رائے تو چلا گیا لیکن مجھے لائقا ہی اندیشوں اور وسوسوں کے سمندر میں غرق کر گیا مگر جب میں نے اس کا اظہار اپنے محبوب سے کیا تو انہوں نے اسے ہنسی میں اڑا دیا۔

”ہمیں علم نہ تھا کہ ہماری محبوب شہزادی اتنی تو ہم پرست ہوگی۔“ انہوں نے انگلی سے میری ٹھوڑی اوپر اٹھائی۔ ”صرف یہ یاد رکھو کہ اپنے بچوں کے مستقبل کے محافظ ہم ہیں۔

ستارے یا اعداد نہیں، جو اس بے وقوف نے بنائے ہیں۔“

مگر جانے کیوں میں کبھی بھی صاحب عالم کی اس توضیح سے مطمئن نہ ہو سکی۔

ooo

”ہے۔“

”ظل الہی کو دکن کے خلاف ولی عہد سلطنت کی فتح مبارک ہو۔“ درباری امراء نے بیک زبان ہو کر لگے بندھے جملے دہرائے۔

شہزادے کو دوبارہ گدیوں پر بٹھا دیا گیا اور پھر ظل الہی نے باری باری سونے کی رکابیاں لانے کا اشارہ کیا۔ غلام پہلی رکابی لے کر آگے بڑھے اور ظل الہی نے رکابی میں پڑے ہوئے زرد جواہر، مٹھی بھر کر شہزادے کے سر پر نچھاور کرنے شروع کر دیے۔ رفتہ رفتہ تمام رکابیاں خالی ہو گئیں۔ میرے شہزادے کے گرد سونے کے سکوں اور زرد جواہر کا انبار لگ گیا تھا۔۔۔ لیکن بیٹے کے لیے باپ کی محبتیں ابھی ختم نہیں ہوئی تھیں۔

شاہ نے میرے والد کو آگے آنے کا اشارہ کیا اور انہوں نے اپنے ہاتھ میں موجود چرمی جلد والی کتاب ظل الہی کو تھما دی۔

”اب ہم اپنی زندگی کا سب سے قیمتی تحفہ ولی عہد کی نذر کر رہے ہیں۔“ ظل الہی کی آواز دربار میں گونجی۔ ”یہ ہماری خودنوشت جہانگیر نامہ کی پہلی جلد ہے۔“

صاحب عالم نے دونوں ہاتھوں سے کتاب تھامی اور اسے چوم لیا۔ پھر انہوں نے ظل الہی کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور مودب ہو گئے۔ شہنشاہ نے انہیں اپنے ساتھ تخت کے پہلو میں بچھی سونے کی کرسی پر بٹھا دیا اور اس کے بعد تخت کی جانب بڑھے۔ میرے چہرے سے فخر و انبساط کے سوتے پھوٹ پڑے۔ آج سے پہلے کسی شہزادے کو بادشاہ سلامت کی دربار میں موجودگی میں بیٹھنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ ظل الہی نے اپنی کرم نوازیاں اسی پر بس نہیں کیں بلکہ صاحب عالم کا مرتبہ بھی تیس ہزار ذات اور بیس ہزار سواروں تک بڑھا دیا گیا۔

جہانگیر نامہ، صاحب عالم اپنے ساتھ ہی لے کر میرے پاس تشریف لائے تھے اور میں وہ پہلی ہستی تھی جس نے اس کا مطالعہ کیا تھا۔ اس کے باوجود کہ مجھے اس کے بہت سے مندرجات سے اختلاف تھا لیکن میں یہ تعریف کیے بغیر نہ رہ سکی کہ ظل الہی نے اپنی خوبیوں کے ساتھ ساتھ اپنی کمزوریوں کا بھی بڑے کھلے دل سے اس میں اعتراف کیا تھا۔

ooo

بن یا بگڑ جاتے۔ ظل الہی کا کام صرف اس قدر رہ گیا تھا کہ وہ اپنے نام کے ساتھ شہنشاہ کا لفظ لکھتے۔ دربار عام اور دربار خاص منعقد کرتے اور دن میں دو بار، دوپہر و شام میں تشریف فرما ہو کر خاص و عام کو اپنا دیدار بخشتے۔ شام ڈھلے وہ قلعے کے میدان میں آ کر ہاتھیوں کی لڑائی یا کسی کو سزا دینے کی کارروائی ملاحظہ کرتے اور حکومت ملکہ نور جہاں کرتیں۔ بہت سے امراء نے ملکہ کے خلاف شاہ کے کان بھی بھرے لیکن پھوپھو کے حسن کا جادو، ظل الہی کے کچھ ایسے سرچڑھ کر بول رہا تھا کہ انہیں الگ کرنا ناممکن تھا۔

جہاں تک میرا تعلق تھا تو مجھے ان سرگوشیوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں صرف اپنے محبوب کے خلاف باتیں کرنے والوں کی ٹوہ میں رہتی لیکن ایسا کوئی شخص سامنے نہ آیا۔ عیسیٰ اس سلسلے میں میرا بہترین اور بااعتماد مخبر ثابت ہوتا تھا۔

ایک روز جب میں اپنے کمرہ خاص میں آرام کر رہی تھی، سنگ مرمر کے فرش پر کسی تیز تیز چلنے کی آواز سنائی دی۔ میں فوراً سمجھ گئی کہ آنے والا عیسیٰ ہو گا کیونکہ کسی اور کی ت۔۔۔ نہیں تھی کہ میری موجودگی میں اس طرح چلے۔ میرے خیال میں وہ کوئی اہم خبر لایا جو شاید میرے محبوب سے ہی متعلق تھی۔ لیکن اس نے جو خبر سرگوشی کے انداز میں مجھے سنائی، ادہ اہم اور دھماکا خیز تھی۔

”آغا جی۔۔۔“ عیسیٰ نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ”میں نے سنا ہے کہ ظل الہی بیمار ہیں، اور بعض لوگ یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ وہ قریب المرگ ہیں۔۔۔۔۔“

ooo

ظل الہی نے میرے شہزادے پر جو دولت نثار کی تھی۔ اس سے میں اس قابل ہو گئی تھی کہ غریبوں کے لیے شفا خانے اور مکتب تعمیر کرا سکوں۔ سو میں نے ایسا ہی کیا۔ زیادہ تر شفا خانے صرف عورتوں کے لیے تھے کیونکہ ان دنوں آگرہ کی گلیوں میں آوارہ پھرنے والی گایوں کی وقعت بھی عورت سے زیادہ تھی۔ میں ان شفا خانوں کا پابندی کے ساتھ دورہ کرتی اور ان میں پھل اور دوسری اشیائے ضرورت تقسیم کرتی تھی۔ عیسیٰ میرے ہمراہ ہوتا تھا۔ ان شفا خانوں کے لیے الگ سے طبیب اور حکیم رکھے گئے تھے لیکن میرا ذاتی طبیب وزیر خان بھی عورتوں کا علاج کرتا۔

بشش کے باوجود میں صرف لڑکوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کی رسم ختم نہ کر سکی۔ یہ مکتب صرف مسلمان ہی نہیں ہندو اور سکھ لڑکوں کے لیے بھی تھے مگر مجھے اس بات کا ہمیشہ افسوس رہا کہ میں لڑکیوں کو ان کے گھروں کے بندی خانوں سے رہائی دلا کر ان مکتبوں تک نہ لاسکی۔

میری سرگرمیاں پھوپھو سے چھپی نہ رہ سکیں۔ اُن کی طرف سے کچھ سرگوشیاں بھی مجھ تک پہنچیں جو باتوں سے زیادہ انتباہ کی حیثیت رکھتی تھیں۔ وہ خود کو ایک خود مختار ملکہ سمجھتی تھیں لیکن ساتھ ہی ان کا یہ خیال بھی تھا کہ لوگوں کا خیال رکھنا ظل الہی کی ذمہ داری ہے، ان کی نہیں۔

اس کے باوجود پوری سلطنت میں ملکہ نور جہاں کے نام کا ڈنکا بجتا تھا۔ سلطنت کی اصل قوت ان کے پنجوں میں تھی۔ وہ ایک انگلی اٹھاتیں تو محاصل میں کمی بیشی ہو جاتی۔ دوسری انگلی اٹھاتیں تو کوئی سرکاری عامل عروج حاصل کر لیتا یا زوال کی گہرائیوں میں جا گرتا۔ تیسری انگلی اٹھاتیں تو تجارت بند ہو جاتی یا شروع ہو جاتی۔ چوتھی انگلی اٹھاتیں تو قوانین

میں گونجتی محسوس ہو رہی تھیں۔

شہنشاہ کچھ دیر اپنے خوابوں کی تعبیر کا جائزہ لیتا رہا اور پھر مرکزی دروازے کی طرف چل دیا، جہاں باہر ایک ہجوم اُس کے دیدار کے لیے جمع تھا۔ جوئی شہنشاہ باہر آیا فضا۔۔۔
”جہاں پناہ زندہ باد“ کے نعروں سے گونج اُٹھی۔

ooo

1050ھ (1640ء)

ممتاز محل

مقبرہ فی الوقت ایک ایسے انسانی ڈھانچے کی صورت تھا جس پر گوشت نام کی کوئی شے نہ ہو۔ مغلیہ تاجدار کو یہ بے جان اور ٹھنڈا محسوس ہوا تھا۔ اُس کے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات سامنے کھڑے ہوئے لوگوں کے دلوں کی دھڑکن تیز کیے دے رہے تھے۔ شہنشاہ شاہ جہاں کے قدموں تلے، چکنا فرش اور سر پر سر بہ فلک گنبد تھے۔ اُس نے اوپر نگاہ اٹھائی۔ مکمل ہو کر اس کا وزن چونتیس ہزار من کے لگ بھگ ہوتا۔ شہنشاہ کچھ دیر اپنی محنتوں کے ثمر نگاہوں سے توڑتا رہا، پھر اُس نے دُعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔

”ابھی یہ نامکمل ہے، جہاں پناہ!“ عیسیٰ نے کہا۔

شہنشاہ پلٹا، شاید وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کس بدتمیز نے دُعا کی ہے، لیکن جب عیسیٰ پر نگاہ پڑی تو ضبط کر گیا۔

”جلد ہی یہ مکمل ہو جائے گا۔“ شہنشاہ نے جواب دیا۔۔۔ اور ساتھ ہی معمار اعلیٰ محمد

حنیف کو آگے آنے کا اشارہ کیا۔

”جہاں پناہ نے دُراست فرمایا۔“ حنیف نے اپنے شاہ کی ہاں میں ہاں ملائی۔

دیواریں اور جھروکے مکمل ہو چکے تھے، لیکن ابھی بڑے بڑے خلا باقی تھے جہاں جالیاں لگائی جانی تھیں اور کھڑکیوں کے پٹ لگنے تھے۔ وہ حنیف کی ذمہ داری نہیں تھی۔۔۔ بلکہ دوسروں کا کام تھا۔ چھوٹے گنبد بھی تعمیر ہو چکے تھے اور اس وقت جس ہال میں وہ لوگ موجود تھے اُس کی بلندی اسی ہاتھ ہو چکی تھی۔ اُن کی سرگوشیوں جیسی آوازیں بھی اُس

”ہاں۔“

”لیکن انہوں نے تو ہمیں اناج دیا تھا۔“

”اناج دینے سے ناراضی کم نہیں ہوتی۔“ وزیر نے جواب دیا۔ ”ہاں، ایک صورت ہے کہ تم یہ بتاؤ، عیسیٰ کون ہے؟ تو میں اُن کی ناراضی ختم کرنے کی کوشش کروں گا۔“

”لیکن میں اُس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا سرکار!“

”تو پھر میں تمہاری کوئی مدد نہ کر سکوں گا۔“

وزیر نے مورتی کا بازو پکڑا اور قلعے میں لا کر اُسے محافظوں کے سپرد کر دیا جنہوں نے اُسے ایک اندھیری کوٹھڑی میں بند کر دیا۔ مورتی رویا چلایا، لیکن کسی نے اُس کی آہ و بکا پر کوئی توجہ نہ دی تھی۔

پورے دو دن کوٹھڑی میں بند رہا۔ بالآخر تیسرے دن دروازہ کھلا اور ایک محافظ نے اُسے باہر نکالا۔

”اس کے ساتھ چلے جاؤ۔“ اُس نے دوسرے پہرے دار کی طرف اشارہ کیا۔ مورتی اُس کے پیچھے پیچھے قلعے کے بیرونی دروازے کی طرف چل پڑا۔

دریچہ دیدار کے قریب سے گزرتے ہوئے اُسے میدان میں ایک ہجوم نظر آیا۔ میدان کے وسط میں ایک ہاتھی کھڑا تھا۔ اُس کے دیکھتے ہی دیکھتے کچھ آدمی ایک شخص کو جکڑے ہوئے اُس ہاتھی کی طرف بڑھے۔ مورتی نے اُن کی گرفت میں مچلتے ہوئے شخص کو فوراً پہچان لیا۔ وہ وزیر تھا، جس نے مورتی سے عیسیٰ کے بارے میں پوچھ گچھ کی تھی اور پھر اُسے کوٹھڑی میں پھینک دیا تھا۔

انہوں نے وزیر کو باندھ کر زمین پر ڈال دیا۔ مہابت نے ہاتھی کو اشارہ کیا اور وہ دیو ہیکل جانور زمین پر پڑے وزیر کی طرف بڑھا، جو بُری طرح چیخ رہا تھا۔ ہاتھی نے اپنا ایک پیر اٹھایا اور وزیر کے سر پر رکھ دیا۔ ایک چیخ اُبھری اور پھر خاموشی چھا گئی۔ بھاری بھر کم پاؤں تلے کچلے جانے سے وزیر کا منہ، گوشت اور خون کے ملغوبے میں تبدیل ہو گیا تھا۔ اس کا بھیجہ اور خون دُور، دُور تک بکھر گیا تھا۔

مورتی نے جھرجھری لی اور صدر دروازے کی طرف بڑھ گیا، لیکن وہ یہ سوچے بغیر نہ رہ

سیتا اندر چیخ رہی تھی اور مورتی باہر کھڑا ”رام، رام، رام“ کا ورد کر رہا تھا۔ اُس کے دونوں بچے گولی اور سادتری اُس کے قریب کھڑے تھے۔ اُس نے بھگوان سے پرارتھنا کی کہ آنے والا لڑکا ہوتا کہ اُس کے بڑھاپے کا سہارا بن سکے۔ وہ خوفزدہ تھا، اپنے بڑھاپے سے اور سب سے بڑھ کر اپنے ارد گرد کے ماحول سے۔

اُسے اچانک ہی وہ وقت یاد آ گیا، جب شہنشاہ کا وزیر ایک روز اُسے سب سے الگ لے گیا تھا۔

”تم کون ہو؟“ وزیر نے بلا تمہید سوال کیا تھا۔

”مورتی، میں جالی تراشتا ہوں۔“

”میں نے یہ دریافت نہیں کیا، بے وقوف، کہ تم کیا کرتے ہو۔“ وزیر چہیں چہیں ہو کر بولا۔ ”مجھے بتاؤ کیا تم عیسیٰ کو جانتے ہو؟“

”نہیں، یہ کون ہے؟“

”سوال میں نے پوچھا ہے، بودم! عیسیٰ جو جہاں پناہ کا غلام ہے اور سائے کی طرح اُن کے ساتھ رہتا ہے۔“

”سرکار! میں بھلا ایسی ہستی کے بارے میں کیوں کر جان سکتا ہوں؟“ مورتی نے عاجزانہ لہجے میں جواب دیا۔ ”میں تو ایک معمولی سا سنگ تراش ہوں اور بلد یوداس کے لیے کام کرتا ہوں۔“

”کیا فریاد پر تم نے دستخط کیے تھے؟“

”ہاں۔“ مورتی کانپ اٹھا۔ اُس کے دل میں انجانے دسو سے بیدار ہو گئے۔ ”کیا

جہاں پناہ ناراض ہو گئے ہیں؟“

سکا کہ کیا یہ سب عیسیٰ کی وجہ سے ہوا ہے؟ وہ کون تھا؟ مورتی کی خواہش تھی کہ وہ اس پر اسرار
شخص کے بارے میں جانتا۔۔۔

”مبارک ہو، سرکار! تمہارے ہاں بیٹا پیدا ہوا ہے۔“ جھونپڑے کے اندر سے کسی
عورت نے پکار کر کہا تو مورتی ماضی سے حال میں لوٹ آیا۔
”رام، رام، رام، رام!“ مورتی کی آواز کچھ اور بلند ہو گئی۔

ooo

1054ھ (1644ء)

عیسیٰ شاہی دیوان کے سامنے کھڑا شہنشاہ کو تک رہا تھا۔ آج جہاں پناہ کی سالگرہ تھی جو
سال میں دو مرتبہ منائی جاتی تھی۔ ایک بار عیسوی تقویم اور دوسری بار قمری تقویم کے حساب
سے۔ دونوں مرتبہ شہنشاہ کو سونے میں تولا جاتا تھا، جو بعد ازاں غریبوں میں تقسیم کر دیا جاتا۔
آج قمری سالگرہ تھی اور یہ تقریب شاہی حرم میں ہوتی تھی جبکہ عیسوی تقویم کی سالگرہ
دربار عام میں منائی جاتی تھی۔

شاہی خواتین نے شاہ کا وزن کیا۔ ایک من بچیس سیر تھا۔ اس وزن کے برابر طلائی
سکے، غریبوں میں تقسیم ہونے کے لیے بھجوا دیے گئے تھے۔

شہنشاہ کچھ دیر خواتین کی مبارک بادیں وصول کرتا رہا پھر اس نے انہیں تقریب میں
مصروف چھوڑا اور کمرۂ خاص سے باہر نکل آیا۔ حرم کی غلام گردشوں میں صرف ایک سایا شاہ
کے تعاقب میں تھا اور وہ سایا عیسیٰ کا تھا۔ وہ آگے پیچھے چلتے ایک آخری کمرے میں داخل
ہوئے جس کے جھروکے سے آنے والی چاندنی، سنگ مرمر کے فرش پر پڑ رہی تھی۔ سامنے
ہی ایک مسہری بچھی ہوئی تھی جس کے قریب طیب گھٹنے ٹیکے بیٹھا تھا۔ شاہ کی آہٹ سن کر وہ
فوراً مودب ہو گیا۔

”اب طبیعت کیسی ہے؟“ شہنشاہ نے دریافت کیا۔

”شہزادی کو سانس لینے میں خاصی تکلیف محسوس ہو رہی ہے جہاں پناہ!“ طیب نے
سر جھکا کر جواب دیا۔ ”میں نے شہزادی کے جسم پر ٹھنڈے کپڑے رکھ دیے ہیں۔“

شہنشاہ گھٹنوں کے بل مسہری کے سامنے جھک گیا، جس پر اس کی عزیز بیٹی شہزادی

”کیا ہماری بہن زندہ ہے؟“

”برائے نام، شہزادہ حضور!“ عیسیٰ نے شہزادے کو کورنش بجالاتے ہوئے جواب دیا۔

”جہاں پناہ اس وقت بہ نفس نفیس شہزادی کے حجرہ خاص میں موجود ہیں۔“

شہزادہ اورنگ زیب ایک لمحے کو ٹھٹھا، لیکن پھر اُس نے اپنے پٹکے سے خنجر نکال کر عیسیٰ کو تھمایا اور اندر داخل ہو گیا۔ جہاں پناہ نے پلٹ کر شہزادے کی جانب نگاہ کی اور وہ فوراً تعظیم کے لیے جھک گیا، لیکن اُس نے شہزادہ دارا کو یکسر نظر انداز کر دیا تھا۔ آداب بجالانے کے بعد وہ سیدھا اپنی بہن کی مسہری کی طرف بڑھا، جو بچپن کے دنوں میں اُس کی سب سے بڑی خیر خواہ ہوا کرتی تھی۔

شہزادے نے اپنی بہن سے کوئی سوال پوچھنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ وہ ایک ہی نظر میں سمجھ گیا تھا کہ اُسے سوالوں کی نہیں، دُعاؤں کی ضرورت ہے۔ سو اُس نے ایسا ہی کیا۔

شہزادہ دارا نے اپنے بھائی کو ہاتھ اٹھا کر بہن کے لیے دُعا مانگتے دیکھا تو وہ شہنشاہ کی طرف جھٹکا اور اُن کے کان میں سرگوشی کے انداز میں کچھ بولا۔ شہزادہ اورنگ زیب کی آمد سے وہ حیران کا شکار ہو گیا تھا۔

”تمہیں یہاں آنے کو کس نے کہا تھا شہزادے؟“ شہزادہ دارا کی سرگوشی کے بعد شہنشاہ کی آواز اُبھری۔

شہزادہ اورنگ زیب نے شاید پہلی مرتبہ بادشاہ وقت کے سوال کو نظر انداز کر دیا۔ اُس کی دُعا جاری رہی۔ شہنشاہ نے بھی احترام دُعا میں۔۔۔ اورنگ زیب کی گستاخی سے صرف نظر کیا تھا۔

”تمہیں کس نے بلایا ہے شہزادے؟“ شہنشاہ نے دُعا ختم ہونے کے بعد اپنا سوال دُہرایا۔

”کسی نے نہیں جہاں پناہ!“ شہزادہ اورنگ زیب نے ادب سے جواب دیا۔

”شہزادی، ہماری عزیز بہن ہے اور ہم سینکڑوں میل دُور بیٹھ کر اسے موت و زندگی کی کش مکش میں مَجلا نہیں دیکھ سکتے تھے۔“

”کیا تم تنہا آئے ہو؟“

جہاں آرا دُنیا و ما فیہا سے بے گانہ، بے سُدھ پڑی ہوئی تھی۔ اُسے اپنی محبوب بیٹی کی طرف دیکھنے کی تاب نہیں تھی جس کا حسن اور خدو خال اُسے اپنی محبوب ملکہ ارجمند کی یاد دلاتے تھے۔ جلنے کی وجہ سے شہزادی کا چہرہ سیاہ پڑ گیا تھا۔

بیس روز قبل ایک موم بتی گر جانے سے اُس کے کپڑوں میں آگ بھڑک اُٹھی تھی اور اُس کی دو کنیریں آگ بجھانے کی کوشش میں جھلس کر مر گئی تھیں۔

”جہاں آرا۔“ شاہ نے دھیرے سے سرگوشی کی، لیکن شہزادی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اُس کے جسم کے ارتعاش سے اُس کے زندہ ہونے کا پتا چلتا تھا، لیکن اُس کے ہونٹ بولنے سے عاری تھے۔ ”جہاں آرا۔“ شاہ نے دوبارہ پکارا مگر وہ اب بھی خاموش تھی۔ شاہ، طبیب کی مڑا۔

”اگر تم ہماری بیٹی کی زندگی بچانے میں کامیاب ہو گئے تو ہم تمہیں منہ مانگے خزانے عطا فرمائیں گے۔“

”گستاخی معاف جہاں پناہ!“ شاہی طبیب نے ادب سے جواب دیا۔ ”غلام کسی لالچ کے بغیر شہزادی کا علاج کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کرے گا، لیکن زندگی اور موت اللہ تعالیٰ کے ہاتھوں میں ہے۔“

شہزادہ دارا بھی وہاں موجود تھا۔ وہ اپنی بہن کی مسہری کے ساتھ گھٹنوں کے بل بیٹھا زیر لب کسی دُعا کا ورد کر رہا تھا جبکہ عیسیٰ خاموش کھڑا پ بیٹے کے تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا۔

اچانک غلام گردش میں آہٹوں کی آواز اُبھری تو عیسیٰ جلدی سے باہر کی جانب لپکا۔ اُس کا خیال تھا کہ شاید کوئی غلام اس طرف آنکلا ہے اور وہ نہیں جانتا کہ جہاں پناہ اس وقت شہزادی جہاں آرا کی عیادت کو تشریف لائے ہوئے ہیں، لیکن آنے والا کوئی غلام نہیں، دکن کا صوبے دار شہزادہ۔۔۔ اورنگ زیب تھا، جو اپنی بہن کی خبر گیری کے لیے دکن سے وہاں آیا تھا۔ اس کے دھول اور گرد میں اُٹے ہوئے بال اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ شاید اُس نے راستے میں کسی منزل پر قیام نہیں کیا۔

”عیسیٰ!“ شہزادے نے اپنی بہن کے کمرے سے نکلنے والے سائے کو پہچان لیا۔

”تم نے جہاں پناہ کا حکم نہیں سنا عیسیٰ!“ شہزادے نے دُکھی انداز میں کہا۔ ”طعام و غسل تو دُور کی بات، ہم اُن کے حکم کے بغیر سانس بھی نہیں لے سکتے۔“

شہزادہ پلٹ کر اندھیری غلام گردشوں میں سایا بن کر کھو گیا لیکن عیسیٰ کو اُس کی آنکھیں یاد رہ گئی تھیں، جن میں صرف اور صرف یہ سوال نمود تھا کہ جہاں پناہ صرف شہزادہ دارا کو پیار کیوں کرتے ہیں، اُسے کیوں نہیں کرتے؟

000

1056ھ (1646ء)

مورتی، درگادیوی کا مجسمہ مندر میں چھوڑ کر لوٹا تو گوپی اُسے جھونپڑی کے دروازے پر ہی مل گیا۔ یہ وہی مجسمہ تھا جس کے لیے بلد یو داس نے اُسے ہدایت کی تھی۔

”تمہاری ماں کیسی ہے گوپی؟“

”وہ رورہی ہے بابا۔“ گوپی نے جواب دیا۔ ”اُس سے اُٹھا بھی نہیں جا رہا۔“

”فکر نہ کرو۔“ مورتی نے اُسے جھوٹی تسلی دی۔ ”وہ تھک گئی ہوگی۔“ اپنے لہجے کے کھوکھلے پن کا احساس اُسے بھی تھا۔ وہ فوراً اندر داخل ہوا۔ سیتا سامنے ہی زمین پر بے ترتیب پڑی تھی۔ مورتی بھاگ کر اُس تک پہنچا۔ اُس کی نبضیں ڈوب رہی تھیں اور آنکھیں چڑھ رہی تھیں۔ دوسرے ہی لمحے وہ چیختا ہوا باہر بھاگا۔

”کیا ہوا؟“ پڑوس کی دو تین عورتیں فوراً نکل آئیں۔

”سیتا مر رہی ہے۔“ مورتی حلق کے بل چیخا۔ شدتِ غم سے وہ روہا نسا ہو رہا تھا۔

”گوپی“ اُس نے اپنے بیٹے کو پکارا۔ ”بھاگ کر قلعے میں جاؤ، پہرے داروں سے کہنا کہ وہ عیسیٰ کو بتا دیں کہ میری بیوی مر رہی ہے، ہمیں طبیب کی ضرورت ہے۔۔۔ جاؤ، بھاگو۔“

000

”شہزادے کبھی تنہا سفر نہیں کرتے جہاں پناہ!“ شہزادے نے شان بے اعتنائی سے کہا۔ ”پانچ ہزار سوار بھی ہمارے ساتھ آئے ہیں۔“

شہنشاہ کا پارہ چڑھ گیا۔ ”کیا شہزادے کو خود پر حملے کا خطرہ تھا؟“ اُس نے تیکھے انداز میں دریافت کیا۔ ”یا شہزادہ خود کسی حملے کی منصوبہ بندی کر کے آیا ہے؟“

”نہیں، جہاں پناہ!“ شہزادے نے حیرت سے اپنے والد بزرگوار کا جائزہ لیا۔ ”ہمارا مرتبہ پچاس ہزار ذات کا ہے اور ہم صرف پانچ ہزار۔۔۔“

”ہم جانتے ہیں۔“ شاہ نے اُسے ٹوک دیا۔ ”تم فوری طور پر واپس روانہ ہو گے، تمہیں ہماری اجازت کے بغیر اپنا صوبہ۔۔۔ چھوڑنے کی جرأت کیسے ہوئی؟ تم اور تمہارے آدمی ابھی اور اسی وقت دکن کے لیے کوچ کریں گے اور ہاں تمہیں سفر میں کتنے روز لگے؟“

”دس رات دن، جہاں پناہ!“

”اتنی طوالت؟“

”قرآن کریم نے ہمیں پانچ وقت سجدۃ الہی کا حکم دیا ہے اور ہم اس کی تعمیل کرتے ہیں۔“

”ہمیں اس سے انکار نہیں، لیکن یہ بھی ہمارا حکم ہے کہ شہزادہ نو دن میں واپس اپنی منزل پر پہنچے گا۔ اس سے ہمیں کوئی خاص فرق نہیں پڑتا کہ پانچ کے بجائے روزانہ چھ بار بارگاہ الہی میں سر جھکا یا جائے۔“ شہنشاہ نے طویل حکم صادر کیا۔ ”اور ہم شہزادے کو یہ بھی یاد دلانا چاہیں گے کہ وہ اُس وقت تک اپنا پایہ تخت نہیں چھوڑے گا، جب تک ہم اس کا حکم نہ دیں۔“

شہزادہ اور نگ زیب کے لب بھیج گئے۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ اس وقت مسکرا رہا تھا یا چیخ و تاب کھا رہا تھا۔ اُس نے جھک کر اپنے والد بزرگوار کو تعظیم دی۔ آگے بڑھ کر اپنی بے ہوش بہن کے ماتھے کو بوسہ دیا اور باہر نکل گیا۔

صرف ایک شخص نے شہزادے کے پیچھے جانے کی جرأت کی تھی اور وہ عیسیٰ تھا۔ اُس نے شہزادے کو اُس کا خنجر لوٹایا۔ ”شہزادہ عالی! اگر حکم دیں تو اُن کے غسل اور طعام کا بندوبست کیا جائے؟“

ہو گیا کہ موت ایک دائرہ ہے اور ہر شخص کو اس دائرے سے اپنا حصہ وصول کرنا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ ظل الہی نے اپنی محبوب ملکہ کے والد بزرگوار کا مقبرہ بنانے کے احکامات صادر فرما دیے۔

ظل الہی پر بھی اعتماد الدولہ غیاث بیگ کے انتقال کے بہت بُرے اثرات ظاہر ہوئے۔ اُن کی علالت طوالت اختیار کر گئی۔ اب انہیں خشک آب و ہوا میں سانس لینے میں دشواری ہونے لگی تھی۔ وہ شمال کی جانب کوچ کرنا چاہتے تھے۔ انہیں وادی کشمیر سے بڑا لگاؤ تھا، وہ چاہتے تھے کہ کشمیر میں اپنے اُن باغات میں جا کر رہیں، جو انہوں نے اپنی نگرانی میں تعمیر کرائے تھے مگر یہ بات بھی اپنی جگہ ایک حقیقت تھی کہ وہ صرف اپنی بگڑتی ہوئی صحت کے باعث ہی کشمیر نہیں جانا چاہتے تھے بلکہ اُن کی نگاہیں شمال کے سربہ فلک پہاڑوں کے اُس پار جمی ہوئی تھیں، جہاں اُن کے آباؤ اجداد نے جنم لیا تھا۔ میں نے دہلی دہلی سرگوشیاں سنیں کہ وہ سمرقند پر حکمرانی کی خواہش رکھتے تھے۔

○○○

1031ھ (1621ء)

ارجمند بانو

دادا جان کے انتقال کی خبر ملی تو میرا اپنا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ بے اختیار میں نے اللہ سے شکوہ کیا کہ اگر اُس نے اپنی امانتیں ہم سے واپس لے لینی تھیں تو پھر وہ ماں، باپ، دادا، دادی، بھائیوں اور بہنوں جیسے پیارے اور عزیز پیدا ہی کیوں کرتا ہے، لیکن ظاہر ہے میرے شکوے کا کیا جواب ملتا کیونکہ یہ ایک اٹل حقیقت تھی کہ خود مجھے بھی ایک دن بہت سے پیاروں کو تنہا چھوڑ کر عالم برزخ کو لوٹ جانا تھا۔

دادا جان کا انتقال نیند کے دوران ہوا۔ فوری طور پر ہمیں طلب کر لیا گیا۔ اُن کا پُرسکون چہرہ دیکھ کر مجھے وہ غریب نوجوان یاد آ گیا، جس نے مقدر آزمائی کے لیے ایران سے ہندوستان تک کا سفر اختیار کیا اور پھر عظیم مغلیہ سلطنت کا مضبوط ستون بن کر ابھرا۔ اب وہ غریب نوجوان، بوڑھے اعتماد الدولہ کی شکنوں میں کہیں کھو گیا تھا۔ جوں جوں اُن کے انتقال کی خبر ملتی گئی، شہزادے، شہزادیاں۔۔۔ معززین، رانے، نواب، امیر اور عالم لوگ تعزیت کے لیے آتے گئے۔ ظل الہی نے اپنے اعتماد الدولہ، اپنی سلطنت کے مضبوط ستون، اپنے مشیر اعلیٰ اور سب سے قریبی ساتھی کے انتقال پر ایک ماہ کے سوگ کا اعلان کیا۔

میں بہت دیر اُن کے سرہانے کھڑی انہیں نکتی رہی اور منہ دبا دبا کر روتی رہی اور پھر ہماری آہ و بکا کی پروا کیے بغیر وہ کندھوں پر سوار ہو کر شہر خوشاں کی طرف کوچ کر گئے۔ سب کی حالت بری تھی، لیکن پھوپھو پر اُن کے انتقال کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ انہوں نے کئی روز کھانا نہ کھایا، بس تنہا بیٹھی جمنہ کی لہروں کو گھورتی رہیں۔ آخر کار انہیں بھی احساس

میں اُس وقت محبوبہ کا چولا اتار کر بیوی کے روپ میں آ گئی تھی۔ ”آخر مہابلی کی بھی تو چار سو بیویاں تھیں، آپ کو کس نے روکا ہے؟“

صاحب عالم نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ میرا یہ لہجہ اُن کے لیے نیا تھا۔ شاید شہزادوں کو بیویوں کی بیویانہ گفتگو سننے کا یا رانہ تھا۔ وہ کچھ دیر مجھے دیکھتے رہے، پھر کچھ کہے بغیر اُٹھے اور خواب گاہ سے باہر چلے گئے۔

پینتیس دنوں تک ہمارے درمیان ایک لفظ کا تبادلہ بھی نہیں ہوا۔ ہم دونوں نے ایک لمحے کے لیے بھی جدانہ ہونے کا عہد کیا تھا اور اب یوں لگتا تھا، جیسے پوری مغلیہ سلطنت ہمارے درمیان حائل ہو گئی ہو۔ یہ کرب اُس کرب سے کہیں زیادہ تھا، جو میں ماضی میں برداشت کرتی رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ جو بے چینی مجھے ہے، وہ اُدھر بھی ہوگی۔ مجھے یہ سن کر کوئی حیرت نہ ہوئی کہ صاحب عالم نے اس عرصے میں زنان خانے کا رخ بھی نہیں کیا تھا البتہ اس پر بے حد حیرانی ہوئی کہ انہوں نے اپنی زبان سے میرا نام بھی ادا نہ کیا تھا۔

○○○

میں صرف اپنے دادا حضور کے انتقال سے ہی افسردہ نہیں تھی بلکہ مجھے ایک اور بات کا بھی دکھ تھا۔ کچھ عرصہ پہلے میرے ذاتی طبیب نے متنبہ کیا تھا کہ میں اپنے ساتھ ظلم کر رہی ہوں اور اگر صورت حال یہی رہی تو میری زندگی بڑی مختصر ثابت ہو سکتی تھی۔ پہلے تو میں نے طبیب کی بات پر کوئی دھیان نہ دیا، لیکن کچھ ہی عرصے میں مجھے مسئلے کی سنگینی کا احساس ہونے لگا اور میں نے خود پر اور صاحب عالم پر کچھ پابندیاں لگانے کا فیصلہ کر لیا، لیکن جب اس کا اظہار میں نے اُن پر کیا تو وہ بڑی طرح چونک اُٹھے۔

”کیا تمہیں ہم سے محبت نہیں رہی ارجمند؟“ انہوں نے حیرت سے دریافت کیا۔
 ”نہیں صاحب عالم!“ میں تڑپ اُٹھی۔ ”خدا مجھے وہ دن نہ دکھائے جو آپ کی محبت سے خالی ہو۔“

”پھر کیا بات ہے؟“

”شاعی طبیب نے مجھے کہا ہے کہ میں چند برس ماں نہ بنوں، ورنہ زیادہ عرصہ جی نہ سکوں گی۔“

”ہم اُس کی کھال میں بھس بھروادیں گے۔“ شہزادے کا مغل خون جوش میں آ گیا۔ ”اُسے ایسی بات کرنے کی جرأت کیوں کر ہوئی؟“

”اس میں اُس کا کوئی قصور نہیں۔“ میں نے فوراً جواب دیا۔ ”میں خود دوبار ایک کر بناک عذاب سے گزر چکی ہوں اور اب نہیں چاہتی کہ میری گود آباد ہونے سے پہلے اُجڑ جائے۔“

”تو کیا ہم دوسری شادی کر لیں یا کنیزوں کو اپنے حرم میں داخل کر لیں۔“
 میں تڑپ اُٹھی۔ ”صرف دوسری ہی کیوں، تیسری، چوتھی اور پانچویں بھی کر لیں۔“

”دس ہزار اشرفیاں۔“ میں نے چونک کر اور خوشی سے بے قابو ہو کر جواب دیا۔
 ”لیکن ہمارے پاس تو کچھ نہیں۔“ صاحبِ عالم نے جواب دیا۔ ”کیا محبت کے دس
 ہزار سجدوں سے کام چل جائے گا۔“
 ”میرے لیے ایک ہی کافی ہے صاحبِ عالم!“ میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”اگر وہ جان
 ارجمند کی طرف سے ہو۔“

اور اُس رات جان خرم کے حضور دس ہزار سجدے ادا ہوئے تھے۔

ooo

”عیسیٰ!“ میں نے ایک عجیب سا فیصلہ کر کے اپنے ذاتی اور وفادار خدمت گار کو
 پکارا۔ ”آج رات تک مجھے پائیں باغ میں ایک دکان نما خیمہ تیار ملنا چاہیے۔“
 یہ بات میری عقل میں آگئی تھی کہ بادشاہ اور شہزادے سب مرم سے بنے ہوئے
 ہیں۔ وہ گوشت پوست کی بنی ہوئی ایک عورت کے سامنے کیسے جھک سکتے تھے، لیکن مجھے
 سب مرم کو زبان دینا آتا تھا۔

عیسیٰ نے مجھے حیرت سے دیکھا ضرور لیکن پوچھا کچھ نہیں، مجھے علم ہوا تھا کہ صاحبِ
 عالم روزانہ نصف شب تک کا وقت پائیں باغ میں گزارتے ہیں اور میں نے انہیں اپنے
 ڈھنگ سے منانے کا فیصلہ کیا تھا۔ عیسیٰ خاموشی سے واپس چلا گیا۔ مجھے علم تھا کہ میرا مطلوبہ
 خیمہ شام کے سائے ڈھلنے سے پہلے ہی تیار ہو جائے گا۔

اندھیرا اترتے ہی میں نے اپنا پیلے رنگ کا چوڑی دار پاجامہ گرتا اور سرخ پگڑی
 (توکہ) زیب تن کی۔ اپنے چاندی کے زیورات لیے جو ایک زمانے میں میری منٹھیوں میں
 پورے آجاتے تھے، لیکن اب اُن سے صندوق بھرے پڑے تھے۔ ان میں سے وہ۔۔۔
 زیورات میں نے پختے، جو مجھے سابقہ حوالوں سے یاد تھے، جو نہی مجھے اندازہ ہوا کہ اب
 صاحبِ عالم، باغ میں آنے والے ہوں گے میں نے خیمے میں جا کر اپنی جگہ سنبھال لی۔
 جب کہ عیسیٰ کچھ فاصلے پر درختوں کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔

میں نے چاندی کے زیورات اپنے سامنے پھیلا لیے اور اپنے محبوب کا انتظار کرنے
 لگی، لیکن اس انتظار میں اتنی محو ہوئی کہ مجھے اُن کے آنے کی خبر ہی نہ ہو سکی۔ چونکہ اُس وقت
 جب اُن کی مانوس آواز میرے کانوں میں پڑی۔

”جان خرم کے زیورات کی مالیت آج شب کتنی ہے؟“

ایک جاگیر کا مالک ہے۔“

”کیا تم اُس سے مل چکی ہو؟“

”نہیں۔“ اُس نے فوراً کانوں کو چھوا۔ ”لیکن مجھے علم ہے کہ وہ مجھے پسند کرتا ہے۔“

اُس نے مجھے یہ بھیجا ہے۔“ لاڈلی نے اپنی خوب صورت صراحی دار گردن میں پہنا ہوا چاندی

کا ہار میرے آگے کر دیا۔ ”میں نے اُسے اسی طرح کا سونے کا ہار تحفے میں۔۔۔ بھیجا ہے۔“

”ٹھیک ہے، میں پھوپھو سے بات کروں گی۔“ میں نے اُسے تسلی دی۔ حالانکہ مجھے خود

احساس تھا کہ میں کچھ نہ کر پاؤں گی۔ ”لیکن یہ کام خاصا مشکل ہے لاڈلی! تمہارا عرفان

حسن، شہزادہ شہریار کے مقابلے میں دو کوڑی کا بھی نہیں۔“

”تم ٹھیک کہتی ہو ارجمند!“ لاڈلی دل برداشتہ ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”امی جان کو

شہزادہ چاہیے خواہ وہ کاشھ کا ہی کیوں نہ ہو۔“

○○○

ایک صبح لاڈلی مجھ سے ملنے آئی۔ میں اُس کی صورت دیکھ کر حیران رہ گئی کیونکہ آج کی لاڈلی اُس لاڈلی سے بے حد مختلف تھی، جو ہمیشہ تروتازہ کلیوں کی مانند کھلی ہوئی ہلا کرتی تھی۔

”کیا پریشانی ہے جان؟“ میں نے پیار سے اُسے پہلو میں بٹھاتے ہوئے دریافت کیا۔

”میری شادی ہو رہی ہے۔“

”یہ تو خوشی کی بات ہے جان!“ میں نے ہنستے ہوئے اُس کے گال کی چٹکی بھری۔

”امی جان نے ذرا دیر قبل مجھے آگاہ کیا ہے کہ میری شادی، شہزادہ شہریار سے کی جا

رہی ہے۔“

میری ہنسی ختم گئی۔ ”کیا؟“ میں نے حیرت سے دریافت کیا کیونکہ شہزادہ شہریار کو عام

طور پر نکٹو شہزادے کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ وہ مجھے کبھی اچھا نہیں لگا تھا، عجیب سا چہرہ تھا

اُس کا۔ وہ ایک لونڈی کے بطن سے تھا اور ظل الہی نے اُس کی والدہ کو بہت سے تحائف اور

جائیداد کے ہمراہ میرٹھ بھجوا دیا تھا۔ یہ لاڈلی کے ساتھ ظلم تھا۔

”انکار کر دو۔“ میں خاموش نہ رہ سکی۔

”تم جانتی ہو کہ میں یہ نہ کر پاؤں گی ارجمند!“ لاڈلی سسبک پڑی۔ ”اس کے بعد جو

عذاب مجھے سہنے ہوں گے اُن سے بہتر ہے کہ میں ہاں کہہ دوں۔“ اُس نے میرا ہاتھ دبایا۔

”تم امی جان سے بات کرو۔ تمہاری حیثیت خاصی مستحکم ہے، تم مغلوں کی ہونے والی ملکہ ہو

تمہاری بات وہ یقیناً سنیں گی۔“

”میں پھوپھو سے کیا کہوں گی؟“ میں نے بوکھلا کر سوال کیا۔ ”کیا تم کسی اور کو پسند کرتی

ہو؟“

”ہاں۔“ لاڈلی گل احمر بن گئی۔ ”اُس کا نام عرفان حسن ہے اور وہ بڑودہ کے قریب

”مگر ہم اس سے اتفاق نہیں کرتے۔“ میں نے زور دے کر کہا۔ ”آپ لوگوں کو علم ہے کہ ظل الہی علیل ہیں اور اس وقت حکومت کی ہی نہیں، اُن کی عنان بھی ملکہ نور جہاں کے ہاتھوں میں ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ ان حالات میں۔۔۔ ظل الہی ہم میں سے کس کو منتخب کریں گے؟“

”اس طرح تو وہ منتخب ہوگا، جسے پھوپھو چاہیں گی۔“ ارجمند نے خوف زدہ سی سرگوشی کی۔ ”اور پھوپھو یہ بات بہ خوبی جانتی ہیں کہ میں لاڈلی نہیں ہوں جبکہ اُنہیں ایسا بادشاہ اور ملکہ چاہیے، جو اُن کے ہاتھوں میں کھیلیں۔“

ملکہ عالیہ نے بڑا زبردست کھیل کھیلا تھا۔ انہوں نے ایک جانب تو مجھے انعام کی آڑ میں سلطنت کی آخری حدوں کی جانب دھکیل دیا تھا اور دوسری جانب اپنے داماد کو۔۔۔ بادشاہت کی راہ پر چلانے کا آغاز کر دیا تھا۔

”ہمیں اب کیا کرنا چاہیے؟“ میں نے مشورہ طلب نظروں سے ارجمند اور اُس کے والد کی طرف دیکھا۔

”کچھ نہیں، صاحبِ عالم! آصف خان نے جواب دیا۔ ”آپ اور ہم سوائے انتظار کے کچھ بھی کیا سکتے ہیں۔ اگر آپ اچانک روانہ ہو جائیں گے تو ممکن ہے ظل الہی مشکوک ہو جائیں وہ ویسے ہی ان دنوں اپنی علالت سے پریشان ہیں اور کشمیر جانے کو پر تول رہے ہیں۔“

”کیا ظل الہی، پھوپھو کی سرگرمیوں سے آگاہ ہیں ابا جانی؟“ ارجمند نے دریافت کیا۔

”ہیں، ظل الہی نے شہزادہ شہریار اور لاڈلی کی شادی کی منظوری دے دی ہے۔ خود ظل الہی نے مسکراتے ہوئے مجھ سے فرمایا تھا کہ تم کیا جانو آصف خان! کتنے خوش قسمت ہو تم کہ تمہاری بہن سلطنتِ مغلیہ کی ملکہ اور اُس کی بیٹی ایک۔۔۔ شہزادی ہے۔“

”اور۔۔۔؟“

”بس اُنہوں نے یہی فرمایا تھا۔“

”کیا اُنہوں نے شہزادی ارجمند کے لیے کچھ نہیں کہا؟“

”نہیں!“ آصف خان نے سر جھکا کر جواب دیا۔ ”ہو سکتا ہے ظل الہی کی نظر میں یہ

شہاب الدین

مجھے یہ سن کر قطعاً کوئی خوشی نہ ہوئی تھی کہ ملکہ عالیہ نے ایک لونڈی کے بطن سے پیدا ہونے والے میرے بھائی کو اپنے داماد کی حیثیت سے منتخب کیا ہے۔ میں ذاتی طور پر بھی شہر یار کو پسند نہ کرتا تھا۔ وہ اکثر و بیشتر نشے میں دھت غلام گردشوں میں ادھر ادھر لڑکھڑاتا رہتا تھا۔ اُس کی زندگی مکمل طور پر اندھیرے کا شکار تھی، لیکن اب ملکہ عالیہ نے اُسے روشنی میں کھینچ لانے کو اپنا ہاتھ بڑھایا تھا۔

مجھے ویسے تو اس سے کوئی غرض نہ تھی کہ لاڈلی کی شادی کس سے ہوتی ہے، لیکن میں اس فیصلے کے پس منظر میں ملکہ عالیہ کی مستقبل شناسی کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ میرے والد بزرگوار اور شہنشاہ ہند کی محبوب ملکہ تھیں اور آسانی کے ساتھ مغلیہ تاج میرے علاوہ کسی اور کے سر پر رکھوا سکتی تھیں۔ اُنہیں تو کٹھ پتلی بادشاہ چاہیے تھا۔ وہ خواہ بے وقوف شہریار ہی کیوں نہ ہو۔

لیکن جب میں نے ان خدشات کا اظہار ارجمند سے کیا تو اُس نے فوری طور پر مجھ سے اتفاق نہ کیا۔

”پھوپھو ایسا نہیں کر سکتیں کیونکہ آپ ظل الہی کے سب سے بڑے صاحبزادے ہیں۔“

میں نے اپنے خسر آصف خان کی طرف دیکھا، جو اس وقت ہمارے ساتھ موجود تھے۔ اُنہوں نے بھی اپنی بیٹی کی۔۔۔ حمایت ہی کی تھی۔ ”مہر کی یہ کوشش اپنے دشمنوں میں اضافہ کرنے کے مترادف ہوگی۔“

دکن، آگرہ سے اتنی دور تھا کہ سرگوشیاں تو کیا حلق کے بل چیخے جانے کی صدا میں بھی مجھ تک نہ پہنچتیں۔

دربار سے میرا رابطہ صرف اور صرف آصف خان تھا، جس نے پابندی کے ساتھ مجھے تیز رفتار قاصد کے ذریعے تازہ ترین خبریں فراہم کرتے رہنے کا وعدہ کیا تھا۔
روانگی سے قبل میں نے ظل الہی سے ملاقات کی اور اُن سے اپنی کوتاہیوں کی معافی مانگنے کے ساتھ اپنے بھائی خسرو کو دکن ساتھ لے جانے کی اجازت بھی طلب کی۔
”وہ کئی برسوں سے محل میں قید ہے۔ ظل الہی! دکن کا سفر اُس کی ٹھہری ہوئی زندگی میں خوش گوار تبدیلی ثابت ہوگا۔“ میں نے حتی المقدور فرماں برداری سے عرض کیا۔
ظل الہی خاموش رہے، شاید وہ فیصلہ کر رہے تھے۔

”اس طرح وہ ظل الہی کی نگاہوں سے بھی دور ہو جائے گا کیونکہ جب بھی وہ آپ کے سامنے آتا ہوگا، آپ کے ذہن میں اُس کی غداہی کی یاد تازہ ہو جاتی ہوگی۔“ میں نے گرم لوہے پر آخری ضرب لگائی۔

”تم درست کہتے ہو مہترم!“ میں اپنے منصوبے میں کامیاب رہا تھا۔ ”اُسے ہماری نظروں سے دور کر دو۔“

چند دن بعد ظل الہی شمال کی جانب مراجعت کر گئے۔ اُن کا سفر لاہور تک کا تھا، لیکن مجھے علم تھا کہ کشمیر ابھی تک اُن کے ذہن میں ہے۔ روانگی سے قبل وہ مجھ سے اور خسرو سے گلے ملے تھے اور دعائیں دی تھیں۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ کون جانے اب ہم میں سے کوئی ایک دوسرے سے مل بھی پائے گا یا نہیں۔

ملکہ نور جہاں نے روانگی سے قبل میرے بھائی شہزادہ پرویز کو لاہور کا صوبے دار مقرر کر دیا تھا جبکہ لاڈلی اور شہریار کو وہ اپنے ساتھ لے گئی تھیں۔

شاہی قافلے کے جانے کے بعد میں چند دن آگرہ میں رُکا رہا اور پھر دکن کی طرف کوچ کر گیا۔

غیر ضروری ہو۔“

”یہ ابتدا ہے۔“ میں نے تبصرہ کیا۔ ”ظل الہی نے ہماری بیوی کو نظر انداز کر کے مستقبل ہم پر واضح کر دیا ہے۔“

ارجمند اور آصف خان خاموش رہے تھے۔ ظاہر ہے میری بات کا اُن دونوں کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

اور پھر۔۔۔ لاڈلی اور شہریار رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ میں طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے تقریب میں شریک نہ ہوا جبکہ ارجمند بھی نہ جاسکی کیونکہ اُس نے ایک بچی کو جنم دیا تھا، جو اپنی پیدائش کی چند ساعتوں کے بعد ہی اللہ کو پیاری ہو گئی تھی۔ البتہ مجھے یہ علم ضرور ہو گیا تھا کہ شادی، میری شادی کی طرح ہی شاندار تھی۔

شادی کے فوراً بعد ملکہ نور جہاں نے اپنے منصوبوں پر عمل کرنے کی ابتدا کر دی، مجھے فوری طور پر دکن روانگی کے احکامات دیے گئے تھے۔

”اب بھی ایسا ہی ہوگا۔ آخر ہم ظل الہی کی پہلی اولاد ہیں۔“
 ”لیکن ملکہ کی نہیں۔“ خسرو نے جواب دیا۔ ”میرا مشورہ مابو تو اُسے قتل کرادو۔“
 ”پھر وہی فضول باتیں، اب اگر تم نے ایسی کوئی بات کی تو ہم تمہیں زبردستی یہاں سے
 اٹھوانے پر مجبور ہو جائیں گے۔“
 ”مگر جلد ہی تمہیں احساس ہو جائے گا کہ تم نے خسرو کی بات نہ مان کر بہت بڑی غلطی
 کی ہے۔“

”لیکن خسرو! ملکہ عالیہ کی جان کیوں لینا چاہتا ہے؟“ میں نے دریافت کیا۔
 ”اپنی جان بچانے کے لیے۔“ خسرو نے کھٹ سے جواب دیا۔ ”اُس کی زندگی میری
 موت ہے اور میں اس وقت تخت چاہتا ہوں نہ کفن۔۔۔“

ooo

خسرو بہ دستور طلائی زنجیر سے بندھا ہوا تھا۔ وہ اب اپنے پہرے داروں سے خاصا
 بے تکلف ہو گیا تھا۔ بے شک خسرو بینائی سے محروم تھا مگر مجھے اُس پر اور اُس کے پہرے دار
 دونوں پر ہی اعتماد نہ تھا۔ اس لیے میں نے علامہ سعد اللہ خان کو ہدایت کی تھی کہ وہ دونوں پر
 کڑی نظر رکھیں۔ کبھی کبھی مجھے یہ بھی خیال گزرتا کہ خسرو کو کم ہی سہی لیکن نظر ضرور آتا ہے۔
 اسی لیے میں نے اپنے سفر کی پہلی منزل میں اسے اپنے کام سے کام رکھنے کی ہدایت کر دی
 تھی۔

”لیکن مجھے تو بتایا گیا تھا کہ میں بھائی کی محبتوں کا ہم سفر ہوں۔“ خسرو نے حیرت
 سے کہا۔

”یوں سمجھو کہ تمہاری قید پر ترس کھایا گیا ہے۔“ میرا جواب خاصا ظالمانہ نوعیت کا تھا۔
 ”قید؟“ خسرو نے قہقہہ لگایا۔ ”سنہری قید، اب تو یہ اتنی پرانی بات ہو گئی ہے کہ میں
 نے اس کی وجوہات کے بارے میں ہی سوچنا چھوڑ دیا ہے۔ اب تو میں صرف یہ سوچتا ہوں
 کہ ملکہ نور جہاں نے اپنی بیٹی کی شادی شہزادہ شہریار سے کیوں کی اور ولی عہد سلطنت کو اپنے
 اندھے بھائی کو ساتھ لانے کی کیا ضرورت تھی؟“

”فضول باتیں مت کرو۔“ میں نے اُسے ڈانٹا۔ ”خاموشی سے کھانا کھاؤ اور آرام
 کرو۔ ہمیں ابھی اپنے امراء کے ساتھ صلاح مشورہ کرنا ہے۔“

”اوہ، مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں ایک اہم بھائی کا اندھا اور بے مصرف ہم سفر ہوں۔“
 خسرو نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”کاش میری آنکھیں ہوتیں تو میں تمہاری طرح
 یہاں صحراؤں کی خاک چھاننے کے بجائے، اُن ہزاروں سواروں کا سربراہ ہوتا جو ظل الہی
 کے ایک حکم پر جان قربان کرنے کو تیار ہیں۔“

”کچھ نہیں صاحبِ عالم!“ اس سے پہلے کہ میر بخشی جواب دیتا، ایک بندھا ہوا آدی بول اٹھا۔

میں نے چونک کر اُس گستاخ کی طرف دیکھا، لیکن کہا کچھ نہیں۔ صدر اعلیٰ کو ریش بجا کر کچھ قریب آ گیا تھا۔

”یہ تینوں اس گاؤں کے ٹھا کر کو جان سے مارنا چاہتے تھے صاحبِ عالم!“ صدر اعلیٰ نے بتایا۔ ”ہم نے ایک انسانی زندگی بچائی ہے۔۔۔“

”گستاخی معاف صاحبِ عالم! یہ جھوٹ بولتے ہیں۔“ پہلے والا آدی دوبارہ بولا۔ ”ٹھا کر ایک شیطان آدی ہے۔ اُس نے میری خوب صورت بیوی کو اغوا کر کے کئی روز اپنے پاس رکھا اور جب وہ اس سے اکتا گیا تو اُسے اپنے آدمیوں کے حوالے کر دیا۔ وہ بے چاری اُن کے ظلم سے مر گئی۔“

”تو تم نے انصاف کیوں طلب نہیں کیا؟“

”انصاف؟“ اُس نے عجیب سے انداز میں کہا۔ ”ٹھا کر مسلمان ہے صاحبِ عالم! وہ میر بخشی اور صدر کا دوست بھی ہے جبکہ میں ایک غریب ہندو ہوں۔ میں نے ان لوگوں سے انصاف طلب کیا تھا صاحبِ عالم! لیکن انہوں نے مجھے اپنے آدمیوں سے باہر پھنکوا دیا تھا، چنانچہ میں نے اپنے طور پر انصاف کا فیصلہ کیا۔“

”تمہارا نام کیا ہے؟“

”ارجن لال، صاحبِ عالم! یہ میرا بھائی ہے پریم چند اور وہ رام لال ہے، میرے چچا کا بیٹا۔“

میں صدر کی طرف پلٹا۔ ”کیا یہ درست ہے؟“

”یہ کبھی ہمارے پاس شکایت لے کر نہیں آیا صاحبِ عالم! یہ کہانی اس نے ابھی گھڑی ہے۔“ صدر نے سر جھٹکا کر جواب دیا لیکن میں جانتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔

”تمہاری بیوی کا نام کیا تھا؟“

”للیجا، صاحبِ عالم!“

میں نے گھوڑا موڑ لیا۔ انداز ایسا ہی تھا کہ میں روانہ ہو رہا ہوں۔

”میر بخشی! انہیں رہا کر دو اور ہم ٹھا کر کو پھانسی دینے کے احکامات صادر کرتے ہیں۔“

○○○

گرمی غضب کی تھی۔ ارجمند بدستور رتھ میں سفر کر رہی تھی، لیکن اُس نے مجھ سے سفر کی کسی صعوبت کا ذکر نہیں کیا تھا بلکہ اس کے برعکس میں جب بھی اُس کے پاس گیا اُس نے محبتوں کا دامن پھیلا کر میرا استقبال کیا تھا اور جب وہ میرے پاس ہوتی تھی اُس وقت میں خود کو دنیا کا سب سے زیادہ طاقت ور اور خوش قسمت ترین فرد تصور کیا کرتا تھا۔

شہزادہ دارا کو میں ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ وہ میرے پہلو میں ایک سفید گھوڑی پر سفر کرتا تھا۔ جبکہ باقی بچے ارجمند کے ساتھ رتھ میں ہی ہوتے تھے۔

شہزادہ شاہ شجاع اور شہزادہ مراد بہت فرماں بردار قسم کے لڑکے تھے، لیکن شہزادہ اورنگ زیب میں خودداری اور آزادی کا جذبہ گھٹ کر بھرا ہوا تھا۔

اُس نے کئی مرتبہ مجھ سے شہزادہ دارا کی طرح گھڑسواری کی اجازت طلب کی تھی، لیکن میں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ وہ ابھی بچہ ہے۔ وہ خاموش تو ہو گیا تھا، لیکن میرے علم میں تھا کہ میری بات اُسے پسند نہیں آئی۔

سفر خاصی سست رفتاری سے جاری تھا، جہاں بھی ہمارا قیام ہوتا، علاقے کے جاگیردار اور امراء حاضری دیتے۔ برہان پور پہنچنے سے دو روز قبل ہمیں میر بخشی کی قیادت میں سو سواروں کا ایک دستہ ملا۔ صوبے کا صدر اعلیٰ بھی اُن کے ہمراہ تھا جبکہ قریب ہی زمین پر تین افراد بندھے۔۔۔ پڑے تھے۔

میں نے فوراً میر بخشی اور صدر اعلیٰ (وزیر مذہبی امور) کو طلب کر لیا جبکہ خود بندھے ہوئے آدمیوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اُن میں سے دو بُری طرح زخمی تھے جبکہ ایک کے جسم پر مجھے زخم کا کوئی نشان نظر نہ آیا تھا۔ البتہ دوسروں کی طرح وہ بھی گرد میں بُری طرح اٹا ہوا تھا۔

”ان کا قصور کیا ہے؟“ میں نے میر بخشی سے دریافت کیا۔

شہنشاہ ہند کی علالت تشویش ناک صورت اختیار کر گئی تھی اور وہ موت وزیست کی کش مکش میں مبتلا تھے۔

”سعد اللہ خان کو ہمارا پیغام دو کہ دو قابل اعتماد آدمیوں کو لے کر فوراً ہمارے حضور حاضر ہو۔“

میں نے عیسیٰ کو حکم دیا اور خود آگے بڑھ گیا۔ میرا رخ خسرو کے کمرے کی جانب تھا۔

ooo

برہان پور ویسا ہی تھا، جیسا میں چھوڑ کر گیا تھا۔ محل کے درو بام بھی وہی تھے اور اُن میں رچی ہوئی سوندھی، سوندھی مہک بھی پُرانی ہی تھی۔ لگتا تھا میرے بعد وقت رُک گیا تھا۔

برہان پور پہنچ کر ارجمند نے ایک بچی کو جنم دیا لیکن وہ ہفتے بھر میں اللہ کو پیاری ہو گئی مگر آفرین ہے ارجمند پر کہ میں جب اُس سے ملنے گیا تو اُس نے اپنے دکھ اور تکلیف کا ذکر تک نہیں کیا بلکہ دیر تک میرے مسائل کے بارے میں باتیں کرتی رہی۔

”ہر بار کامیابی آپ کے قدم چومتی ہے، میرے شہزادے!“ اُس نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔ ”ذرا پھوپھو کے بارے میں۔۔۔ سوچیں، آپ کے سامنے اُن کی قوت کچھ بھی نہیں۔“

”لیکن ہم آگرے سے اتنی دُور بیٹھ کر ایسا۔۔۔“

”نہیں شہزادے! آپ اب بھی طاقت ور ہیں۔ آپ یہاں کے بادشاہ ہیں۔“ اُس نے کھڑکی سے باہر دُور تک پھیلی پہاڑیوں کی جانب اشارہ کیا۔ ”آپ اتنے بہت سے آدمیوں کے آقا ہیں۔ اس زمین کے مالک ہیں۔ ظل الہی آپ سے یہ سب نہیں چھین سکتے۔ یہ آپ کا مفتوحہ علاقہ ہے۔“

میری شہزادی سچ کہتی تھی۔ میں یہاں کا عظیم مغل تھا میں نے خود کو شہنشاہ ہند کا معتمد تسلیم کر لیا تھا۔

ہم دیر تک باتیں کرتے رہے اور پھر جانے کب میں اُس کی زلفوں کی چھاؤں تلے نیند کی سُنہری وادیوں میں کھو گیا۔۔۔ رات کے آخری پہر عیسیٰ نے مجھے نیند سے بیدار کیا۔ میں اپنی شہزادی کو سوتا چھوڑ کر خاموشی سے غلام گردش میں نکل آیا۔ آصف خان کا ایلچی میرا منتظر تھا اور وہ ایک اہم پیغام لے کر آیا تھا۔

ملکہ کی قبر کے تعویذ کے جنگلے اور اس کے اوپر نصب عظیم الشان فانوس کی تعمیر میں سونے کی ڈلیوں کی ایک ہزار چھتیس بوریاں استعمال ہوئی تھیں۔

دروازوں کے لیے اسی قدر چاندی استعمال کی گئی تھی۔ اندرونی آرائش و زیبائش کے لیے جو پھول اور پودے بنائے گئے تھے۔ ان میں ہر وہ قیمتی پتھر جزا گیا تھا، جس کا تصور کسی بھی انسانی ذہن میں آ سکتا تھا۔

الماس (ہیرے) یا قوت (لعل) زمرد، درناب (موتی) پکھراج، نیلم، فیروزہ، عقیق، بلور، یشب (سنگ سلیمانی) روداکھ، اوپل، مونگا، سنگ سفید، زرغون، درشہوار، درنجف، عقیق سیاہ، درآب، سنگ یمنی۔۔۔

یہ قیمتی پتھر ریاضی کے اصولوں اور اپنے وقت کے قابل ترین جوہریوں کے مشورے سے لگائے گئے تھے۔ ان کا مقصد صرف خوبصورتی اور روشنیوں کے زاویے تبدیل کرنا نہیں تھا، بلکہ اس بات کا خیال رکھا گیا تھا کہ تابوت پر ان پتھروں کے سعد اثرات مرتب ہوں۔ مقبرے میں استعمال ہونے والا زیادہ تر سنگ مرمر راجپوت شہزادوں نے بطور تحفہ فراہم کیا تھا اور بیس ہزار سے زائد مزدوروں اور کاریگروں نے کئی سال تک دن رات اس کی تعمیر کے لیے کام کیا تھا۔

اس پر اٹھنے والے اخراجات کا کوئی تخمینہ نہیں تھا، لیکن کہا جاتا تھا کہ اگر پوری مغلیہ سلطنت بھی کوڑی کوڑی کوٹھاج ہو جاتی، تب بھی تاج محل کی تکمیل ہر حال میں ہوتی۔ لوگ تاج محل کی خوبصورتی دیکھ کر تخت طاؤس کا حسن و جمال فراموش کر بیٹھے تھے، جسے شہنشاہ شاہ جہاں نے ہی تعمیر کرایا تھا۔

تخت طاؤس اب بھی دیوان خاص میں موجود تھا، لیکن وہ ملکی روشنیوں اور سوگوار فضا میں دھندلا سا گیا تھا۔

یہ مکمل سونے کا تخت تھا، جسے سونے کے بنے ہوئے چار شیروں نے اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا تھا۔ تخت تین ہاتھ چوڑا اور کوئی پانچ ہاتھ لمبا تھا، جس پر نرم ریشمی گدیے بچھے ہوئے تھے۔ اس کے اوپر سونے کا بنا ہوا ایک چتر تھا، جسے انسانی بازوؤں جتنے موٹے بارہ ستونوں نے سہارا دے رکھا تھا۔ یہ ستون بھی خالص سونے کے تھے اور ان میں زمرد

1056ھ (1646ء)

ممتاز محل

مقبرہ اتیار ہو گیا تھا مگر بہت سا کام باقی تھا۔ نیلے آسمان کے پس منظر میں وہ سفید اور شفاف برف کا کوئی بہت بڑا تودہ نظر آتا تھا۔ سورج کی روشنی میں اس کا دیو قامت سایا اس چھوٹے سے جلوس پر پڑ رہا تھا، جو جہنما کے کنارے بنی ہوئی بدہیئت اور چھوٹی سی بے ترتیب عمارت سے اس کی جانب بڑھ رہا تھا۔

آگے آگے مولانا حضرات تھے، جو قرآنی آیات کا ورد کر رہے تھے۔ ان کے عقب میں شہنشاہ ہندوستان، شاہ جہاں پیدل چل رہا تھا۔ آج جلوس کے آگے کوئی نقیب نہیں تھا اور نہ ہی شاہی سواری کی آمد کا روایتی اعلان ہوا تھا۔

شاہ کے پیچھے شہزادہ شاہ شجاع، شہزادہ اورنگ زیب اور شہزادہ مراد بادب چل رہے تھے۔ شہزادوں کے عقب میں شہنشاہ ہند کی محبوب ملکہ ممتاز محل کا سنگ مرمر کا بنا ہوا تابوت، غلاموں نے کندھوں پر اٹھا رکھا تھا، جسے پرانے مقبرے سے جہاں اسے امانتاً دفن کیا گیا تھا۔ محبت و وفا کی عظیم الشان یادگار، تاج محل میں دفن کرنے کے لیے لے جایا جا رہا تھا۔

مقبرہ ابھی مکمل نہیں ہوا تھا، لیکن شہنشاہ شاہ جہاں نے تابوت وہاں دفن کیے جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

سامنے کا تختہ ابھی تعمیر ہونا باقی تھا۔ یہ تختہ ایک عظیم الشان سنگ مرمر کی جھیل کی صورت میں ہوتا۔ جس میں دُور سے مقبرہ تیرتا ہوا دکھائی دیا۔ میناروں، دو مسجدوں اور باغ کی تعمیر بھی ابھی باقی تھی۔

جڑے ہوئے تھے۔

چتر کے اوپر دو سنہرے مور تھے، جو زندہ موروں سے زیادہ خوب صورت اور جاذب نظر لگتے تھے۔ زرد جواہر سے آراستہ ان کے پر وہی روشنیاں منعکس کرتے تھے جو اصل مور کے پر کرتے تھے۔ ان کے درمیان ایک درخت تھا جس پر زمر، موتیوں، یاقوت اور ہیروں کے پھل لگے ہوئے تھے۔ شاہی جوہری عبادت خان کو اس کی تکمیل میں سات سال کا عرصہ لگا تھا۔

لیکن اس وقت یہ تخت ویران پڑا تھا۔

ooo

حمیری

مورتی نے جلوس جنازہ پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔۔۔ وہ بدستور اپنے کام میں مصروف رہا تھا۔ یوں بھی سیتا کے مرنے کے بعد وہ تنہا رہ گیا تھا اور اب اسے اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔

اس کی ارٹھی کے سرہانے کھڑا ہو کر وہ بہت رویا تھا۔ اسے اس کے ساتھ بیٹے ہوئے دن بے حد یاد آئے تھے۔ سیتا کی جوانی اور اس کے کھلنے والے قہقہے اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔ گاؤں کی وہ الہڑیٹا یاد آئی تھی، جو اس کے بڑے بھائی کی محبوبہ تھی، لیکن بھگوان نے وہ کرشمے کر دکھائے تھے کہ بھائی کے بجائے اس کی بیوی بن گئی تھی۔ یہ یاد کر کے وہ اداس سا ہو گیا۔ وہ خود کو مجرم تصور کرنے لگا تھا۔ سیتا بہت صابر عورت تھی، اس نے زندگی بھر کبھی بھول کر بھی اس شخص کا نام نہ لیا تھا، جو اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا، لیکن مورتی اس کے لیے خود کو ہی مورد الزام ٹھہراتا تھا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر سیتا سے معافی مانگی تھی لیکن اسے معاف کر دینے والی اب دور جا چکی تھی۔۔۔ اتنی دُور کہ جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا۔

سیتا کا آخری دیدار کرنے والوں میں عیسیٰ بھی شامل تھا۔ اس نے گلاب کے پھولوں میں گھرا ہوا اس کا پرسکون چہرہ ضرور دیکھا تھا، لیکن اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ شمشان گھاٹ جا کر سیتا کی جلتی ہوئی چتا بھی دیکھتا۔

ooo

ہر شام وہ قلعے کے اطراف میں نکل جاتا اور ہر آنے جانے والے سے عیسیٰ کے بارے میں دریافت کرتا۔ ہر شخص اسے مختلف کہانی سنانا۔ وہ غلام، ملازم، دوست، وزیر۔۔۔ شعبہ باز اور ماہر فلکیات تھا۔ وہ کوئی خطاب یافتہ نہیں تھا۔ نہ اس کے پاس کوئی جاگیر یا ذات تھی۔ کوئی بھی صحیح طور پر عیسیٰ کے بارے میں وضاحت نہ کر پایا تھا۔۔۔ خود مورتی نے ایک آدھ بار بہت فاصلے سے عیسیٰ کی جھلک بھی دیکھی تھی، لیکن وہ اس قدر دور تھا کہ پہچانا نہیں جا سکتا تھا۔

آخر کار شہنشاہ ایک روز مقبرے کی تعمیر کے کام کا جائزہ لینے کی غرض سے تشریف لائے۔ مورتی نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور ایک پہرے دار کے پاس جا پہنچا۔

”عیسیٰ کون ہے؟“ اس نے سرگوشی میں پوچھا۔

”وہ رہا۔“ پہرے دار نے ایک جانب اشارہ کیا۔

مورتی نے پلٹ کر ادھر دیکھا۔ اسے ریشمی پوشاک میں لپٹا ہوا اپنا بھائی ایشور کا بھوت نظر آیا تھا۔ برسوں گزر گئے تھے اسے گاؤں چھوڑے۔ وہ بہت بدل گیا تھا۔ لیکن اتنا بھی نہیں کہ وہ اسے پہچان نہ سکتا۔

”ایشور۔“ اس نے عیسیٰ کے بالکل قریب پہنچ کر اسے پکارا۔

ریشمی لبادے والا پلٹا۔ ایک لمحے کے لیے ٹھنکا اور پھر مورتی کی جانب بڑھ آیا۔

”تم ایشور ہوتا؟“

”ہاں“ عیسیٰ نے جواب دیا۔

دونوں نے ہاتھ ملایا نہ گلے لگے۔ وقت نے ان کے دلوں سے رشتوں کی محبتیں بھی سلب کر لی تھیں۔

”وزیر کو تم نے مروایا تھا؟“

”ہاں۔“ عیسیٰ نے کہا۔ ”اس نے مجھے دھمکی دی تھی۔۔۔ کہ وہ ظل الہی کو میری اصلیت بتا دے گا۔ میں نے اس سے پہلے ظل الہی سے فریاد کی اور درخواست کی کہ اسے ہاتھی کے قدموں تلے روند دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔“

”تم کون ہو؟“ مورتی نے اچنبھے سے دریافت کیا۔ اسے عیسیٰ کا یہ اثر رسوخ ہضم نہیں

مورتی، شمشان گھاٹ سے جب واپس آیا تو عیسیٰ اسے جھونپڑی کے دروازے پر مختصر ملا تھا۔

”وہ مجھے تنہا چھوڑ کر چلی گئی ہے۔“ مورتی سسک پڑا۔

”میں جانتا ہوں۔“ عیسیٰ نے بڑا مختصر سا جواب دیا۔

”میرے خیال میں وہ زندگی بھر ایک ہی شخص سے محبت کرتی رہی، اور وہ تم تھے۔“

مورتی نے سسکیوں کے درمیان کہا۔

”میں اس سے شاید کبھی اچھا سلوک نہ کر سکا تھا۔“

”کیا تم نے اس سے پوچھا تھا؟“

”کبھی نہیں۔“ مورتی نے جواب دیا۔ ”تم ہمارے لیے ایک بدروح تھے اور بدروحوں

کا ذکر نہیں کیا کرتے، ہاں، جب وہ مجھے دیکھتی تو یوں لگتا تھا جیسے میرے چہرے میں وہ تمہارا چہرہ تلاش کر رہی ہو۔“

عیسیٰ خاموش ہو گیا۔ مورتی نے بھی اسے نہیں بلایا۔ بالآخر عیسیٰ خود ہی گویا ہوا۔

”تمہیں کسی شے کی ضرورت تو نہیں۔“

”نہیں!“ مورتی نے جھلا کر کہا اور عیسیٰ کو وہیں چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔

اپنی اندھیری کوٹھڑی میں بیٹھ کر وہ بہت دیر آنسو بہاتا رہا۔ اپنی سیتا کو یاد کرتا رہا اور پھر

اس کے خیالات کا دائرہ عیسیٰ پر سمٹ آیا۔

وزیر کو ہاتھی کے پاؤں تلے روندے جانے کے بعد مورتی کے ذہن میں تجسس بیدار ہو

گیا کہ وہ عیسیٰ کے بارے میں معلوم کرے۔ اس عیسیٰ کے بارے میں، جس کے حکم پر وزیر کو

پھانسی دے دی گئی تھی۔

ہوا تھا۔

”میں ظل الہی کا ادنیٰ خادم ہوں۔“

”کیا تم نے ملکہ عالیہ کو دیکھا تھا؟“ مورتی کا پرانا سوال اس کے لبوں پر آ گیا۔

”میں نے برسوں آغاچی کی خدمت کی ہے۔“ عیسیٰ نے جواب دیا تو مورتی نے اپنا

بھاری سر ہلا دیا۔ حالانکہ وہ آغاچی کا مطلب نہیں سمجھا تھا۔ ”ظل الہی مجھے کبھی سزا نہیں دیں

گے۔“

”کیوں؟“ مورتی نے پوچھا۔

”میں ملکہ ممتاز محل کی یادگار ہوں۔“ عیسیٰ نے جواب دیا۔

ooo

1031ھ (1621ء)

ارجمند بانو

میں نے نیند میں ہونے کے باوجود محسوس کر لیا تھا کہ صاحب عالم اپنے بستر پر نہیں۔

میں فوراً اٹھ بیٹھی۔ باہر سے۔۔۔ سرگوشیاں سی سنائی دیں تو میں باہر لپکی۔ صاحب عالم،

شہزادہ خسرو کے کمرے کی جانب جا رہے تھے۔ کچھ اور سائے بھی اُن کے پیچھے تھے۔

عیسیٰ کچھ فاصلے پر کھڑا تھا، مجھے دیکھ کر وہ میری طرف بڑھا۔

”کیا ہو رہا ہے عیسیٰ؟“

”ظل الہی شدید علیل ہیں۔“ اُس نے سرگوشی کی۔

”صاحب عالم نے کیا طلب فرمایا ہے؟“

”علامہ سعد اللہ خان اور چند سپاہی۔“

میں تیز قدموں سے غلام گردش میں آگے بڑھی حتیٰ کہ میں بھاگنے لگی تھی۔ علامہ سعد

اللہ خان دو پہرے داروں کے ہمراہ شہزادہ خسرو کے کمرے کے دروازے پر استادہ تھے۔

”شہزادہ عالم کہاں ہیں؟“

”وہ اندر تشریف رکھتے ہیں، شہزادی حضور!“ علامہ نے جواب دیا۔ ”کیا میں انہیں

آپ کی آمد کی اطلاع دوں؟“

”نہیں۔“ میں نے جواب دیا اور اندر داخل ہو گئی۔ سامنے ہی دونوں بھائی ایک

دوسرے کے قریب کھڑے تھے۔

”تخت یا تختہ!“ مجھے شہزادہ خسرو کی آواز سنائی دی۔

آپ کے جد امجد نے تین سو سال پہلے کہا تھا۔۔۔ اپنے بھائیوں کو قتل مت کرنا، خواہ وہ کتنے ہی بڑے مجرم کیوں نہ ہوں۔ اُس وقت سے لے کر ہر شہزادے نے اس قانون کا احترام کیا ہے۔ حضرت بابر، حضرت ہمایوں، مہابلی اور ظلی الہی، تمام شہنشاہوں نے اس کی پابندی کی ہے۔ یہی پابندی تھی جس کی وجہ سے ظلی الہی نے اُس کی جان لینے سے پرہیز کیا۔ خسرو، آپ کا اپنا خون ہے شہزادے! اسے مت اُچھالیں۔ اس کے داغ آپ کی آئینہ نسلیں بھی نہ دھو سکیں گی۔“

صاحب عالم نے قہقہہ لگایا اور مجھے قریب کھینچ لیا۔ ”ہمیں علم نہیں تھا کہ ہم نے جس لڑکی سے شادی کی ہے۔۔۔ وہ خوب صورت ہی نہیں قابل بھی ہے۔ اپنی یہ توانائیاں اُس وقت کے لیے بچا رکھو، جب ہم تخت نشین ہوں گے۔“

”مجھے انسانی خون میں رنگا ہوا تخت نہیں چاہیے۔“ میں نے انہیں پیچھے دھکیل دیا۔ ”مجھے علم نہیں تھا کہ عظیم مغلوں نے اپنے تخت کی قیمت اتنی زیادہ مقرر کر رکھی ہے۔“

”اپنی بیوی کی بات مان لو شہزادے!“ ہمارے عقب سے شہزادہ خسرو کی آواز اُبھری۔ ”میں مرنے سے خوف زدہ نہیں، لیکن تم تیموری قانون کی پاس داری کرو۔ میں حلفیہ کہتا ہوں کہ تمہاری خاطر کبھی تخت کا نام بھی نہ لوں گا۔“

صاحب عالم نے اس پر کوئی توجہ نہ دی بلکہ وہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔ ”ہم نے تمہاری باتیں سن لی ہیں شہزادی! ہم اپنے اجداد کے قوانین کا احترام ضرور کرتے ہیں، لیکن افسوس کہ ہم خسرو کو زندہ رہنے کی اجازت بھی نہیں دے سکتے۔“

”اور پرویز اور شہریار کا کیا ہوگا؟“ خسرو نے دریافت کیا۔ ”وہ دونوں تو لاہور میں ہیں اور پوری مغل سپاہ اُن کے ارد گرد موجود ہے۔“

”خدا کے لیے شہزادے!“ میں نے دوبارہ صاحب عالم کا دامن تھام لیا۔ ”مجھے میری محبت کی بھیک کے طور پر ہی خسرو کی زندگی بخش دیں۔“

مگر شاید شہزادے، بھیک بھی نہیں دیا کرتے تھے۔ میری تمام تر التجاؤں کے باوجود شہزادہ خسرو زندہ نہ رہ سکا۔ میں دن بھر روتی رہی، لیکن کسی نے میری عزائم نہ کی۔ انہوں نے خسرو کے گلے میں پھندا لگا کر اُسے مار دیا اور پھر عام آدمیوں کی طرح کسی

”تخت!“ لفظ بھر بعد مجھے اپنے شہزادے کا جواب ملا۔

”نہیں۔“ میں نے بے اختیار بول اٹھی۔

صاحب عالم نے چونک کر مجھے دیکھا، لیکن انہوں نے۔۔۔ اپنی جگہ سے حرکت نہ کی۔ ”جاؤ! یہاں تمہارا کوئی کام نہیں شہزادی!“ صاحب عالم کی تیز اور سخت آواز آئی۔

”کیوں؟“ خسرو نے مداخلت کی۔ ”کیا میرا بھائی یہ نہیں چاہتا کہ ہندوستان کی ہونے والی خوب صورت ملکہ میری موت کی گواہ بنے؟“ وہ میری طرف مُڑا۔ ”اس کا خون بھی وہی ہے جو اُس خود ساختہ ملکہ کا ہے۔ اسی نے تمہیں میرے قتل کے لیے بھیجا ہوگا۔“

صاحب عالم، شہزادہ خسرو کو کوئی جواب دینے کے بجائے میری طرف بڑھے اور مجھے بازو سے پکڑ کر غلام گردش میں لے آئے۔

”خدا کے لیے آپ شہزادہ خسرو کو قتل نہ کریں۔“ میں نے دھیمی آواز میں انہیں مشورہ دیا۔ ”میں آپ سے التجا کرتی ہوں اُسے قتل نہ۔۔۔“

”یہ فیصلہ ہو چکا ہے۔“ صاحب عالم کی کرخت آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ”اُس کا سایا اب بھی تخت پر پڑ رہا ہے، اُسے کفن میں گم ہو جانے دو۔“

”اُسے ملک بدر کر دیں۔“ میں نے ہذیبی انداز میں مشورہ دیا۔ ”اُسے قید رکھیں، جیل میں ڈال دیں، میرے محبوب مگر خدا کے لیے اُسے قتل نہ کریں۔“

صاحب عالم نے ناراض نگاہوں سے مجھے گھورا۔ وہ اُس سے میرے محبوب لگ ہی نہیں رہے تھے۔

”تمہیں ہمارے بھائی سے کیا دلچسپی ہے؟“

”کوئی نہیں۔“ میں چیخ اٹھی۔ میری جگہ کوئی اور یہ جرات کرتا تو صاحب عالم اُسے زندہ زمین میں دفن کر دیتے۔ ”میں صرف آپ سے اپنی محبت کا تحفظ چاہتی ہوں۔ اُس کی

موت ہمارے لیے تباہی کا باعث بن جائے گی۔ اُس کی بددعاؤں ہمیں اور ہمارے بچوں کو کھا جائیں گی۔ اُسے دیکھیں صاحب عالم! اُس کے اندھے پن نے پہلے ہی ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا، اُس کی موت ہمیں بھی مار ڈالے گی۔ اگر آپ نے اُسے قتل کر دیا تو آپ پہلے

فرد ہوں گے جو حضرت تیمور کے قوانین کی خلاف ورزی کریں گے۔ حضرت تیمور نے۔۔۔

نامعلوم جگہ دفن کر دیا۔ مجھے اُس کی قبر کے بارے میں بھی نہیں بتایا گیا، لیکن اس سے فرق بھی کیا پڑتا۔ آخر اور بھی تو بے شمار لوگ تھے، جنہیں زمین نے اپنے اندر پناہ دے رکھی تھی اور کوئی نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہیں؟

شہزادہ خسرو اپنی زندگی کی جنگ ہار گیا۔ لیکن ظل الہی کو فتح نصیب ہوئی۔ قاصد یہ خبر لے کر پہنچا کہ شہنشاہ ہند صحت یاب ہو گئے ہیں۔

چند روز کے وقفے کے بعد ظل الہی کا خصوصی ایٹلی برہان پور میں وارد ہوا۔ وہ دلی عہد سلطنت کے نام ایک خصوصی اور اہم پیغام لے کر آیا تھا۔

”ہمیں خبر ملی ہے کہ چالیس روز قبل شہزادہ خسرو درو قونج سے اللہ کو پیارا ہو گیا۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ اُس کی مغفرت فرمائے۔ ہمیں اپنے خصوصی ذرائع سے یہ خبر بھی ملی ہے۔۔۔۔۔ کہ ایران کے شہنشاہ عباس نے قدحار کی جانب پیش قدمی شروع کر دی ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ ہم اپنی قوت سے اُس کی مزاحمت کریں۔ لہذا دلی عہد سلطنت کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی تمام سپاہ کے ساتھ شمال کی جانب کوچ کریں۔“

مجھے دن بھر کوئی سو بار خسرو کی یاد آتی۔ اُس کی روح مجھے پورے محل میں بے قرار سرگرداں نظر آتی۔ میرے لیے یہی پریشانی بہت تھی کہ ظل الہی کی جانب سے کوچ کے احکامات موصول ہو گئے ہیں۔

صاحب عالم نے ظل الہی کی طلبی کا کوئی فوری جواب نہیں دیا تھا۔ یہ سرزمین اُن کی بلا شرکت غیرے ملکیت تھی۔ یہاں سے روانگی کا مطلب اسے ہمیشہ کے لیے کھودینا تھا۔ وہ اسے چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔

”ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ظل الہی خود مغل فوجوں کی قیادت کیوں کرنا چاہتے ہیں؟“ انہوں نے مجھ سے دریافت کیا۔ ”وہ بستر علالت پر ہیں اور ہم بخوبی قیادت کا فرض انجام دے سکتے ہیں۔ اگر ہم یہاں سے روانہ ہوں گے تو پھر یہ سب کچھ ہمیشہ کے لیے کھو دیں گے۔“

”اور اگر ہم نہ جائیں تو۔۔۔؟“

صاحب عالم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا لیکن اسے نظر انداز بھی نہیں کیا گیا۔

اگلے کئی روز بے چینی سے گزرے، مجھے یوں لگتا تھا جیسے شہزادہ خسرو کی روح لاہور پہنچ گئی ہو اور اُس نے پھوپھو کو ساری رام کہانی کہہ سنائی ہو۔ کیونکہ چند ہی روز میں میرے والد کی جانب سے ایک۔۔۔ پیغام موصول ہوا کہ ظل الہی نے دلی عہد سلطنت کی تمام جاگیریں شہزادہ شہریار کو منتقل کر دی ہیں۔ ان میں حسن فیروز کی جاگیر بھی شامل تھی جو صدیوں سے۔۔۔ دلی عہدوں کی روایتی ملکیت رہی تھی۔

پھوپھو نے ظل الہی کے انتقال کی صورت میں خود ہندوستان پر حکومت کرنے کے سفر کی ایک سیرمی طے کر لی تھی۔

”ظل الہی کی رحلت کی صورت میں ملکہ ہم پر بازی لے جائیں گی۔“ صاحب عالم نے خدشہ ظاہر کیا تھا۔ ”ہمیں پورا یقین ہے کہ ملکہ فوراً شہریار کی بادشاہت کا اعلان کر دیں گی۔“

”آپ ظل الہی کو براہ راست انکار کے بجائے مطلع کریں کہ موسم برسات ختم ہوتے ہی آپ شمال کی جانب روانہ ہو جائیں گے۔“ میں نے انہیں مشورہ دیا۔

”درست۔“ صاحب عالم نے مجھ سے اتفاق کیا۔ ”ہم ایسا ہی کریں گے، لیکن ظل الہی کو ہر حال میں ہمیں مغل سپاہ کی۔۔۔ سپہ سالاری سونپنا ہوگی۔ انہیں پنجاب کی جاگیریں بھی ہمیں واپس دینی ہوں گی۔ یہی ملکہ نور جہاں اور ہمارے بھائیوں سے ہمارے تحفظ کی ضمانت ہوگی۔“

صاحب عالم کے پیغام سے ظل الہی کو کوئی خوشی نہیں ہوئی بلکہ وہ غصے سے پاگل ہو گئے۔۔۔ اور بھرے دربار میں ہی میرے محبوب کو نہ صرف ”بد بخت“ کہا بلکہ جہانگیر نامہ میں بھی انہوں نے اس کا تذکرہ کیا۔ انہوں نے حکم دیا کہ۔۔۔ دلی عہد ہمیشہ کے لیے برہان پور میں ہی ٹھہرے، لیکن مغلیہ سپاہ کو فوری بھیجنے کی ہدایت کی گئی تھی۔

”اپنی سپاہ کے بغیر ہم دو کوڑی کے بھی نہیں۔“ صاحب عالم نے ظل الہی کے پیغام پر اپنا رد عمل ظاہر کیا۔

”لیکن انہیں روک کر آپ اس سے کہیں زیادہ شاعی غضب کا نشانہ بنیں گے۔“ میں نے جواب دیا۔

سعد اللہ خان کی واپسی موسم برسات کے بعد ہوئی۔ اُس کا چہرہ برہان پور کی فضا پر چھائے ہوئے سیاہ بادلوں کی طرح سیاہ تھا۔

”مجھے افسوس ہے صاحب عالم! لیکن ظِلّ الہی نے مجھے شرف ملاقات ہی نہیں بخشا۔“

سعد نے ندامت کے ساتھ بتایا۔ ”مجھے دیوان عام میں بھی شرکت کی اجازت نہیں دی گئی۔ خبر ملی ہے کہ ملکہ عالیہ نے تمام افراد کو سختی سے ہدایت کر رکھی ہے کہ کوئی شخص ظِلّ الہی کے حضور آپ کا نام نہ لے۔ محل پر شہزادہ شہریار کا راج ہے۔“

”اور لاڈلی کیسی ہے؟“ میں نے دریافت کیا۔

”شہزادی بالکل تبدیل نہیں ہوئیں۔ انہوں نے آپ کے لیے بہت سی دعائیں اور پیار بھجوا دیا ہے۔ اب تو اُن کے دو بچے بھی ہیں، لیکن اللہ کرے کہ اُن پر شہزادہ شہریار کا سایا بھی کبھی نہ پڑے۔“

”کیوں؟“

”شہزادہ ایک عجیب سی بیماری میں مبتلا ہے۔ اُس کے سر کے بال جھڑ گئے ہیں۔ آنکھیں ہر وقت بہتی رہتی ہیں اور جلد گوشت سے الگ ہو کر لنگ سی گئی ہے۔“

”بہت ہو گئی۔“ دفعتاً صاحب عالم بول اُٹھے۔ ”ہم شہریار کے شہنشاہ بننے کے انتظار میں یہاں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے نہیں رہ سکتے۔۔۔ ظِلّ الہی اگر لاہور میں ہیں تو ہم اُن سے پہلے آگرہ پہنچ سکتے ہیں۔ کیا شاعی خزانہ ابھی تک آگرہ میں ہے؟“

”ہاں صاحب عالم!“ سعد نے جواب دیا۔ ”لیکن شاعی سپاہ کو تنخواہوں کی ادائیگی کے لیے اُسے بہت جلد لاہور منتقل کر دیا جائے گا۔“

”افسوس ہمیں تاخیر ہو گئی۔“ صاحب عالم نے دیر سے کہا۔ ”ملکہ جوزہر پھیلا چکی ہیں، اُس کا علاج اب کسی کے۔۔۔ پاس نہیں۔“

”سعد اللہ خان کو فوری طور پر لاہور روانہ کریں۔۔۔ صاحب عالم!“ میں نے مشورہ دیا۔ ”ظِلّ الہی سے معافی کی درخواست کریں اور جب اُن کا غصہ فرو ہو جائے تو ہم قندھار کی جانب روانہ ہو جائیں۔“

”ہم؟“ شہزادے نے مسکراہٹ کے ساتھ میرا کہا ہوا لفظ دہرایا۔ ”ہم تمہیں کتنی مرتبہ بتائیں کہ جنگ تمہارے کام کی۔۔۔ شے نہیں۔“

”میں آپ کو کبھی تنہا نہیں چھوڑوں گی، شہزادے! فی الحال سعد کو لاہور روانہ کریں۔“

ایک ساعت بعد سعد اللہ خان، ولی عہد سلطنت کا معافی نامہ لے کر لاہور کوچ کر چکے تھے۔

تمہیری

شہاب الدین

سپاہ کو شمال کی جانب کوچ کا حکم دے دیا گیا۔ میری خواہش تھی کہ ارجمند، برہان پور میں ہی رکتی، لیکن وہ معمول کے مطابق ضد کر کے میرے ہمراہ آگئی تھی۔ میری خواہش تھی کہ میں ملکہ کے آگرہ پہنچنے سے پہلے شاہی خزانے پر قابض ہو جاؤں کیونکہ یہ بات مسلمہ تھی کہ اس کے بغیر میں یا ظلی الہی دونوں ہی بے دست و پا تھے۔

مجھے راستے میں ہی خبر ملی کہ شاہ عباس نے قندھار فتح کر لیا ہے۔ قندھار، مہابلی کے زمانے سے ہمارے زیر نگین تھا اور مغلیہ تجارت میں اُسے بنیادی اہمیت حاصل رہی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا۔۔۔ کہ تخت نشین ہونے کے بعد میں ہر حال میں اس پر قبضہ کر لوں گا۔

ooo

1032ھ (1622ء)

سفر کا پچیسواں دن تھا تو مجھے علم ہوا کہ میں کامیاب نہ ہو سکوں گا۔ آگرہ ہنوز دُور تھا اور پوری کی پوری مغل سپاہ میرے اور آگرہ کے درمیان حائل ہو گئی تھی۔ ظلی الہی نے مجھ سے خود نہ لڑنے کا فیصلہ کیا تھا کیوں کہ وہ میرے قتل کے ذمے دار نہیں بننا چاہتے تھے۔ وہ اس تیموری قانون کی پیروی کر رہے تھے، جسے میں توڑ چکا تھا۔ میرے ذہن میں ارجمند کے الفاظ گونجنے لگے۔ اس نے دوبارہ کبھی انہیں نہیں دہرایا تھا، لیکن مجھے علم تھا کہ اس کے دل و ذہن کے نہاں خانوں میں اب بھی سب کچھ تازہ تھا۔

میرے مقابلے پر آنے والی مغل سپاہ کی قیادت میرے سابق اتالیق مہابت خان کے ہاتھوں میں تھی۔ اس نے مجھے اپنی مرضی کا میدان جنگ منتخب کرنے کا موقع نہیں دیا اور ایک چھوٹے سے نیم پہاڑی گاؤں بلک پور کے قریب میرا راستہ روک لیا۔

میرے ساتھ قدرت نے بھی بڑے عجیب مذاق روار کھے تھے۔ ارجمند ایک بار پھر ماں بننے والی تھی۔ شاہی طبیب نے مجھے آگاہ کیا کہ وہ آج رات تخلیق کے کرب سے گزرے گی۔ اب نیک یا بد شگونی کا انحصار اسی پر آن پڑا تھا۔ اگر بچہ زندہ رہا تو میرے حق میں بہتر ہوتا، انتقال کر گیا تو برے اثرات مرتب ہوں گے۔ اگر آنے والا مہمان لڑکا ہوا تو سعد ہوتا اور لڑکی ہوتی تو اثرات بد ہوتے۔

رات نصف کے قریب گزری تو میں اپنی خیمہ گاہ سے نکل کر چہل قدمی میں مصروف ہو گیا۔ ذہن دو حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ ایک جانب مہابت خان اور مغلیہ سپاہ نے قبضہ کیا ہوا تھا تو دوسری طرف میں ارجمند کی طرف سے پریشان تھا۔ ایک طرف میں جنگ کی حکمت عملی

”آپ کی جان نہیں لی جائے گی کیوں کہ آپ تیموری نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔“
 مہابت خان نے چند ٹاپے رک کر اپنی بات دوبارہ جاری رکھی۔ ”آپ کو شہزادہ خسرو کی جان
 نہیں لینی چاہیے تھی، بہت برا ہوا۔۔۔۔۔“
 ”ہم اپنی نسل کی حفاظت خود کر سکتے ہیں۔“ میں نے تیز لہجے میں کہا۔
 مہابت خان خاموش ہو گیا۔ وہ میرے جواب کا منتظر رہا۔ میں بھی کچھ دیر سکوت کی
 چادر اوڑھے سوچتا رہا اور بالآخر میں نے حتمی فیصلہ سنا دیا۔
 ”ہم ہتھیار نہیں ڈالیں گے مہابت خان!“

○○○

وضع کر رہا تھا تو دوسری طرف ارجمند کی زندگی کی دعائیں مانگ رہا تھا۔
 کچھ دیر بعد عیسیٰ، ارجمند کی خیمہ گاہ سے نکل کر میری سمت بڑھا۔ قریب آ کر اس نے
 مجھے تعظیم دی اور مودب ہو گیا۔
 ”آغاچی نے ایک بچی کو جنم دیا ہے صاحب عالم!“ اس نے دھیرے سے مجھے آگاہ
 کیا۔ ”لیکن پیدائش کے فوراً بعد اس کا انتقال ہو گیا۔“
 میرا جھکا ہوا سر مزید جھک گیا۔
 ”اور شہزادی؟“

”آغاچی بالکل ٹھیک ہیں صاحب عالم! لیکن طبیب نے انہیں مکمل آرام کا مشورہ دیا
 ہے۔“ وہ چند ٹاپے رک کا پھر دوبارہ گویا ہوا۔ ”سالار مہابت خان، شرف باریابی کے منتظر
 ہیں۔“

میں نے کسی حیرت کا اظہار نہیں کیا اور حاضر ہونے کی اجازت دے دی۔
 ”مجھے افسوس ہے صاحب عالم!“ مہابت خان نے مجھے تعظیم دینے کے بعد کہنا شروع
 کیا۔ ”آج مجھے اپنے اس شاگرد کے سامنے تلواریں اٹھانی پڑ رہی ہے جسے تلواریں سے کھیلنا میں
 نے سکھایا تھا، لیکن میں مجبور ہوں۔ مجھے دن میں دس مرتبہ ملکہ عالیہ کا پیغام موصول ہوتا ہے
 کہ ولی عہد سلطنت کو تباہ کر دو۔ میں آپ سے تنہائی میں کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔“
 میں جھجکا تو اس نے ہنس کر دونوں ہاتھ اٹھا دیے۔

”معاف کیجیے گا صاحب عالم! میں قاتل نہیں ہوں۔۔۔۔۔ یہ شعبہ میں نے دوسروں
 کے لیے چھوڑ رکھا ہے۔“

”تخلیہ!“ میں نے فوراً حکم صادر کیا۔

”آپ کل مجھ سے جیت نہ سکیں گے صاحب عالم!“۔۔۔۔۔ تنہائی میں آتے ہی اس
 نے کہا۔ ”اگر آپ ہتھیار ڈال دیں تو میں ملکہ نور جہاں کی جانب سے آپ کو پورے احترام
 اور مکمل تحفظ کی یقین دہانی کراتا ہوں۔“

”ہم ملکہ کے وعدوں پر بھروسہ نہیں کرتے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”یہ بتائیں کہ ظل
 الہی کے احکامات کیا ہیں؟“

ہوئے دریافت کیا۔

”کیا ہارا ہوا شہزادہ بدل جائے گا؟ کیا اس کی محبت ختم ہو جائے گی؟ کیا اس کی آنکھیں، دل اور لمس تبدیل ہو جائے گا؟“ میں نے ایک ساتھ کئی سوال کر ڈالے۔

”نہیں۔“ صاحبِ عالم نے جواب دیا۔

”تو پھر ارجمند ہارے ہوئے شہزادے کا ساتھ دے گی۔ اس کے لیے شہزادے کے سوا دنیا میں کوئی دلچسپی نہیں۔“ میں نے جذبات سے مغلوب آواز میں کہا۔ ”ارجمند نے اپنی زندگی کی آخری سانس بھی شہزادہ خرم کے نام لکھ رکھی ہے۔“

ooo

ارجمند بانو

صاحبِ عالم جب واپس آئے، میں سو رہی تھی، لیکن وہ محبت ہی کیا، جو اپنے محبوب کے قدموں کی آہٹ سے بیدار نہ ہو۔ میں اٹھنے لگی تو انہوں نے مجھے لیٹے رہنے کو کہا اور خود گھٹنوں کے بل میرے قریب دوڑاؤ ہو گئے۔

”مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی امانت کی حفاظت نہ کر سکی شہزادے!“ میں نے سر جھکا کر کہا۔

”اللہ کو یہی منظور تھا۔“ صاحبِ عالم نے میرے بال سہلائے۔ ”اللہ نے ہمیں اور بھی امانتیں تو سونپ رکھی ہیں۔ تم آرام کرو۔ سب بہتر ہو جائے گا۔“

”اس کا بہت وقت ہے۔ آپ کہیں کہ کل ہم جیت جائیں گے نا؟“ میں نے اپنے دل کے دوسو سوں کی تردید چاہی۔

”مہابت خان نے ہم سے ملاقات کر کے پیش کش کی ہے کہ ہم ملکہ نور جہاں کے نام پر ہتھیار ڈال دیں۔“

”اگر آپ جیت گئے تو پھوپھو اپنا سب کچھ ہار دیں گی، پھر ان کے لیے کوئی جگہ باقی نہ رہے گی۔“

”اور ہم ہار گئے تو ہمیں زمین پناہ دے گی نہ آسمان۔“ صاحبِ عالم نے ایک لمبی سانس لے کر کہا۔ ”ہم سب کچھ ہار جائیں گے۔“

”سب کچھ نہیں۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”ارجمند پھر بھی آپ کی ملکیت رہے گی۔“

”کیا تم ایک ہارے ہوئے شہزادے کا ساتھ دو گی؟“ صاحبِ عالم نے مسکراتے

رتھ میدان جنگ سے خاصے فاصلے پر ایک بلند جگہ پر کھڑا کیا گیا تھا، مجھے کسی کا چہرہ صاف نظر نہیں آتا تھا، لیکن میں سپاہ کو حرکت کرتے اور انہیں باہم متصادم ضرور دیکھ سکتی تھی۔۔۔۔ میں دن بھر اپنے محبوب کی فتح مندی کی دعائیں مانگتی رہی، لیکن شاید ان کا اثر ختم ہو گیا تھا۔

میں نے صاحبِ عالم کی سپاہ کو دن ڈھلے پسپائی اختیار کرتے دیکھا۔ عیسیٰ مجھے فوراً خیمہ گاہ میں واپس لے آیا اور پھر تھوڑی دیر بعد صاحبِ عالم بھی جنگ سے واپس تشریف لے آئے۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے ایک سفید تولیہ لے کر ان کا چہرہ صاف کیا، جو گرد اور دھول کی وجہ سے سیاہ ہو گیا تھا۔

انہوں نے پہلے عیسیٰ کو مخاطب کیا۔ ”کیا تم نے تیاری کر لی؟“

”جی صاحبِ عالم!“

وہ میری طرف متوجہ ہوئے۔

”ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ار جند! ہمیں تیزی سے سڑ کرنا ہے۔ صبح ہوتے ہی

انہیں علم ہو جائے گا کہ ہمیں شکست ہو گئی ہے۔“

ooo

دوبارہ میری آنکھ شور کی وجہ سے کھلی۔ ولی عہد کی سپاہ جنگ کی تیاریوں میں مصروف تھی۔ ”عیسیٰ۔“ میں نے تقریباً سرگوشی میں اسے پکارا۔ ”صاحبِ عالم کہاں ہیں؟ انہیں بلاؤ!“

”وہ تم سے ملنے آئے تھے آغاچی! لیکن تم سو رہی تھیں۔“

”تم ان کے ہمراہ کیوں نہیں گئے؟ میں نے تمہیں۔۔۔۔۔“

”میں گیا تھا آغاچی!“ اس نے فوراً اپنی صفائی پیش کی۔

”صاحبِ عالم نے مجھے تیاری کے لیے واپس بھیج دیا تھا۔“

تیاری؟۔۔۔ کس شے کی؟

”فرار کی آغاچی!“ عیسیٰ نے جواب دیا۔ ”صاحبِ عالم نے تمہارے لیے پیغام

چھوڑا ہے کہ تمہیں دوبارہ سلا دیا جائے۔“

”نہیں، میرا رتھ تیار کرو۔ میں اپنی آنکھوں سے جنگ کا نظارہ کرنا چاہتی ہوں۔“

ooo

پہنچا تھا، لیکن وہ اس سے خاصی رکھائی سے پیش آیا تھا۔

”میں کیا کر سکتا ہوں؟“ عیسیٰ نے پوچھا تھا۔

”تم لوگوں کو موت کی سزا دلوانے پر قادر ہو تو ایک مرنے والے کی زندگی کیوں نہیں بچا سکتے۔“

”میں انسان ہوں بھگوان نہیں۔“ عیسیٰ نے جواب دیا۔ ”اور بھگوان نے انسان کو زندگی چھیننے کی قوت ضرور دی ہے، بخشنے کی نہیں۔“

گوپی مایوس ہو گیا۔

”چلو اگر تم اسے زندگی نہیں دے سکتے تو اس کی آخری خواہش تو پوری کر سکتے ہو؟“

”کہو!“ عیسیٰ نے دریافت کیا۔

”میرا باپ، ملکہ کی قبر کی وہ جالی دیکھنا چاہتا ہے، جو اس نے اپنے ہاتھوں سے تراشی تھی۔“

”مجھے افسوس ہے کہ یہ بھی ممکن نہیں۔“ عیسیٰ نے اپنے بھتیجے کو بتایا۔ ”کوئی ہندو، مسلمان مقابر میں داخل نہیں ہو سکتا۔“

”کیا تم بھی نہیں؟“ گوپی نے کھٹ سے پوچھا، لیکن ایشور عرف عیسیٰ کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔

ooo

1064ھ (1657ء)

ممتاز محل

تاج محل کو مکمل ہوئے برسوں بیت گئے تھے، لیکن کام اب بھی ہو رہا تھا۔ مقبرے کی عظیم الجذہ بنیادیں مکمل ہو گئی تھیں۔ سامنے کے حصے میں دنیا کا خوب صورت ترین باغ بنایا گیا تھا، جسے چار تختوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ پتھروں کی بنی ہوئی روشیں شمالاً جنوباً پھیلی ہوئی تھیں، جن کے شرعاً غرباً روشوں کے مقام اتصال پر سنگ مرمر کے خوب صورت فوارے بنائے گئے تھے۔ روشیں دورویہ تھیں اور ان کے وسط میں چوڑی چوڑی نہریں بنی ہوئی تھیں۔ نہروں اور فواروں کو پانی کی فراہمی کے لیے خصوصی انتظامات کیے گئے اور جنما سے پانی لانے کے لیے زیر زمین سخاف (ٹالیاں) بنائے گئے تھے۔ زیر زمین ذخیرہ گاہیں تعمیر کی گئی تھیں، جن میں بے شمار مقدار میں پانی جمع کیا جاسکتا تھا۔ فواروں میں پانی کے اوپر کی جانب پھیلاؤ کے لیے ریاضی کے اصولوں کی مدد لی گئی تھی۔ باغ تعمیر کرنے والوں نے پانی کے دباؤ کے لیے ایسے انتظامات کیے تھے کہ پانی جب۔۔۔۔۔ فواروں میں سے نکلتا تو دور دور تک پھوار کی صورت پھیل جاتا تھا۔

مقبرے کی جالی اب تک نامکمل تھی۔ اب اس پر گوپی کام کر رہا تھا کیوں کہ مورتی اس کی تکمیل سے پہلے ہی سورگباش ہو گیا تھا۔ گوپی یہاں سے بددل ہو گیا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ جالی مکمل ہوتے ہی، وہ اپنے بھائی ریش اور بہن ساوتری کو لے کر واپس گاؤں چلا جائے گا۔

بددلی کی وجہ عیسیٰ کا رویہ تھا۔ وہ اپنے بیمار باپ کے لیے مدد طلب کرنے کے پاس

سلطنت کے دُور دراز گوشوں کا رخ کر چکے تھے۔

لال قلعہ سے کچھ اور قاصد بھی روانہ ہوئے تھے، جن کا رخ شہزادہ دارا کے بھائیوں کی جانب تھا۔ ان کے پاس جو پیغام تھا اس کا متن یہ تھا۔
 ”شہنشاہ ہند قریب المرگ ہیں اور شہزادہ دارا شکوہ نے سلطنت کی باگ ڈور سنبھال لی ہے۔“

تیسرے دن جب شہنشاہ ہند کو کچھ افاقہ ہوا تو انہوں نے پہلا حکم آگرہ کی طرف کوچ کرنے کا دیا۔

”عیسیٰ! میرے منزل کو ہمارا حکم دو کہ آگرہ روانگی کے انتظامات کیے جائیں۔“

لیکن شہزادہ دارا نے ایک اور ہی خبر بادشاہ کے گوش گزار کی تھی۔

”میرے بھائیوں نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ خدا نخواستہ جہاں پناہ انتقال فرما گئے ہیں۔ شہزادہ شاہ شجاع نے خود کو سکندر ثانی کا خطاب دے لیا ہے جب کہ شہزادہ مراد اپنی شبیہ کے سکے بنوا رہا ہے۔“

”اور اورنگ زیب؟“ شہنشاہ نے حیرت اور بڑے کرب سے دریافت کیا۔

”اس نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا بلکہ وہ اپنی سپاہ کو ساتھ لے کر مغل پایہ تخت کی طرف بڑھ رہا ہے۔“

”ہمارے بد بخت بیٹے۔“ شہنشاہ چلا اٹھا۔ ”لاچ نے ان کے دلوں سے محبتیں چوس ڈالی ہیں۔ ہمیں تخت تک لے چلو، ہم دربار برپا کرنے کا اعلان کرتے ہیں۔“

حکم کی تعمیل ہوئی۔ احدى دستوں نے فوری طور پر دیوان عام کا محاصرہ کر لیا اور پھر لال قلعہ دہلی کی دیواروں نے شاید آخری مرتبہ بادشاہ کی حیثیت سے شاہ جہاں کی آمد کا اعلان سنا۔

”سجدے میں نگاہ رہے، تمام ہوش و خرد، پیش بادشاہ رہے۔۔۔ صاحب جاہ و جم، شاہ مرغ حشم، تاجدارِ اقلیم ہند، عالم پناہ، جہاں پناہ، شہنشاہ ابو مظفر شہاب الدین محمد شاہ جہاں غازی جلوہ افروز ہوتے ہیں۔“

شہزادہ دارا شکوہ اور عیسیٰ کے سہارے شہنشاہ دربار عام میں نمودار ہوئے اور آہستہ

شہنشاہ ان دنوں دہلی میں مقیم تھا۔ وہ بوڑھا ہو گیا تھا اور اسے پیشاب کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا۔ پورے شہر میں یہ افواہ اڑ گئی تھی کہ شہنشاہ شاہ جہاں قریب المرگ ہے۔ یہ سرگوشیاں اور افواہیں اس قدر تیز تھیں کہ ان کی بازگشت لال قلعے تک محسوس ہو رہی تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ یہ خبر بنگال کے صوبے دار شہزادہ شاہ شجاع، گجرات کے صوبے دار شہزادہ مراد اور دکن کے صوبے دار شہزادہ اورنگ زیب تک بھی جا پہنچی تھی۔

شہنشاہ کو مسکن ادویات دے کر سلا دیا جاتا، لیکن ذرا دیر بعد ہی مارے تکلیف کے وہ اٹھ بیٹھتا۔ شاہ کے لیوں پر ایک ہی تقاضا ہوتا تھا۔

”ہم آگرہ جانا چاہتے ہیں۔۔۔۔۔ مرنے سے پہلے ہم اپنی محبوبہ کو دیکھنا چاہتے ہیں۔۔۔۔۔ تاج محل کو دیکھنا چاہتے ہیں۔۔۔۔۔ ارجمند سے ملنا چاہتے ہیں۔۔۔۔۔“

”جہاں پناہ کی صحت سفر کے قابل نہیں۔“ شاہی طبیب نے اعلان کیا۔
 ”کسی بھی طرح جہاں پناہ کو آگرہ پہنچنے کے قابل بنادو۔“ شہزادی جہاں آرا اور شہزادہ

دارا نے شاہی طبیب سے کہا۔ ”ہم تمہارا منہ موتیوں سے بھر دیں گے۔“
 طبیب خاموش رہا تھا۔ زندگی و موت اور تندرستی و بیماری اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت میں رکھی تھی۔

شہزادہ دارا نے وزیر سلطنت کو طلب کر لیا۔
 ”شاہی محل سے فرمان جاری کر دو کہ والئی ہندوستان کی طبیعت ناساز ہے۔ اسے ملک کے طول و عرض میں بھجوا دو اور ہدایت کر دو کہ لوگ، بادشاہ ہند کی صحت یابی کے لیے دعا کریں۔“

وزیر نے حکم کی تعمیل کی اور چند ساعتوں کے اندر اندر خصوصی قاصد تیز رفتار گھوڑوں پر

آگرہ تک کا یہ سفر دس روز میں تمام ہوا۔ شاہی قافلہ جونہی آگرہ پہنچا، شہنشاہ نے فوری طور پر عظیم تاج محل کا رخ کیا۔ شہنشاہ کے اندر داخل ہوتے ہی مقبرے کے تمام دروازے بند کر دیے گئے۔ شاہ کے علاوہ کسی چڑیا کے بچے کو بھی اندر جانے کی اجازت نہ دی گئی تھی۔ حتیٰ کہ عیسیٰ کو بھی باہر رکنے کا حکم ملا تھا۔

شہنشاہ اپنی محبوبہ کی قبر کے سامنے دوزانو ہو گیا۔ اس نے جھک کر سردسنگ مرمر کو بوسہ دیا اور پھر بلک اٹھا۔

”ہماری محبوب، جان خرم۔۔۔۔۔“ مقبرے کا عظیم ہال شاہ کی سرگوشی سے گونج اٹھا۔۔۔۔۔ ”ہمیں بتاؤ جان خرم، ہم کیا کریں؟ ہمارے بیٹوں نے ہمارے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا ہے۔ وہ اپنے والد، شہنشاہ ہند کے احکامات، ہواؤں میں دھول کی مانند اڑا رہے ہیں۔ ہم نے اپنے پیارے بیٹے دارا شکوہ کو شاہ شجاع کے خلاف جنگ کے لیے روانہ کیا ہے۔۔۔۔۔ تم جانتی ہو۔۔۔۔۔ جان خرم۔۔۔۔۔ ہم جنگ سے کبھی خوف زدہ نہیں رہے، لیکن آج ہم پر ایک عجیب سا خوف طاری ہے۔۔۔۔۔ تم ہی اس کی رہنمائی کرو۔۔۔۔۔ اے سہارا دو۔۔۔۔۔ دعا کرو کہ دارا کامیاب لوٹے۔۔۔۔۔ اے اپنی بہادری اور قوت بخش دو۔۔۔۔۔ ارجمند۔۔۔۔۔ جان خرم۔۔۔۔۔“

شہنشاہ نے قبر کا تعویذ نہیں چھوڑا وہ اس وقت تک تاج محل میں مقیم رہا جب تک شہزادہ دارا نے آکر شہزادہ شاہ شجاع کی شکست کی خبر نہیں سنائی۔

”اورنگ زیب؟“ شہنشاہ نے سوال کیا۔

دارا خاموش ہو گیا۔

”وہ مراد کے ساتھ مل گیا ہے جہاں پناہ۔“ اس نے سر جھکا کر جواب دیا۔ ”اورنگ

روی سے چلتے ہوئے تخت طاؤس پر متمکن ہو گئے۔

شاہ کی زبان میں لڑکھڑاہٹ اور بدن پر ریشہ طاری تھا۔

”ہم مکمل طور پر صحت مند ہیں۔“ شہنشاہ کی لڑکھڑاتی آواز سنائی دی۔ ”ہمارا محبوب اور واحد بیٹا شہزادہ دارا شکوہ اس وقت تک سلطنت کی سربراہی کے فرائض انجام دے گا، جب تک ہم خود کو اتنا طاقت ور محسوس نہیں کرتے۔“

دربار میں موجود کسی امیر کو شہنشاہ کے فیصلے پر اعتراض کی ہمت نہ تھی۔ ان میں سے کوئی بھی اپنی زبان گدی سے۔۔۔۔۔ کھنچوانے کا خواہش مند نہیں تھا۔ لیکن بہت سے امراء ایسے تھے، جن کے چہرے اس بات کی چغلی کھا رہے تھے کہ انہیں شاہ کا فیصلہ پسند نہیں آیا۔

”ہم اپنے تمام صاحب زادوں کو واپس اپنے اپنے صوبوں کو جانے کا حکم دیتے ہیں۔“ شہنشاہ کی آواز دوبارہ ابھری۔۔۔۔۔ ”انہیں خبر ہو کہ ہم ابھی تک ہندوستان کے بادشاہ ہیں۔“

تمہیری

زیب نے مراد کی بادشاہت کا اعلان کر دیا ہے، لیکن آپ فکر نہ کریں میں شاہ شجاع کی طرح مراد کو بھی مار بھگاؤں گا۔“

”لیکن اورنگ زیب اُس کے ساتھ ہے۔“ شہنشاہ نے جواب دیا۔ ”ہم خود اُس کے مقابلے پر جائیں گے کیونکہ ہمارے علاوہ اُسے کوئی شکست نہیں دے سکتا۔“

”نہیں جہاں پناہ!“ شہزادہ دارا نے بے الفاظ میں کہا۔ ”اگر مجھے ایک روز عتابِ حکومت سنبھالنی ہے تو پھر میں ہی اورنگ زیب کا مقابلہ کروں گا۔“

شہنشاہ نے بددلی سے اجازت دے دی، لیکن اُسے علم تھا کہ دارا نا کام لوٹے گا۔

ooo

اور یہی ہوا، جمیل کی وادیوں میں اورنگ زیب نے دارا کو شکست فاش دی۔ دن بھر کی لڑائی میں ہزاروں مارے گئے اور شہزادہ دارا ایک اوتھا آگرہ کی جانب بھاگ نکلا۔ شہزادہ اورنگ زیب نے دوسرا قدم یہ اٹھایا کہ شہزادہ مراد کو باندھ کر ایک ہاتھی پر ڈلوادیا، جو اُسے لے کر کسی نامعلوم قید خانے کی جانب روانہ ہو گیا۔ اسی لمحے تین اور ہاتھی بھی سلطنت کے مختلف علاقوں کو روانہ ہوئے تھے، لیکن کسی کی منزل کے بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا۔

”غدار۔۔۔ اورنگ زیب غدار ہے۔“ شہنشاہ، دارا کی شکست پر چلا اٹھا تھا۔ یہ خبر بھی شاہ نے تاج محل میں ہی سنی تھی۔ ”وہ ہمیشہ سے بادشاہ بننے کا خواہش مند رہا ہے۔“ پھر شہنشاہ، دارا کی طرف متوجہ ہوا۔

”ہم اُس بد بخت کو شکست دینے کے لیے دوسری سپاہ بھیجیں گے۔“ ساتھ ہی شاہ نے ایک اور فیصلہ سنایا۔ ”ہم اعلان کرتے ہیں کہ شہزادہ دارا آج سے ہندوستان کا۔۔۔ شہنشاہ ہے۔“

ایک اور سپاہ روانہ کی گئی، لیکن اورنگ زیب نے اُسے بھی شکست دی۔ شہزادہ دارا اپنے سپہ سالار غلیل اللہ خان کی غداری کے باعث مغرب کی جانب بھاگ نکلا جبکہ شہزادہ اورنگ زیب نے اپنا رخ آگرہ کی جانب کر لیا۔

ooo

حمیری

عیسیٰ، شہنشاہ کے قاصد کی حیثیت سے شہزادہ اورنگ زیب سے ملنے کے لیے گیا۔ عالمگیر نامی تلوار بھی اُس کے ہمراہ تھی۔ تلوار خالص سونے کی تھی اور اُس کے دستے پر ہیرے اور جواہرات ٹنکے ہوئے تھے۔

شہزاد اورنگ زیب، شہزادہ دارا کے اُس محل میں مقیم تھا، جو کبھی شہزادہ خرم اور شہزادی ارجمند کی۔۔۔ قیام گاہ ہوا کرتا تھا۔ پُرانی یادوں نے عیسیٰ کو مسحور کر دیا۔ وہ کئی سال بعد یہاں آیا تھا۔

شہزادہ ٹھیک اُسی مقام پر تھا، جہاں کبھی ارجمند بانو نے اپنے چاندی کے زیورات سے شہزادہ خرم کا دل جیتا تھا۔ عیسیٰ نے وہیں شہزادے کے حضور حاضری دی اور عالمگیر کا تحفہ پیش کیا۔

”جہاں پناہ، شہزادہ عالی مقام سے ملاقات کے خواہش مند ہیں۔“ عیسیٰ نے آگاہ کیا۔
 ”اور ہمیں یقین ہے کہ وہ دکن واپسی کے احکامات صادر فرمائیں گے۔“ شہزادہ اورنگ زیب نے جواب دیا۔ ”یہ تمام سال ہم نے جہاں پناہ کی خواہشوں کی تکمیل میں گزار دیے ہیں۔ قدح اور سرقد سے لے کر دکن کی وادیوں کو اپنے پیروں تلے روندنا ہے۔۔۔ لیکن اس کے باوجود ہمیں وہ پیار نہیں ملا جس کے ہم حق دار تھے۔۔۔ جہاں پناہ اور ملکہ ماں نے ہمیشہ شہزادہ دارا کو ہم پر ترجیح دی حتیٰ کہ امی حضور کے بوسے بھی صرف شہزادہ دارا کے لیے ہوتے تھے۔“

”آپ بھی اس سلسلے میں کچھ کم خوش قسمت نہیں رہے، شہزادہ حضور!“ عیسیٰ نے کہا۔
 ”تمہاری زبان ضرورت سے زیادہ تیز ہے عیسیٰ!“ شہزادے نے اُسے ٹوکا۔ ”ایسا نہ

ہو کسی روز نقصان اٹھا جاؤ۔“

”اورنگ زیب اُس وقت تک بادشاہ نہیں بن سکتا، جب تک ہم زندہ ہیں۔“ شہنشاہ نے چنگھاڑ کر کہا۔

اورنگ زیب آگرہ تک پہنچا تھا اور اُس کی سپاہ نے مضافات میں اپنے ڈیرے ڈال دیے تھے۔

”شہزادہ حضور کا کہنا ہے کہ وہ جہاں پناہ کی مدد کرنے اور انہیں اُن کے دوسرے بیٹوں سے تحفظ دینے کی خاطر آگرہ تشریف لائے ہیں۔“ عیسیٰ نے جہاں پناہ کو آگاہ کیا۔

”وہ جھوٹ بولتا ہے۔ دارا کہاں ہے؟ اُسے طلب کرو، صرف وہی ہمیں تحفظ دے سکتا ہے۔“
 ”شہزادہ دارا گلست کے بعد کسی نامعلوم مقام کو فرار ہو گئے ہیں جہاں پناہ!“ عیسیٰ نے بعد احترام جواب دیا۔ ”وہ کچھ وقت گزار کر دوبارہ شہزادہ اورنگ زیب سے لڑ کر اسے گلست دینا چاہتے ہیں۔“

شہنشاہ خاموش رہا اور مینا مسجد روانہ ہونے کے احکامات صادر کیے۔ ہندوستان کا بادشاہ، اپنے بادشاہ کے حضور سجدہ ریز ہو گیا تھا۔

”ہم اورنگ زیب کو بات چیت کے لیے مدعو کریں گے۔“ دعا کے بعد شہنشاہ نے فیصلہ دیا۔ ”لیکن اس کے بعد اُسے لازمی طور پر واپس جانا ہوگا۔“ شاہ کے لہجے سے ناراضی کا اظہار ہو رہا تھا، لیکن رفتہ رفتہ لہجہ دھیمہ ہوتا گیا۔

”ہم اُس سے درخواست کریں گے کہ وہ واپس دکن چلا جائے۔“ مسجد کے درودیوار نے مجبور بادشاہ کے بدلے ہوئے انداز اور لہجے کو فوراً محسوس کر لیا تھا۔ ”ہم اُسے معاف کر دیں گے۔“

عیسیٰ خاموش رہا۔

”جہاں پناہ کے پاس واپس جاؤ اور ہمارا پیغام دو کہ قلعہ ہمارے حوالے کر دیں۔“

شہزادہ اورنگ زیب نے حکم دیا۔

”جہاں پناہ انکار کر دیں گے۔“

”ہمیں تمہاری باتوں سے بے پروا آتی ہے، جیسے تم ہی اس سلطنت کے والی ہو۔“ شہزادہ چیخ

اٹھا۔ ”ہم ہمیشہ یہ یاد نہیں رکھیں گے کہ ہم نے تمہاری گود میں پرورش پائی تھی۔“

عیسیٰ ہانپتا کانپا لوٹ آیا تھا۔

ooo

حمیری

عیسیٰ کی توقعات کے عین مطابق شہنشاہ نے شہزادے کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔
”ہمیں دارا کا انتظار کرنا چاہیے۔ وہ اورنگ زیب سے لڑائی کے لیے نئی سپاہ تشکیل
دے رہا ہے۔“

”گستاخی معاف جہاں پناہ! لیکن شہزادہ دارا کبھی شہزادہ اورنگ زیب کو شکست نہ
دے سکے گا۔“

”تم ہمیشہ فضول بولتے ہو عیسیٰ!“ شہنشاہ نے ناراضی کا۔۔۔ اظہار کیا۔ ”اورنگ
زیب نے ہمارے بارے میں کیا کہا تھا؟“
”کچھ نہیں جہاں پناہ!“

”لیکن ہم جانتے ہیں کہ وہ ہماری جان کے درپے ہے۔“
شہنشاہ کے کانوں میں شہزادہ خسرو کے الفاظ گونج اٹھے۔۔۔ کاش میں ارجمند کی بات
مان لیتا۔ شاہ نے سوچا، لیکن اب اس سوچ کا کوئی فائدہ نہ تھا۔

ooo

معززین نے ہماری طرف کوئی توجہ نہ دی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ ظل الہی کی ہماری جانب سے آنکھیں بند کرتے ہی دنیا بھر نے بھی اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔

میں جانتی تھی کہ میری وجہ سے سفر میں بہت زیادہ تیز رفتاری نہیں تھی۔ میں دلی عہد کے قدموں میں لپٹی وہ زنجیر تھی، جسے وہ کاٹ کر پھینک سکتے تھے نہ کھولنے پر قادر تھے۔

”ہمیں پیچھے چھوڑ دیں شہزادے؟“ بلا آخر میں نے انہیں مشورہ دیا۔ ”آپ ہمارے بغیر تیز رفتاری سے سفر کر سکیں گے۔“

”تم جانتی ہو شہزادی کہ روح کے بغیر جسم ایک قدم کا فاصلہ بھی طے نہیں کر سکتا۔“ صاحبِ عالم نے جواب دیا۔ ”فکر نہ کرو ہم جلد ہی محفوظ ہو جائیں گے اور ظل الہی یا ملکہ نور جہاں ہمارے سر کے بالوں کو بھی نہ چھو سکیں گے۔“

”میں جانتی ہوں۔ ہمیں کوئی پریشان نہیں کرے گا۔“ میں نے ہنس کر جواب دیا۔ ”ظل الہی یا ملکہ میں سے کوئی تیموری قانون کو نہیں توڑے گا۔“

”جو گزر گیا وہ ماضی ہے ارجمند!“ صاحبِ عالم نے پلٹ کر جواب دیا۔ ”شہزادے اور شہنشاہ، ماضی پر نہیں مستقبل پر نگاہ رکھتے ہیں۔“

”میرا یہ مطلب نہیں تھا شہزادے!“ میں نے معذرت خواہانہ انداز اختیار کیا۔ ”میں تو آپ کو دوسرا مشورہ دے رہی تھی۔“

”جب تم جانتی ہو کہ ہم تمہیں نہیں چھوڑ سکتے تو ایسے مشورے کیوں دیتی ہو؟“ صاحبِ عالم نے ناراضی سے کہا۔ ”یا تم ہمیں چھوڑنا چاہتی ہو؟“

”اللہ مجھے دوسرا دن نہ دکھائے میرے شہزادے! ہمارے ساتھ نے آپ کی رفتار سست جو کر دی ہے۔“

”فکر نہ کرو۔“ شہزادے نے مسکرا کر کہا۔ ”مہابت خان ہم سے دو دن کے فاصلے پر ہے۔ بوڑھا شیر ہمیں مناسب وقت دے رہا ہے۔ ویسے ظل الہی نے شہزادہ پرویز کو اس کی

مکھ کے طور پر بھیجا ہے۔“

”شہر یار کو کیوں نہیں؟“ بے اختیار میری زبان سے نکلا۔

”ملکہ شاید اس کی زندگی خطرے میں ڈالنا نہیں چاہتیں۔ مستقبل کے بادشاہ کو ہر حال

1032ھ (1622ء)

ارجمند بانو

بیرم نے کچھ اس انداز سے ہمیں الوداع کہا، جیسے وہ بے زبان ہاتھی نہیں بلکہ بولنے اور محسوس کرنے والا کوئی انسان رہا ہو۔ صاحبِ عالم نے اپنے بہت سال بیرم کی معیت میں گزارے تھے۔ اُس کی آخری الوداعی چنگھاڑ تو میں عرصے تک فراموش نہ کر سکی تھی۔

جب ہم روانہ ہوئے، اُس وقت رات ابھی ایک پہر ہی گزری تھی۔ دوسرے بیٹوں نے تو اس واقعے پر کوئی خاص ردِ عمل ظاہر نہ کیا تھا، لیکن اورنگ زیب کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اُسے ہماری شکست اور پھر فرار ایک آنکھ نہ بھایا تھا۔

صرف پانچ ہزار انتہائی وفادار سپاہی ہمارے ساتھ تھے۔ باقی سپاہ میں سے بعض دکن واپس چلے جاتے اور کچھ اپنے اپنے علاقوں کو سدھار جاتے۔ صاحبِ عالم نے انہیں اس کی ہدایت کر دی تھی کیوں کہ اب وہ ان کی تنخواہیں ادا نہیں کر سکتے تھے۔

صبح کی روشنی نمودار ہونے تک ہم مہابت خان کو کئی کوس پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ ہم دیہات سے بچ کر نکل رہے تھے کیوں کہ دلی عہد کو اس تیز رفتاری سے سفر کرتے دیکھ کر ان کے ذہنوں میں بہت سے سوالات جنم لے سکتے تھے اور پھر شکست کی خبریں تو یوں بھی ہوا کے رخ پر سفر کرتی ہیں۔

قافلے میں سب سے آگے میرے محبوب کا گھوڑا تھا۔ سفر مسلسل کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا تا کہ ہم جلد از جلد مہابت خان کے ظالم ہاتھوں کی دسترس سے نکل سکتے۔ راستے کے سب قلعوں اور محلات کے دروازے ہمیں بندل رہے تھے۔ تمام راناؤں، نوابوں، امراء اور

”صرف یہی نہیں۔۔۔ ہم سعد اللہ خان کو کچھ سپاہ کے ساتھ جنوب کی سمت روانہ کر دیں گے۔ مہابت خان ہمارے دھوکے میں اُن کا تعاقب کرے گا اور ہم میواڑ واپس روانہ ہو جائیں گے۔“

کچھ روز بعد ہم نے میواڑ کا رخ کر لیا۔ ہمارے ساتھ صرف سو سوار تھے۔ باقی سپاہ علامہ سعد اللہ خان کے ساتھ جنوب کی سمت روانہ ہو گئی تھی۔ وہ کم از کم ایک ماہ تک مہابت خان کو اپنے پیچھے لگائے رکھ سکتے تھے اور یہ عرصہ ہمارے میواڑ پہنچنے کو بہت تھا۔ اس کے بعد وہ تتر بتر ہو کر اودے پور میں اپنے شہزادے سے آ ملتے۔

ooo

میں محفوظ رہنا چاہیے۔“

میں شاید کوئی جواب بھی دیتی، لیکن صاحبِ عالم نے مجھے خاموش کر دیا۔ ”اب سو جاؤ۔“ میں اصرار کے باوجود ان کی ہدایت سے سرتابی نہ کر سکی۔ صبح صاحبِ عالم اُٹھے تو تھکے تھکے سے تھے۔

”ہم کہاں جائیں گے شہزادے؟“ میں نے سوال کیا۔

”ہمیں خبر نہیں۔“ انہوں نے تھکے تھکے انداز میں جواب دیا۔ ”ہمیں کوئی پناہ نہیں دے گا۔ ممکن ہے ہمیں برہان پور واپس جانا پڑے۔ ہم اب بھی وہاں کے حاکم ہیں۔“

”لیکن کب تک؟ واپس جانے والی سپاہ نے شکست کی خبریں بھی پہنچادی ہوں گی۔ دکن کے شہزادے، ظلِ الہی کی۔۔۔ مخالفت مول لے کر ہم سے ہرگز تعاون نہ کریں گے۔“

”یوں بھی ہم برہان پور جائیں گے تو مہابت خان کو فوراً اس کا علم ہو جائے گا۔“

صاحبِ عالم نے خدشہ ظاہر کیا۔ ”اگر ہم مغرب کی طرف سفر کریں تو شاید کوئی راجپوت شہزادہ ہمیں پناہ دے دے۔“

”کون؟ جے پور اور مالوا، دونوں مہابت خان کا ساتھ دے رہے ہیں۔“

”ہم میواڑ جائیں گے۔“

”کرن سنگھ، آپ کے ہاتھوں، اپنے والد کی شکست نہ بھولا ہوگا۔“ میں نے صاحبِ

عالم کو یاد دلایا۔

”مگر اُسے ہماری مہربانیاں بھی ضرور یاد ہوں گی۔ ہم اپنا قاصد بھیج رہے ہیں کہ وہ

ہمیں ظلِ الہی کے خلاف پناہ فراہم کرے۔“

”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ ہمیں قتل کرنے کی تیاریاں شروع کر دے۔“

”یہ تو کوئی بھی کر سکتا ہے ہماری محبوب!“ صاحبِ عالم نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”بے

وقائی اور غداری ہر فرد کی سرشت میں شامل ہوتی ہے۔ آدمی کو بدلتے دیر نہیں لگتی۔ ابھی کوئی

ولی عہدِ سلطنت ہے تو اگلے پل وہ معتب ہو چکا ہوگا۔ ابھی اگر کوئی ہمارا استقبال کرے گا تو

ذرا دیر بعد وہ دشمن بن کر بھی سامنے آ سکتا ہے۔“

”ٹھیک ہے، آپ کرن سنگھ کو پیغام بھجوادیں۔“

جاگ مندر کا محل فن تعمیر کے لحاظ سے ہندوانہ طرز کا نہیں مسلمان طرز کا تھا۔ صاحب عالم نے اس کی طرز تعمیر میں گہری دلچسپی لی اور کئی روز تک کرن سنگھ کے ہمراہ اُس کے مختلف حصے دیکھتے رہے تھے۔ سسودیا نے لال قلعہ کا شاہی محل اور فتح پور سیکری میں بنے ہوئے مہابلی کے پرانے محل دیکھے تھے۔۔۔ چنانچہ جھیل محل کی تعمیر بھی اُسی طرز پر کی گئی تھی، لیکن یہاں چونکہ سُرخ پتھر دستیاب نہیں تھا اس لیے سنگ مرمر استعمال کیا گیا تھا، مگر اُس نے کوشش کی تھی کہ اُس کی تعمیر انہی محلات کی طرز پر ہو۔

محل میں قیام کے دوران ہم نے مستقبل کے بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی، لیکن مجھے اُن کی نگاہوں میں۔۔۔ خدشات کا ایک سمندر موجزن نظر آتا تھا۔ ہمیں اودے پور میں کوئی سودن گزرے تھے۔۔۔ کہ سعد اللہ خان ہم سے آن ملا۔ وہ اور اُس کے ساتھی خاصے تھکے ہوئے تھے۔ سعد نے بتایا کہ مہابت خان نے مندو تک اُن کا پیچھا کیا اور تب اُسے احساس ہوا کہ اُس کے ساتھ دھوکا ہوا۔ چنانچہ اس نے پلٹ کر ہمیں تلاش کرنا شروع کر دیا۔ سعد کی باتیں سن کر مجھے یقین ہو گیا کہ بہت جلد مغل سپہ سالار ہمیں تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

اور پھر ایک رات سوتے میں عیسیٰ نے ہمیں بیدار کر دیا۔ مہابت خان اجیر پہنچ گیا تھا اور اب اودے پور کی جانب بڑھ رہا تھا۔

”وہ یہاں سے ایک روز کی مسافت پر ہے۔“ کرن سنگھ خود پیغام لے کر آیا تھا۔ ”اگر صاحب عالم اجازت دیں تو میں اپنی سپاہ اُس کے مقابلے کے لیے روانہ کر دوں؟“

”نہیں کرن سنگھ!“ صاحب عالم نے اُسے منع کر دیا۔ ”تم پہلے ہی ہمارے لیے بہت کچھ کر چکے ہو، اب اس کی ضرورت نہیں۔ ایک دن ہمارے فرار کے لیے بہت ہے۔“

اندھیری رات میں ہم ایک بار پھر نامعلوم منزلوں کی جانب کوچ کر گئے تھے۔

○○○

کرن سنگھ نے میواڑ کی سرحدوں پر ہمارا استقبال کیا۔ اُس نے وہی عزت و تکریم دی، جو ایک وفادار دوست دوسرے کو دیتا ہے۔

”آپ جب تک چاہیں مجھے شرف میزبانی بخش سکتے ہیں صاحب عالم!“ کرن سنگھ فرط احترام میں زمین تک جھک آیا تھا۔

”ہم صرف انتہائی ضرورت کے تحت تمہیں زحمت دیں گے کرن سنگھ!“ صاحب عالم نے جواب دیا۔ ”شہزادی ارجمند بہت تھک گئی ہیں اور بیمار ہیں، ہم چاہتے ہیں۔۔۔ کہ اُن کی صحت یابی تک اودے پور میں قیام کریں۔“

”شہزادی حضور! جاگ مندر کے جھیل محل میں قیام کر سکتی ہیں صاحب عالم!“ کرن سنگھ نے جواب دیا۔ ”اُن کی بہادری اور حوصلے نے ہمیں اپنی قابل احترام ملکہ کی یاد دلادی ہے، جنہوں نے قیدی بننے کے بجائے تالاب میں کود کر جان دے دی تھی۔ میں شہزادی ارجمند کا اسی طرح احترام کروں گا، جیسے ملکہ پدمنی کا کرتا ہوں۔“

میں ملکہ پدمنی کے قصے سے واقف تھی۔

تین سو سال قبل پٹھان بادشاہ علاؤ الدین خلجی نے پدمنی کی بے انتہا خوب صورتی کی تعریف سنی تھی۔ وہ میواڑ کے رانا کے چچا بھیم سنگھ کی بیوی تھی۔ علاؤ الدین خلجی نے چتوڑ پر حملہ کر دیا اور شرط رکھی کہ اگر وہ ملکہ پدمنی کو ایک نظر دیکھ لے تو اپنی سپاہ کے ساتھ واپس چلا جائے گا۔

ایک مسلمان کی حیثیت سے براہ راست ایک ہندو شہزادی کو دیکھنا ناممکن امر تھا، چنانچہ خلجی کا محاصرہ ختم کرانے کی غرض سے اُسے ایک بڑے آئینے میں ملکہ پدمنی کا سراپا دکھایا گیا۔ اُس کی خوب صورتی دیکھ کر خلجی اپنا وعدہ بھول گیا اور اُس نے زیادہ قوت کے ساتھ چتوڑ پر حملہ کر دیا۔

لیکن فتح کے بالکل قریب آنے پر ملکہ پدمنی ایک سُرخ رنگ کے ذریعے محل سے نکل گئی اور دوسری راجپوت عورتوں کے ساتھ مل کر تالاب میں چھلانگ لگادی۔

○○○

سعد اللہ خان، مہابت خان کی سرگرمیوں پر متعین ایک جاؤس کو لے کر میرے پاس پہنچا۔

”مہابت خان ہم سے چند روز کے فاصلے پر ہے۔۔۔ صاحبِ عالم!“ اُس نے مجھے آگاہ کیا۔ ”وہ اندور کے قریب پہنچ چکا ہے۔“

”شہزادی سفر کے قابل نہیں سعد اللہ خان!“ میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

”آپ ایک دن ہندوستان کے شہنشاہ بنیں گے شہزادے! لیکن تب تک کے لیے ہمیں بھاگتے رہنا ہے۔“ سعد نے جواب دیا۔ ”ہم واپس نہیں جاسکتے۔ اب ہمارے پاس صرف دوراستے ہیں۔ مشرق یا مغرب، اس لیے میری درخواست ہے کہ صاحبِ عالم جلد کوئی فیصلہ فرمائیں۔“

”مغرب!“ میں نے جواب دیا۔

اسی وقت ایک پہرے دار ہماری طرف بڑھا۔ اُس کے عقب میں ایک اور بھاری بھر کم شخص موجود تھا۔

”صاحبِ عالم! یہ شخص آپ سے ملاقات کا خواہش مند ہے۔“ پہرے دار نے اُس کی طرف اشارہ کیا اور وہ فوراً کورنش بجالانے کے لیے جھٹک گیا۔

”تم کون ہو؟“ میں اُس باریش شخص کی طرف متوجہ ہوا۔

”صاحبِ عالم نے مجھے پہچانا نہیں۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”میرا نام ارجن لال ہے۔“

”اوہ!“ اچانک مجھے سب کچھ یاد آ گیا۔ ”کیا تھا کہ کو خبر مل گئی تھی؟“

”جی صاحبِ عالم!“ ارجن لال نے جواب دیا، پھر اُس نے جھپکتے ہوئے کہا۔ ”اگر صاحبِ عالم پسند فرمائیں تو میں آپ کو ایسی جگہ لے جاسکتا ہوں، جہاں آپ اور شہزادی حضور اُس وقت تک محفوظ رہ سکتے ہیں، جب تک شہزادی حضور سفر کے قابل نہیں ہو جائیں۔“ میرے پاس ظاہر ہے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ ارجن لال گھائیوں میں ایسی جگہ لے گیا، جہاں مہابت خان زندگی بھر بھی سر نہ کر سکتا تو کبھی نہ پہنچ پاتا۔

شہاب الدین

میں شمال کی جانب نہیں جاسکتا تھا کیونکہ ظلِ الہی بہ نفس نفیس وہاں موجود تھے۔ مشرق میں مہابت خان آندھی اور طوفان کی طرح بڑھا چلا آ رہا تھا۔ مغرب میں واقع فارس ہم سے پہلے ہی حالت جنگ میں تھا، لیکن میں وہاں جانا بھی نہیں چاہتا تھا کیونکہ ظلِ الہی کے انتقال کی صورت میں تخت کا دعویٰ کرنے کے لیے مجھے ایک طویل سفر طے کرنا پڑتا اور ممکن تھا کہ اس تاخیر سے میرا دعویٰ اپنی اہمیت کھو بیٹھتا۔ اس لیے میں مغلیہ قلمرو کی حدود میں ہی رہنا۔۔۔ چاہتا تھا۔

چنانچہ ہم جنوب کو روانہ ہوئے۔ دکن میں، ہمیں عارضی پناہ مل سکتی تھی، جو میں اپنے لیے نہیں اپنی محبوب کے لیے چاہتا تھا۔ وہ میرے لیے بہت صعوبتیں اٹھا چکی تھی۔ اس لیے میں چاہتا تھا کہ وہ دو گھڑی سکون کا سانس لے لے۔ وہ پوری کائنات میں واحد ہستی تھی جس کے دل میں مجھ سے بے وفائی کا جج پنپ نہیں سکتا تھا۔

پورا موسمِ برسات ہم نے سفر میں گزاردیا۔ برسات گزرنے کے اُنیسویں دن ہم مندو پہنچے۔

آگے روانگی کے امکانات معدوم ہو گئے تھے۔۔۔ ارجن کی حالت پھر بگڑ گئی تھی۔ طبیب نے مزید سفر سے منع کر دیا۔ چند دن کے علاج سے اُس کی طبیعت تو سنبھل گئی، لیکن اللہ نے اپنی ایک اور امانت دُنیا میں آنے سے پہلے ہی واپس لے لی۔ مارے دکھ کے میری آنکھیں نم ہو گئیں، لیکن یہ نمی صرف ارجن کے لیے تھی۔ طبیب نے ہمیں روانہ ہونے کی اجازت نہ دی۔

1035ھ (1625ء)

تیسرے موسم سرما میں ہم بنگال جا پہنچے۔ اس سرزمین پر سردی نہیں تھی۔ موسم قدرے خشک تھا، لیکن شہزادی ارجمند کو یہ راس نہ آسکا اور وہ بخار میں مبتلا ہو گئی، جو وقفے وقفے سے تیز اور کم ہوتا رہتا۔ بخار کے باعث وہ یوں کاٹنے لگتی تھی، جیسے کسی برفستان میں موجود ہو۔ بنگال دریاؤں کی سرزمین تھی۔ اس وقت ہم ہنگلی کے کنارے سفر کر رہے تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ اسی دریا کے کنارے کچھ فاصلے پر ایک قلعہ موجود ہے، جہاں بعض دوسری سہولتوں کے ساتھ ادویات بھی میسر ہیں۔ میں نے ارجمند کی بیماری اور دُور دراز ہونے کی وجہ سے یہاں پناہ لینے کا فیصلہ کر لیا۔

یہ ایک نسبتاً چھوٹا سا قلعہ تھا جو عین سمندر پر واقع تھا۔ سمندر ہمیں براہ راست نظر نہیں آتا تھا، لیکن قلعے کی فصیل کے ساتھ سمندر میں لنگر انداز جہازوں کے بلند و بالا مستول مجھے ضرور نظر آ رہے تھے۔ اس طرح کے جہاز میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ قلعہ ہمارے شایان شان نہ تھا، لیکن ایک بیمار شہزادی اور در بدر شہزادے کو پناہ دینے کے لیے کافی تھا۔

○○○

کچھ عرصے بعد مجھے خبر ملی کہ مہابت خان نزدیکی پہاڑیوں میں موجود ہے۔ میرا بھائی شہزادہ پرویز بھی اُس کے ہمراہ تھا۔ اُن کے پاس تیس ہزار سوار، پچاس جنگی ہاتھی، تیرہ توپیں، اور بار برداری کے بے شمار اُونٹ تھے۔

ہم وہاں سے نکل کر مزید مشرق کی جانب بڑھے اور ایک نواب کے مہمان بنے۔ اسی دوران مجھے مہابت خان سے جنگ لڑنی پڑی، جو میری خواہش نہیں تھی بلکہ مجبوری تھی، جس نواب کے ہم مہمان تھے، وہ بہت ہی مہربان تھا۔ ہم نے بہت دن اُس کے پاس گزارے، لیکن تقدیر نے ابھی ہمارے خانے میں بد نصیبی کے اور بھی دن لکھے ہوئے تھے۔

ہم نے پورا موسم سرما وہاں گزارا حتیٰ کہ ملک عنبر نے مجھے اطلاع دی کہ مہابت خان ہماری طرف بڑھ رہا ہے۔ ملک عنبر ایک پٹھان سپہ سالار تھا اور اُس نے دکن کے۔۔۔ شہزادوں کی اُس مشترکہ سپاہ کی قیادت کی تھی، جسے میں نے سالوں پہلے شکست دی تھی۔ میرے سابقہ دشمن نے ایک قاصد کو سرگوجا واپس آتے ہوئے گرفتار کیا تھا، جس نے مہابت خان کو سرگوجا کے نواب کے ہاں ہماری موجودگی کی اطلاع دی تھی۔

مجھے جس وقت ملک عنبر کا پیغام ملا اُس وقت بہت تاخیر ہو چکی تھی۔ مہابت خان، سرگوجا سے صرف پانچ چھ کوس کے فاصلے پر تھا۔ میں نے شہزادی ارجمند کو عیسیٰ اور بچوں کے ہمراہ آگے روانہ کر دیا اور خود مہابت خان کے مقابلے پر جا ڈٹا۔

مہابت خان نے تیز رفتاری سے سفر کرنے کی غرض سے جنگی ہاتھی اور توپیں پیچھے چھوڑ دی تھیں۔ میں نے مغل سپاہ پر براہ راست حملہ نہ کیا بلکہ شب خون کا انداز اپنایا۔ ہم رات کی تاریکی میں مغل سپاہ پر حملہ کرتے اور پھر پہاڑیوں میں گم ہو جاتے۔ چوتھے روز مہابت خان نے مغل سپاہ کو ڈیرے ڈالنے کا حکم دے دیا۔ اُس کا خیال تھا کہ میں اب کھلے میں اُس سے جنگ کروں گا۔

لیکن بوڑھا سپہ سالار یہاں دھوکا کھا گیا۔ میں نے لڑنے کے بجائے راہ فرار اختیار کی اور دسویں روز جیس پور میں شہزادی ارجمند سے جا ملا۔

○○○

ہے۔“ اُس نے جواب دیا۔

”جو تم چاہو گے، ہم وہی کریں گے۔“

”آپ کو ہمارے گرجے میں آ کر مقدس ماں کی عبادت کرنی ہوگی تاکہ وہ آپ کو آفات سے محفوظ رکھے۔“

ہم ششدر رہ گئے۔ وہ ہمیں کھلم کھلا عیسائی ہونے کے لیے کہہ رہا تھا۔

”لیکن ہم نے تو تمہیں مسجدوں میں آ کر عبادت کرنے کو نہیں کہا۔“ شہزادے کی پاٹ

دار آواز اُبھری۔ ”پھر تم اس پر کیوں مصر ہو کہ ہم گرجے میں عبادت کریں؟“

”یہی ہماری شرط ہے۔“ پادری نے جواب دیا۔ ”اگر آپ کو منظور نہیں تو آپ جاسکتے

ہیں۔ ہم آپ کی بیوی کے لیے ادویات بھی اسی شرط پر فراہم کریں گے؟“

میں نے شہزادے کی طرف دیکھا۔ اُن کے ہونٹ سختی سے بھیچے ہوئے تھے۔ وہ بڑے

غور سے پادری اور قلعے کے سردار کو دیکھ رہے تھے۔ عظیم الشان مغلیہ سلطنت کے بھڑولے عہد

کی بے بسی دیکھ کر میری آنکھیں نم ہو گئیں۔

”تم جانتے ہو کہ ہم کون ہیں؟“ شہزادے کی آواز پہلے کی نسبت زیادہ بلند تھی۔ ”تم

ولی عہد سلطنت سے بے وقوفوں کی طرح بات کر رہے ہو۔ ہم نے تم سے پناہ کی درخواست

کی اور تم نے سودے بازی شروع کر دی۔ ہماری بیوی کی صحت، بازار میں رکھا ہوا کوئی

سامان نہیں، جس پر مول تول کیا جائے۔ وہ شہزادی اور ہندوستان کی ہونے والی ملکہ ہے۔

ہمیں چونکہ مدد کی ضرورت تھی۔ اس لیے تمہارا خیال ہے کہ ہم اپنی مجبوری کے تحت مذہب بھی

تبدیل کر لیں گے۔ کیا مہابلی اور ہمارے والد نے تمہیں یہاں کام کی اجازت اس لیے دی

ہے کہ تم عظیم مغلوں کے وارثوں کو گمراہ کرنا شروع کر دو۔“

”میرے خیال میں آپ کے والد گرامی کو یہ سن کر بے حد خوشی ہوگی کہ آپ کہاں چھپے

ہوئے ہیں۔“ پادری نے ڈھٹائی کے ساتھ کہا۔ ”اس سے پہلے کہ ہم قاصد بھیج کر عظیم مغل

شہنشاہ کو آگاہ کریں کہ اُن کا معتب شہزادہ اس صوبے میں موجود ہے آپ تشریف لے جا

سکتے ہیں۔“

”اور ہماری اہلیہ؟“

عیسیٰ

شہزادہ شہاب الدین محمد خرم۔۔۔ سعد اللہ خان اور میں پچاس سواروں کے ہمراہ قلعے کی جانب بڑھے تھے۔ قلعے کی عمارتوں کی طرز تعمیر ہمارے لیے نئی تھی۔ درمیان میں ایک گرجا بھی بنا ہوا تھا۔ مقامیوں کی تعداد کم لیکن فرنگیوں کی بہت زیادہ تھی۔ انہوں نے بڑے چست لباس پہن رکھے تھے۔ انہیں دیکھ کر مجھے وہ دو فرنگی یاد آ گئے، جنہوں نے بہت سال قبل آگرہ میں آغاچی کا نقاب نوچا تھا۔

ہمیں قلعے میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی گئی بلکہ قلعے کا سالار اعلیٰ اپنے پادری اور بعض پہرے داروں کے ہمراہ مرکزی دروازے پر پہنچا۔ سالار یا پادری نے شہزادے کو تکریم دی نہ ہی کورنش بجالائے۔

”ہم تمہارے قلعے میں کچھ وقت گزارنا چاہتے ہیں۔“ شہزادہ خرم نے قلعے کے سالار کو مخاطب کیا۔ ”ہماری اہلیہ بیمار ہیں۔ اور ہمیں بتایا گیا ہے کہ یہاں ایسی ادویات موجود ہیں، جو اُس کی زندگی بچا سکتی ہیں۔“

قلعے کے سالار کے بجائے اُن کا پادری ایک قدم آگے بڑھ آیا۔ ”مجھے تو سوائے سپاہیوں کے کوئی اور نظر نہیں آ رہا۔“

”وہ کچھ فاصلے پر موجود ہے۔ ہم اُسے لے آئیں گے۔۔۔“ شہزادے نے جواب دیا۔ ”لیکن تم میں سے کوئی اُس کا چہرہ نہ دیکھ سکے گا۔ ہم ایک طویل عرصے سے سفر میں ہیں اور ہمارے بیوی بچے آرام کے طالب ہیں۔“

پادری کچھ دیر خاموش رہا اور پھر گویا ہوا۔ ”یہ ممکن ہے، لیکن اس کا انحصار خود شہزادے پر

ہم نے دمدور کو پار کیا اور پھر مشرق کی سمت سفر کرتے ہوئے جمنا کے کنارے جا پہنچے۔ مہابت خان ہنوز ہمارے تعاقب میں تھا۔ مغل سپاہ کا خیال تھا کہ ولی عہد سلطنت قلعے پر حملہ آور ہوں گے، چنانچہ مہابت خان نے اپنے تئیں ہمارا راستہ روکنے کے لیے ہماری جانب پیش قدمی شروع کر دی۔

ہماری نیندیں ایک مرتبہ بھر حرام ہو گئیں۔ ہم نے جنوب کی طرف رخ موڑ لیا اور پھر واپس ہو گئے، لیکن اس بار ہم فرنگی قلعے کی طرف نہیں گئے۔ ہماری یہ واپسی سودمند ثابت نہ ہوئی اور کواردھا کے قریب مہابت خان نے ہمیں آ لیا۔ دونوں سپاہ کے درمیان معمولی سی جنگ بلکہ جھڑپ ہوئی، لیکن اس معمولی سی جھڑپ میں ہی ولی عہد سلطنت کو احساس ہو گیا کہ ان کا بھاگنا فضول ہوگا۔ مغل سلطنت کی سرحدیں اتنی وسیع تھیں کہ زندگی بھر ہم ان میں بھاگتے رہتے اور مہابت خان بدستور ہمارا تعاقب کرتا رہتا۔

صاحب عالم اپنے شامیانے میں تشریف لے گئے اور اس کے بعد ایک دستاویز تیار کرنی شروع کر دی۔ تحریر خود صاحب عالم کی تھی۔ انہوں نے مجھے علامہ سعد اللہ خان کو لینے بھیج دیا اور جب میں علامہ کے ساتھ واپس پہنچا، صاحب عالم اپنی تحریر مکمل کر چکے تھے۔ یہ ایک نامہ تھا، فاتح عالم، آقائے بحر و بر شہنشاہ ہندوستان، ظل الہی، عظیم مغل شاہ نور الدین محمد جہانگیر کے نام

”معتوب شہزادہ، ظل الہی سے معافی کا خواستگار ہے۔“ خط کا آغاز ہی ان الفاظ سے کیا گیا تھا۔ ”ہمارے ساتھ جو سلوک ہوا شاید ہم اس کے مستحق تھے یا ممکن ہے ہمیں آپ کی جو محبتیں اور چاہتیں نصیب ہوئیں، ہم نے ان کا غلط نتیجہ اخذ کیا۔ گزشتہ کئی سال ہم نے اقلیم مغلیہ میں مارے مارے پھر کر گزارے ہیں، لیکن اب ہم اعتراف کرتے ہیں کہ ہم ہمت ہار

”ہم اُس کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔“ پادری نے رکھائی سے کہا اور واپسی کے لیے مڑ گیا۔ قلعے کا دروازہ بند ہو گیا۔

میں باقاعدہ رو دیا۔ عظیم الشان محلوں کا مالک شہزادہ، پناہ کی تلاش میں ایک معمولی سے قلعے کے بند دروازے کے باہر بے بس کھڑا تھا۔ وہ جس کے حکم سے چاند ستارے زمین پر اتر آتے تھے، اُسے آج کوئی قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔ وہ عورت جیسے ہندوستان کا ہونے والا بادشاہ اپنی پلکوں پر بٹھاتا تھا، بے یار و مددگار تیز بخار میں تپ رہی تھی اور کوئی اُس کا پڑسان حال نہ تھا۔

شہزادہ خرم کچھ دیر خاموش کھڑے۔ قلعے کے بند دروازے کو گھورتے رہے اور پھر کچھ کہے بغیر اپنا گھوڑا واپس موڑ لیا۔ ہم نے بھی سکوت کی چادر اوڑھے اُن کی تقلید کی تھی۔

000

حمیری

شکوہ و شبہات لاحق تھے۔۔۔۔۔ چنانچہ شہزادے اور شہزادی نے دکن میں ہی رکنے کا فیصلہ کیا۔

مہابت خان نے دو کم سن شہزادوں کے تحفظ کے لیے دس ہزار سوار روانہ کیے۔ آغاچی نے مجھے ان دونوں کے ہمراہ دربار جانے کا حکم دیا۔ اس نے دونوں بیٹوں کو یکساں توجہ، محبتوں اور بوسوں کے ساتھ رخصت کیا۔ صاحبِ عالم نے بھی دونوں کو بے حد پیار کیا، لیکن جانے کیوں میرے دل میں یہ جھین تھی کہ شہزادہ اورنگ زیب کے حصے میں پیار نسبتاً کم آیا ہے۔

جاتے ہوئے شہزادہ دارا نے کئی بار پلٹ کر اپنے والدین کو دیکھا، لیکن شہزادہ اورنگ زیب ایک بار بھی نہیں پلٹا۔

○○○

بیٹھے ہیں۔ اب یہ دشمنی ہمارے لیے سوہان روح بن گئی ہے۔ صرف ہم ہی نہیں بلکہ ہماری بیوی اور بچے بھی بے سکون ہیں اور ہم آپ کے سایہ عاطفت میں امن چین سے زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ ہم اپنی زندگی آپ کے ہاتھوں میں دے رہے ہیں۔ ظل الہی ہم سے جو چاہے سلوک کریں۔“ انہوں نے سر بند نامہ۔۔۔۔۔ سعد اللہ خان کے حوالے کر دیا۔

”ہمارا نامہ ہر حال میں ذاتی طور پر ظل الہی کے ہاتھوں میں جانا چاہیے۔“ صاحبِ عالم نے ہدایت کی۔

”ممکن ہے چلکے عالیہ اس کی اجازت مرحمت نہ کریں۔“ سعد نے خدشہ ظاہر کیا۔

”اس سے بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔“ شہزادے نے کہا۔ ”مہابت خان گزرے ہوئے چند سالوں میں اتنا طاقت ور ہو گیا ہے کہ کسی بھی لمحے ملکہ کے اقتدار کے لیے خطرہ بن سکتا ہے۔“

سعد نے کندھے اچکائے۔ یقینی طور پر وہ صاحبِ عالم سے متفق نہ تھا۔ اس نے کورنش ادا کی اور چند ہی ساعتوں بعد وہ ایک تیز رفتار گھوڑے پر سوار روانہ ہو گیا۔

ہم نے آگے بڑھ کر برہان پور میں ڈیرے ڈال دیے اور سعد کی واپسی کا انتظار شروع کر دیا۔ ہمیں یقینی طور پر یہ بھی علم نہ تھا کہ ظل الہی ان دنوں کہاں تھے؟ اگر وہ آگرہ میں تھے تو جواب جلد آنے کی توقع تھی، اگر لاہور میں تھے تو کچھ تاخیر ہوتی اور اگر کشمیر روانہ ہو چکے تھے تو پھر اچھی خاصی تاخیر کا امکان تھا۔

بالآخر جواب آ گیا، ظل الہی کی جانب سے نہیں، ملکہ ہند نور جہاں کی جانب سے تھا۔ ملکہ نے ولی عہد کو معاف کر دیا تھا، لیکن بہت ہی سخت شرائط۔۔۔۔۔ پر شہزادے کو اپنے تمام قلعوں سے دست بردار ہو کر ایک چھوٹے اور بے مصرف صوبے بالا گھاٹ کی صوبے داری قبول کرنی تھی۔ ملکہ نے شہزادہ دارا شکوہ اور شہزادہ اورنگ زیب کو بہ طور یرغمال طلب کیا تھا۔ شہزادے نے تمام شرائط فوری تسلیم کر لیں اور ہم وہیں رک کر ظل الہی کے فرمان منظوری کا انتظار کرنے لگے۔ جب شاہی فرمان ہم تک پہنچا، صاحبِ عالم نے اپنا ہاتھ اس پر ٹیک دیا۔ یہ شہنشاہ سے اطاعت اور فرماں برداری کا اظہار تھا۔

فرمان شاہی کے آنے کے باوجود صاحبِ عالم کو اپنی زندگیوں کے بارے میں بعض

1068ھ (1658ء)

ممتاز محل

”دارا کو بچاؤ۔۔۔۔۔ اپنے بھائی کی جاں بخشی کراؤ۔“ عظیم مغل شہنشاہ شاہ جہاں نے اپنی بیٹی شہزادی جہاں آرا کو ہدایت کی۔ ”اورنگ زیب تمہیں بے حد چاہتا ہے۔ وہ صرف تمہاری درخواست سنے گا، ہماری نہیں، شہزادی۔۔۔۔۔ یہ ہمارا مقدر ہے کہ ہم نے جسے چاہا اللہ نے اسے ہم سے چھین لیا۔۔۔۔۔ پہلے ہماری محبوبہ ارجمند۔۔۔۔۔ اور اب دارا۔۔۔۔۔ جاؤ شہزادی۔۔۔۔۔ اورنگ زیب پر اپنی محبتیں آزماؤ، وہ تمہارا محبوب بھائی ہے، تمہاری بات ضرور مانے گا۔ ہم پہلے شاہ شجاع کو کھو چکے ہیں۔ ڈاکوؤں نے بنگال میں اسے مار ڈالا ہے جب کہ مراد خود اورنگ زیب کی بھینٹ چڑھ گیا ہے۔ چار ایک جیسے ہاتھی علی الصبح خیمہ گاہ سے روانہ ہوئے تھے اور کوئی نہیں جانتا کہ ان میں کس ہاتھی کے ہودے پر مراد سوار تھا۔۔۔۔۔ جاؤ جہاں آرا۔۔۔۔۔ جلدی کرو۔۔۔۔۔ اس سے پہلے کہ اورنگ زیب، دارا کو بھی قربان کر دے، اس کی جاں بخشی کراؤ۔“

شہنشاہ جہرہ کے میں تشریف فرما جمنے کے اس پارتاج محل پر نگاہیں جمائے ہوئے تھے۔ ملکہ ممتاز محل اور شہنشاہ دونوں ہی قیدی تھے۔ ایک سنگ مرمر کی قید میں اور دوسرا ہیرے جواہرات کی بندشیں پہنے ہوئے بیٹھا تھا۔

شہزادی جہاں آرا شہنشاہ کا حکم پا کر فوری طور پر دہلی روانہ ہو گئی تھیں، جہاں ان دنوں شہزادہ اورنگ زیب مقیم تھا۔ آٹھ گھڑ سوار حفاظت کے لیے شہزادی کے قافلے کے آگے آگے چل رہے تھے جب کہ عیسیٰ، شہزادی کے رتھ کے ساتھ ساتھ تھا۔

ooo

عظیم مغل شہزادہ اورنگ زیب، قلعہ مدہلی میں شہزادی جہاں آرا کا منتظر تھا۔ یہ اس کے والد نے تعمیر کرایا تھا، لیکن ہنوز نامکمل تھا۔ مغل شہزادہ اس وقت دہلی دروازے پر موجود تھا اور نیچے ایک جھوم جمع تھا۔

شہر سے آنے والے راستے پر جمع جھوم کائی کی طرح پھٹا اور شہزادی جہاں آرا کی سواری نمودار ہوئی۔ شہزادے نے آگے بڑھ کر اپنی سب سے بڑی بہن کا استقبال کیا۔ وہ خوب سمجھتا تھا کہ شہزادی کیوں آئی ہے؟

اس نے دارا کو بھی طلب کر لیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک مدقوق شخص زنجیروں میں جکڑا ہوا اندھیری کوٹھڑی سے برآمد ہوا۔ اس کا لباس دھول اور گرد میں اٹا ہوا تھا۔ وہ شہزادہ دارا شکوہ تھا۔

شہزادی جہاں آرا کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپک پڑے۔ اس کے سینے میں بہن کا دل دھڑکتا تھا۔

”میرے بھائی!“ اس نے شہزادہ اورنگ زیب سے التجا کی۔ ”اپنے اور میرے مشترکہ بھائی کو معاف کر دو۔ اس کا واحد جرم اپنے والد جہاں پناہ کے احکامات کی تعمیل کرنا ہے، جو اس سے بے تحاشہ پیار کرتے ہیں۔ وہ ہمیشہ سے ایک فرماں بردار بیٹا اور ہمارا مہربان بھائی رہا ہے۔ میں تم سے کہہ نہیں رہی، التجا کر رہی ہوں۔ منت کر رہی ہوں۔۔۔۔۔ اس سرزمین کی غریب ترین بھکارن کی طرح۔۔۔۔۔ میں جھک کر تمہارے پاؤں چھوتی ہوں۔۔۔۔۔“ شہزادی جہاں آرا سسک رہی تھی، رو رہی تھی۔۔۔۔۔ ”صرف اس کی زندگی کے لیے، آزادی کے لیے، چاہو تو اسے مغل بادشاہت کے آخری کونے کے کسی اندھیرے قید خانے میں ڈال دو، اسے جنگلوں یا پہاڑوں میں بھیج دو مگر اس کی جاں بخشی کر دو، اپنی زندگی کا

سے کہا۔ ”جہاں پناہ نے شہزادہ خسرو کو کہا تھا کہ تخت یا تختہ میں کسی ایک کا انتخاب کر لو۔ ایک اندھے شہزادے کے لیے کیا یہ ایک ظالمانہ پیش کش نہ تھی کیوں کہ اسے تو کسی شے کا اختیار ہی نہ تھا اور اب ہم دارا کو بھی کسی شے کا اختیار نہیں دیں گے۔ اس کے مقدر میں تخت نہیں، صرف تختہ ہے۔“ شہزادہ اورنگ زیب کے ہونٹوں پر ایک عجیب مسکراہٹ ابھر آئی۔ ”گواہ رہنا ہماری عزیز از جان بہن اور جہاں پناہ کو بتانا کہ ہم ان کے سب سے فرماں بردار بیٹے ہیں۔ بھلا اپنے والد بزرگوار کے نقش قدم پر چلنے والے بیٹے سے زیادہ فرماں بردار اور کون ہوگا؟“ شہزادہ اورنگ زیب نے نیچے جھانکا۔ میدان میں ہجوم اور بڑھ گیا تھا۔ شہزادہ دارا اب بھی اپنے محافظوں میں گھرا ہوا تھا۔ پہلے وہ ہجوم کو دیکھتا رہا اپنے شناسا چہرے تلاش کرتا رہا، لیکن یہ بھی قانون قدرت ہے کہ معتب کی کوئی شناسائی نہیں ہوتی۔ وہاں سب لوگ اس کے اجنبی تھے۔ اس نے اوپر دیکھا۔ اس کا بھائی اور بہن۔۔۔ نہیں، شہزادہ اورنگ زیب اور شہزادی جہاں آرا پہلو بہ پہلو کھڑے تھے۔

دونوں بھائیوں کی نگاہیں ملیں اور شہزادہ اورنگ زیب نے رخ پھیر لیا۔ کاش، شہزادی جہاں آرا کے بجائے۔۔۔۔۔ جہاں پناہ خود دہلی آگئے ہوتے تو ہم دارا کو معاف کر دیتے۔ شہزادہ اورنگ زیب نے سوچا۔ ہمیں اسی لمحے وہ یہ احساس دلادیتے کہ انہیں ہم سے بھی محبت ہے۔ وہ ایک بار اقرار کرتے، ہم ہزار بار دارا کو آزاد کر دیتے۔ احساس محرومی نے مثبت سوچ پر غلبہ پالیا۔۔۔۔۔ اور شہزادہ اورنگ زیب نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھا دیا۔

شہزادہ دارا کو پھانسی کے تختے پر چڑھا دیا گیا۔ بھائی کی محبت نے اچانک حملہ کیا تو شہزادے نے ہاتھ گرا لیے۔

”عیسیٰ!“ شہزادے اورنگ زیب نے پکارا۔ ”ہمارا حکم ہے کہ شہزادہ دارا کو ہاتھی پر بٹھا کر پورے شہر کا گشت کرایا جائے تاکہ دوسروں کو عبرت حاصل ہو۔“

حکم کی فوری تعمیل ہوئی۔ ملک جیون نامی جلا دنگی تلوار لے کر دارا کے پیچھے بیٹھ گیا اور شہنشاہ ہند کا سب سے بڑا بیٹا ایک بھکاری شہزادے کے روپ میں شہر روانہ ہو گیا۔

”جہاں پناہ خود تشریف کیوں نہیں لائے؟“ شہزادہ اورنگ زیب نے اپنے پہلو کھڑی

خیرات کے طور پر ہی اسے جینے کا حق دے دو۔۔۔۔۔ تمہارا دعویٰ ہے، تم مجھ سے بے انتہا محبت کرتے ہو۔ اسے میری محبت کی آنکھوں سے دیکھو۔ میں زندگی بھر اپنی پوری۔۔۔۔۔ تو انائیوں سے تمہاری خدمت کروں گی۔ اگر تم مجھ سے محبت کرتے ہو تو اسے معاف کر دو۔“

”تو کیا محبت بھی شرائط کی پابند ہے؟“ شہزادہ اورنگ زیب نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”بعض اوقات اسے قائم و دائم رکھنے کے لیے شرائط ضروری ہو جاتی ہیں۔ محبت دنیا کا سب سے کمزور رشتہ ہے جس کے تقاضوں کو اگر فراموش کر دیا جائے تو یہ خاک میں مل جاتا ہے۔“

”تو آپ اپنی محبت، اپنے بھائی کی جان بچانے کے لیے استعمال کرنا چاہتی ہیں؟“

”میرے پاس اس کے سوا اور ہے بھی کیا؟ میرے پاس کوئی سپاہ نہیں، میں تمہاری بہن ہوں اور اکیلی ہوں ہمارا خون ایک ہے۔ وہ دن یاد کرو، جب تم میری خاطر ایک ہزار کس کا فاصلہ طے کر کے آئے تھے۔ آج ایک بار اور میرا مان رکھ لو اور دارا کو معاف کر دو۔“

”لیکن کیا آپ کو جہاں پناہ کا وہ سلوک یاد نہیں، جو انہوں نے ہم سے روا رکھا۔ کیا ہم اتنے فرماں بردار نہ تھے، جتنا شہزادہ دارا تھا، پھر ان کی محبتیں اور توجہ ہمارے حصے میں کیوں کر نہ آئیں۔ جہاں پناہ کو دارا کے علاوہ کوئی نظر نہیں آتا۔ یہی وہ سیاہ بادل ہے، جو ہمارے اور۔۔۔۔۔ جہاں پناہ کے مابین حائل ہے۔ ہمیں بتاؤ۔۔۔۔۔ پیاری بہن۔۔۔۔۔ عظیم ہندوستان کی عظیم تر شہزادی۔۔۔۔۔ شہزادہ خسرو کی جان کی بھیک کس نے مانگی تھی؟“

”امی حضور نے۔“

”تو کیا امی حضور کی التجاؤں نے شہزادے کو زندگی۔۔۔۔۔ بخش دی تھی؟“ شہزادے نے اپنی بہن کی آنکھوں میں جھانکا جو آنسوؤں سے لبالب بھری ہوئی تھیں۔ ”امی حضور بھی تمہاری طرح روئی تھیں اس کی زندگی بچانے کے لیے، لیکن کیا ان کے آنسوؤں نے شہزادے کو بچا لیا تھا؟“

”نہیں۔“

”تو پھر، ہم اب آپ کی التجاؤں پر توجہ کیوں دیں؟“ شہزادہ اورنگ زیب نے رکھائی

1036ھ (1626ء)

عیسیٰ

گرز بردار نے لکڑی کا جنگلا کھول دیا اور ہم دربار میں داخل ہو گئے۔ شہنشاہ ہند سامنے ہی تخت پر فروکش تھے۔ چار سال میں پہلی بار غل الہی نے اپنے پوتوں کی جھلک دیکھی تھی۔ میں وہیں رک گیا اور دونوں کم سن شہزادے اپنے دادا حضور کو کورنش بجالانے کے لیے پہلے چاندی اور پھر سونے کے جنگلے کے اندر چلے گئے۔

شہزادہ دارا کی عمر دس سال اور شہزادہ اورنگ زیب کی سات سال تھی۔ دونوں بہادر نسلوں کے بہادر سپوت تھے۔ انہوں نے شاہی قبائیں زیب تن کی ہوئی تھیں، جن پر جاجا ہیرے جواہرات ٹانگے گئے تھے۔

ہم نے مہابت خان کی معیت میں برہان پور سے یہاں تک کا سفر چالیس روز میں مکمل کیا تھا۔ راستے میں دونوں شہزادے زیادہ تر خاموش رہے تھے، لیکن میں نے دونوں کے انداز و اطوار میں زمین آسمان کا فرق دیکھا۔ شہزادہ دارا شوخ چلبلا اور کسی حد تک لالہ بالی فطرت کا مالک تھا، جب کہ شہزادہ اورنگ زیب ہر شے کو بالغ نظری سے دیکھتا تھا۔ مہابت خان باقاعدگی سے نماز ادا کرتا تھا اور اپنی اس ننھی سے عمر میں شہزادہ اورنگ زیب نے بھی کبھی نماز قضا نہیں کی، جب تک شہزادہ اپنی نماز مکمل نہیں کر لیتا تھا کسی کو اپنی جگہ سے جنبش کرنے کی اجازت تک نہ تھی۔

”میدان جنگ میں نماز کی ادائیگی کا کوئی وقت نہیں ہوتا، شہزادہ حضور!“ ایک بار میں نے شہزادہ اورنگ زیب کو کہا۔

”بہن سے دریافت کیا جس کی نگاہیں دور ہوتے ہوئے ہاتھی سے چپکی ہوئی تھیں۔“
”کیا تم جہاں پناہ کے آنے سے دارا کو معاف کر دو گے؟“ شہزادی کو اُمید کی کرن نظر آئی۔

”شاید۔“ شہزادے نے جواب دیا۔ ”کم از کم اسی لمحے انہیں احساس ہو جاتا کہ دارا کے علاوہ بھی کوئی ان کی محبتوں کی قدر کرتا ہے۔“ شہزادے کی آواز بلند ہو گئی۔

”جاؤ اور منادی کرا دو کہ ہندوستان اب شہنشاہ ابومظفر شہاب الدین محمد شاہ جہاں غازی کے زیرِ نگیں نہیں رہا۔ اب اقلیم مغلیہ کا والی شہنشاہ ابوحی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر ہے۔“

شہزادہ پلٹا۔ اس کا رخ دیوان عام کی جانب تھا۔ شہزادی جہاں آرا چند ٹائیے ہندوستان کے نئے شہنشاہ کی پشت پر نگاہیں جمائے کھڑی رہی، پھر خواتین کے احاطے کی جانب چلی گئی۔

ooo

حمیدی

مہیاں تو ماضی کی دھول میں دفن ہو گئیں۔ ہم نے شہزادے کو معاف کر دیا ہے۔ تم شہزادے تک ہمارا یہ پیغام پہنچا سکتے ہو۔“ ملکہ شان بے نیازی سے بولیں۔
میں خاموش رہا۔

”اور ہمارا یہ پیغام بھی پہنچا دینا کہ شہزادے ہمارے پاس محفوظ رہیں گے۔“ میرے خاموش سوال کا جواب ملکہ کے ہونٹوں پر چل اٹھا۔ ”ہم تیموری ضابطوں کی پابندی کریں گے۔ کیا تمہارے شہزادے نے پابندی کی؟“ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ”جواب دیتے ہوئے جھجکتے کیوں ہو عیسیٰ؟ یا تیموری ضابطوں کا اطلاق ولی عہد سلطنت پر نہیں ہوتا؟“
”صاحبِ عالم ان ضابطوں کی پابندی فرمائیں گے۔“ میں نے دھیرے سے جواب دیا۔

”یعنی ہم ایک غلام کے وعدے پر بھروسہ کر لیں؟“ ملکہ نے زہر خند سے کہا۔
”ہندوستان کے مستقبل کی ملکہ تو اندھے شہزادے کو بچانہ سکی اور ایک غلام ہمارے داماد کی جاں بخشی کرانے میں کامیاب ہو جائے گا؟ نہیں عیسیٰ! ہم شہزادہ خرم کو بادشاہ بنا کر یہ خطرہ مول نہیں لے سکتے۔“

”ممکن ہے شہنشاہ ہند ملک بدری کا فیصلہ فرمادیں۔“
”ناممکن۔“ ملکہ عالیہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ہمیں ایسی کوئی توقع نہیں۔ تخت کبھی بھی شہریار کی خواہش نہیں رہا۔ یہ سودا ہم نے اس کے ذہن میں سمایا ہے۔ اب تم چاہتے ہو کہ ہم اسے تاج پہنانے کے بجائے کفن اوڑھادیں۔ وہ کچھ بے وقوف ہے اور اس میں اتنی ہمت نہیں کہ اتنی بڑی۔۔۔۔۔ سلطنت کو سنبھال سکے لیکن ہم تو ہیں۔“
”درست ملکہ عالیہ!“

میرے لہجے میں جانے کیا بات تھی کہ ملکہ ہتھے سے اکھڑ گئیں۔
”اپنی زبان سنبھالو عیسیٰ!“ ملکہ نے مجھے سرزنش کی۔ ”ہم ہنوز ہندوستان کی ملکہ ہیں اور تم ایک ایسے غلام ہو جو اپنے آقا کے سائے سے بہت دور ہے۔“
میں جی جان سے کانپ اٹھا۔ ملکہ اگر اپنے الفاظ کو عمل کا روپ دے دیتیں تو میری ہڈیاں پھانسنے والا کوئی نہ ہوتا۔

ملکہ عالیہ نور جہاں نے شہزادوں کا استقبال ظلِ الہی کے خاص محل میں کیا۔ وہ دیوان پر نیم دراز جمنہ کی لہروں پر نظریں جمائے بیٹھی تھیں۔ ذرا فاصلے پر ایک۔۔۔ خوب صورت سی میز سرکاری کاغذات اور دستاویزات سے اٹی ہوئی تھی جن میں مہراز رکھی تھی۔
ظلِ الہی پر وقت نے اپنے گہرے نقوش چھوڑے تھے، لیکن لگتا تھا ملکہ عالیہ کو وقت چھوئے بغیر گزر گیا ہے۔ وہ مجھے پہلے سے زیادہ جوان اور خوب صورت لگیں۔

مجھ سمیت دونوں شہزادوں نے ملکہ ہند کو تعظیم پیش کی۔ ملکہ نے دونوں کے ماتھوں پر پیار کیا اور پھر جلیبیوں، مٹھائی اور لسی سے ان کی تواضع کی گئی۔ شہزادہ دارا نے سب کچھ چکھا، لیکن شہزادہ اورنگ زیب نے لسی کے سوا کسی شے کو ہاتھ نہیں لگایا۔

”شہزادی ارجمند کیسی ہے؟“ ملکہ عالیہ نے مجھ سے دریافت کیا۔
”مسلل سفر نے آغاچی کو تھکا دیا ہے ملکہ عالم۔“ میں نے نظریں جھکا کر جواب دیا۔
”انہوں نے آپ کے لیے نیک تمناؤں کا پیغام بھیجا ہے۔“

”چہ خوب؟“ ملکہ نے تیوریاں چڑھائیں۔ ”شہزادہ خرم نے ظلِ الہی کے لیے محبتیں بھجوائی ہیں اور ارجمند نے ملکہ ہندوستان کے لیے صرف نیک تمنائیں بھیجی ہیں۔“
”میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں ملکہ عالم!“

”حالانکہ تم ارجمند کی روح سے بھی زیادہ اس کے قریب رہے ہو۔“ ملکہ نے طنز کیا۔
”شہزادہ کیسا ہے؟“

”اپنی بادشاہت چھن جانے پر افسردہ ہیں ملکہ عالم!“
”تمہاری زبان کسی روز تمہارا سرتن سے جدا کر دے گی عیسیٰ!“ ملکہ نے ناراض لہجے میں کہا۔ ”زمین کے ایک معمولی سے ٹکڑے کو مغلیہ بادشاہت کے برابر مت تو لو اور پھر غلط

”ارجمند کو ہمارا پیار کہنا۔“ ملکہ دوبارہ گویا ہوئیں۔ ”ہم اسے یاد کرتے ہیں اور لاڈلی بھی اسے بہنوں کی طرح چاہتی ہے۔“

میں نے تعظیم ادا کی اور شہزادوں کی طرف بڑھا، جو دیوان پر ہی سو گئے تھے۔

”انہیں یہیں چھوڑ دو۔“ ملکہ نے حکم دیا۔ ”شہزادے جب بیدار ہوں گے تو ہم انہیں ان کے کمروں میں بھجوا دیں گے۔“

000

1037ھ (1627ء)

ارجمند بانو

قاصد موسم سرما کے اوائل میں آیا۔ ایک ہزار گھڑ سوار اس کے ہمراہ تھے۔ شہزادہ خرم نے محل میں اس سے ملاقات کی۔ وہ ایک مختصر سا پیغام لایا تھا۔

ولی عہد سلطنت نے بڑے سکون اور تحمل کے ساتھ اپنے والد بزرگوار کے انتقال کی خبر سنی اور پھر شہنشاہ جہانگیر کی یاد میں ایک سو دن سوگ کا اعلان کیا۔ میں نے بہ طور خاص ہاتھ اٹھا کر ظلی الہی کی مغفرت کے لیے دعا کی۔

ہم فوری طور پر آسی گڑھ کی جامع مسجد پہنچے۔۔۔۔۔ تلاوت قرآن پاک کے بعد میرے محبوب نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ ولی عہد سلطنت نے دعا کی۔

”اے اللہ! تو سارے جہانوں کا رب ہے، تیری ہی نعمتوں اور رحمتوں نے ہمیں اس مقام پر فائز فرمایا ہے۔ امن و جنگ اور خوشحالی و تنگ دستی میں ہم تجھی سے مدد چاہتے ہیں اور آج ایک بار پھر ہم تیرے حضور سر بہ سجود ہیں کہ ہماری رہنمائی فرما اور تاجدار ہندوستان شہنشاہ ابومظفر شہاب الدین محمد شاہ جہاں غازی کی حیثیت سے ہمیں نیک راہ پر چلنے کی توفیق عطا فرما۔“

پھر وہاں مزید قیام نہیں کیا گیا۔ جلد ہی ہم شمال کی جانب آگرہ کو روانہ ہو چکے تھے۔

ہمارا سفر خاصا سست تھا جگہ جگہ راجا، نواب، امراء، صوبوں کے صوبے دار اور دوسرے معززین، ہندوستان کے نئے شہنشاہ سے اپنی وفاداریوں کے اظہار کے لیے آتے۔ وہ شہنشاہ کے حضور نذریں گزارتے اور تن من دھن سے وفاداری کا مظاہرہ کرتے۔

راستے میں ہی ہمیں ایک اور خبر مل گئی کہ پھوپھو نئے شہنشاہ سے جنگ کے لیے سپاہ ترتیب دے رہی ہیں اور جنگ کا طبل اب بجا کہ تب بجا۔

000

”اس میں کیا شے ہے جہاں پناہ؟“

”تم خود دیکھ لو۔“ لیکن اُس نے حرکت نہ کی۔ ”یہ ہمارا دل ہے ملکہ، اور اس سے زیادہ ہم اپنی ملکہ کیادے سکتے ہیں۔“

ملکہ ارجمند نے صندوق کھول کر اندر جھانکا۔ اُسے شاید کسی قیمتی پتھر کی توقع تھی۔ اندر رکھی ہوئی چیز دیکھ کر اُس کے منہ سے ایک طویل سانس خارج ہو گئی۔

”میں نے اسے پھوپھو کی میز پر دیکھا تھا برسوں پہلے، میں نے اسے ہاتھ لگایا تو وہ ناراض ہو گئی تھیں۔“

”اور اب تم مہرازا کی مالکہ ہو۔ یہ ہماری قوت، طاقت اور اعتماد کی نشانی ہے، جس کی محافظ تم بن گئی ہو۔ ہمارے دیے ہوئے شاہی فرامین پر مہر منظوری اب تم اپنے خوب صورت ہاتھوں سے ثبت کرو گی۔“

اُس نے مہر چند ٹاپے اپنے اس رکھی اور پھر مجھے لوٹا دی۔ ”آپ جہاں پناہ ہیں، میرے محبوب، میں نہیں، میں پھوپھو کی طرح حکومت کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔“

میں نے اپنی ملکہ کی بند مٹھیاں کھولیں اور شاہی مہر دوبارہ اُسے تھما دی۔ ”ہر شاہ کو دو آنکھوں، ایک دماغ اور ایک دل کی ضرورت بھی ہوتی ہے اور تم ہماری تینوں ضرورتیں پوری کرو گی اور ہمیں بتاؤ گی کہ کیا صحیح ہے کیا غلط؟“

”اگر آپ توجہ فرمائیں تو۔۔۔“ اُس نے غمگین سے انداز میں جواب دیا۔

مہرازا، ارجمند نے اپنے قریب ہی میز پر رکھ دی۔ ملکہ نور جہاں جب کمرے میں داخل ہوئیں تو اُن کی پہلی نظر اُس پر پڑی اور وہ وہیں ٹھک گئیں، پھر انہوں نے سنبھل کر مجھے اور ملکہ ارجمند کو تعظیم دی۔

آہ! وقت بھی کتنا ظالم ہے۔ کل تک دوسروں کو اپنے سامنے ٹھکانے والی جلیل القدر ملکہ آج ہمارے سامنے۔۔۔ سرنگوں تھیں۔

ملکہ ارجمند فوری طور پر اٹھ کر آگے بڑھی اور اُس نے اپنی پھوپھو کو گلے لگالیا مگر جیسے ہی اُس نے ملکہ کو الگ کیا وہ دوبارہ کورنش بجالانے کے لیے جھٹک گئیں۔

”جہاں پناہ!“ ملکہ کی سرسراہٹ ہوئی آواز سنائی دی۔ ”نور جہاں۔۔۔ مہر النساء مغلور

دیوان عام میں میری تاج پوشی ہوئی۔ میری ارجمند مہین پر دے کے عقب سے تقریب دیکھ رہی تھی۔ دربار میں امراء معززین اور روساء تمام ہی لوگ حاضر تھے۔ ان میں میواڑ کا۔۔۔ سودیا کرن سنگھ اور مغلوں کا تجربہ کار سپہ سالار۔۔۔ مہابت خان بھی تھا۔

گزشتہ چند ماہ میں مہابت خان اور میرے والد بزرگوار کے مابین ناچاقیاں بڑھ گئی تھیں اور مہابت خان ایک روز پاگلوں کی مانند شہنشاہ کی خیمہ گاہ میں جا گھسنا تھا۔ اُس نے پہلے بادشاہ اور پھر ملکہ نور جہاں کو اپنا قیدی بنالیا۔ اُس کا اس سے کیا مقصد تھا یہ میں نہیں جانتا، لیکن مغلوں کا اقتدار ایک دن مکمل طور پر اُس کی مٹھی میں بند رہا، حتیٰ کہ ملکہ نور جہاں کسی طرح فرار ہونے میں کامیاب ہو گئیں۔ ملکہ نے بذات خود مغل سپاہ کی قیادت کی اور اس کے باوجود کہ۔۔۔ مہابت خان ایک تجربہ کار سپہ سالار تھا فتح ملکہ نور جہاں کا مقدر ٹھہری۔ جنگ میں بہت سے لوگ مارے گئے۔۔۔ اور مہابت خان فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔

میں نے مہابت خان کو طلب کر لیا۔ وہ ایک بہادر شخص تھا اور میرے دل میں اُس کی بہت قدر تھی۔ شاید اُس کا اندازہ تھا کہ میں گزرے ہوئے دنوں کا حساب اُس سے لوں گا، لیکن میں نے اُسے مغل سپاہ کا سپہ سالار اعلیٰ مقرر کر دیا۔

اس کے بعد رکھی تقریبات کا آغاز ہوا۔۔۔ اور امراء سلطنت نے نذرانے پیش کرنے شروع کیے۔ وزیراعظم نے ایک ہفتے کے جشن تاج پوشی کا اعلان کیا۔ جس کی میں نے فوری طور پر منظوری دے دی۔

ایک شہنشاہ دوستوں کو کبھی فراموش نہیں کرتا۔ چنانچہ میں نے ہر ایک کو نوازا۔ ارجمند کے والد کو میں نے میر سامان کے عہدے پر فائز کر دیا اور سابق ملکہ نور جہاں کو آگرہ پہنچ کر اپنے حضور حاضر ہونے کا پیغام بھیجا۔ وہ بلاتا خیر آ گئیں۔ میں نے اور ملکہ ارجمند نے جھروکے میں اُن کا استقبال کیا۔

اُس رات ملکہ نور جہاں کے پہنچنے سے قبل میں نے اپنی ملکہ کو سلطنت مغلیہ کی طاقت ور ترین اور قیمتی ترین شے تحفے میں پیش کی۔ اُس نے طلائی صندوق لے کر گود میں رکھ لیا اور پھر ٹوٹنے والی نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی۔

”اسے کھولو ملکہ!“

کے عظیم شہنشاہ اور ان کی ملکہ کے حضور آداب بجالاتی ہے۔“

میں خاموشی سے ان کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتا رہا۔

”ہماری خواہش تھی کہ ہم ظل الہی کی رحلت کے بعد لاہور میں ہی رہ جائیں، لیکن

جہاں پناہ کا حکم ٹالا نہیں جاسکتا تھا۔“

ارجمند نے اپنی پھوپھو کو اپنے برابر بٹھالیا۔

”ہماری خواہش تھی کہ رحلت سے پہلے ہم اپنے والد بزرگوار کا دیدار کر لیتے۔“ میں

نے سنبھل کر کہا۔ ”مگر شاید اللہ تعالیٰ کو یہ منظور نہ ہوا۔“

”اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔“ ملکہ نور جہاں نے دعائیہ انداز میں کہا۔ ”ہم لاہور میں

ظل الہی کے شایان شان مقبرہ تعمیر کرانا چاہتے ہیں۔“

”اور کچھ؟“

”یہ باتیں بعد میں بھی ہو سکتی ہیں جہاں پناہ!“ ملکہ ارجمند نے دخل اندازی کی۔ اُسے

میرے لہجے کی تلخی کا اندازہ ہو گیا تھا۔ ”لاڈلی کیسی ہے پھوپھو؟“

”سوگوار ہے ملکہ عالیہ!“ ملکہ نور جہاں نے جواب دیا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے ارجمند کو

ملکہ کہنے کے بجائے وہ کوئی کڑوی گولی نگل رہی ہوں۔ ”شہریار کے انتقال نے اُسے غم زدہ

کر دیا ہے۔“

”آپ نے صرف قوت اور طاقت کے لیے لاڈلی کی۔۔۔ شادی اُس سے کی تھی۔“

”آج آپ بھی اُسی مقام پر فائز ہیں ملکہ عالیہ جہاں ہم کل تک تھے۔“ ملکہ نور جہاں

نے افسردگی سے کہا۔ ”ہم اپنے ضمیر کے مجرم قطعاً نہیں، جہاں تک ممکن ہو سکا ہم نے بہتر فیصلے

کیے اور بہتر انداز میں اُن پر عمل درآمد کیا۔“

ملکہ نور جہاں خاموش ہو گئیں۔ ہم دونوں میں سے کسی نے بھی فوری طور پر کچھ نہیں

کہا۔ ارجمند کچھ دیر اپنی پھوپھو کا جائزہ لیتی رہی، پھر مخاطب ہوئی۔ ”آپ کو لاہور میں ظل

الہی کا ایک شاندار مقبرہ تعمیر کرانے کی اجازت دی جاتی ہے۔“

ملکہ نے میری طرف نہیں دیکھا کیونکہ اپنے احکامات کی تکمیل کے لیے اُسے میری

اجازت کی ضرورت نہ تھی۔ سو اپنی محبوب کی وجہ سے میں نے ملکہ نور جہاں کو معاف کر دیا۔

ooo

لیکن بعض لوگ ایسے تھے جنہیں میں کسی طور بھی معاف یا فراموش نہ کر سکتا تھا۔ میں

نے اگلی صبح مہابت خان کو دیوان خاص میں طلب کر لیا۔

”مندو کے جنگلات میں جاؤ اور ارجمند لال نام کے ایک ڈاکو کو تلاش کرو۔“ میں نے

مہابت خان کو حکم دیا۔ ”اُسے شہنشاہ شاہ جہاں کی طرف سے محبتوں کا پیغام دینا اور کہنا کہ

اُس کی وفاداریوں کے صلے میں اُس کی چھٹی ہوئی اراضی واپس دی جا رہی ہے۔“

وزیر میرے احکامات کو تحریر کرتا جا رہا تھا۔

”اور پھر تم میں ہزار سپاہ کے ساتھ بنگال کا رخ کرو گے۔ ہنگلی کے کنارے تمہیں ایک

فرنگی قلعہ ملے گا۔ صفحہ ہستی سے اس قلعے کا نام و نشان مٹا دو اور جنگ سے جو لوگ بچ رہیں

انہیں پایہ زنجیر ہمارے حضور پیش کرو۔ وہاں سُرخ داڑھی والا ایک پادری ہوگا، اُس کی ہمیں

زندہ ضرورت ہے۔“

وزیر نے فرمان تیار کر لیے اور ملکہ ارجمند بانو نے اُن پر منظوری کی شاہی مہر ثبت کر

دی۔

ooo

عیسیٰ پلٹا، اُسے ایک پہرے دار نے پکارا تھا، جس کے قریب دو سپاہی کھڑے تھے۔
ایک سپاہی نے ہاتھوں میں سونے کا پیالہ تھام رکھا تھا۔
”یہ کیا ہے؟“ عیسیٰ نے دریافت کیا۔
”ہم شاہ جہاں سے ملاقات کے خواہش مند ہیں۔“
”جہاں پناہ کہو!“ عیسیٰ نے دُستی کی، لیکن سپاہیوں نے اُس کی بات پر کوئی توجہ نہ دی۔ مملکت میں ایک ہی جہاں پناہ ہو سکتا تھا اور وہ تھا۔۔۔ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر۔
عیسیٰ نے اُنہیں آگے جانے کی اجازت نہیں دی، لیکن وہ سینہ تانے سمان برج کی جانب بڑھ گئے۔ شہنشاہ۔۔۔ معزول شہنشاہ ایک دیوان پر نیم دراز تھا۔ شاہ نے سپاہیوں کے بجائے سونے کے پیالے کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے پر لاکھوں دوسوں نے ڈیرے ڈال دیے۔ شاہ کو اُن کی آمد پسند نہ آئی۔ اُس نے سر کو جنبش دی اور عیسیٰ آگے بڑھ آیا۔
”باہر جاؤ!“ اُس نے سپاہیوں کو حکم دیا، لیکن فوراً ہی ایک تلوار کی نوک اُس کے سینے سے آگئی۔

”تم ہمیں حکم دینے والے کون ہوتے ہو؟ شہنشاہ عالمگیر نے اپنے والد بزرگوار کے لیے ایک تحفہ روانہ فرمایا ہے۔“ ایک سپاہی نے تیز لہجے میں کہا۔ ”یہ جہاں پناہ کے والد بزرگوار کی محبتیں ہیں۔“

سپاہی نے پیالہ شاہ جہاں کے سامنے کر کے خوان۔۔۔ ہٹا دیا۔
شہزادہ دارا شکوہ کا سراپنی بے نور آنکھوں سے اپنے والد کو گھور رہا تھا۔

ooo

1069ھ (1659ء)

ممتاز محل

موت کا سایا ہنوز شہزادہ دارا کے سر پر مسلط تھا۔ شہزادہ اورنگ زیب نے شہزادہ دارا شکوہ سے دوبارہ ملاقات نہیں کی تھی اور پھر ایک روز شہزادہ اورنگ زیب نے اپنے احکامات کی تکمیل کا حکم دے دیا۔
شہزادہ دارا کو ایک بند کمرے میں پہنچا دیا گیا۔۔۔ تین محافظ اُس کے ہمراہ تھے۔ جلا د نے شہزادہ اورنگ زیب کی طرف دیکھا اور شہزادے نے زبان سے کچھ کہے بغیر سر کو اٹھاتی انداز میں جنبش دے دی۔

ooo

بار بات چیت اسی طرح شروع ہوتی اور اسی نکتے پر ختم ہوتی۔

ہر دفعہ جب شہنشاہ اورنگ زیب کا خط موصول ہوتا، شہنشاہ شاہ جہاں مینا مسجد کا رخ کرتا۔ اگر وہ شہزادہ اورنگ زیب کی موت کی دعائیں مانگتا تھا تو ان کا اب تک کوئی جواب نہ آیا تھا۔۔۔ اور پھر ایک دن عیسیٰ، شاہ کو جگانے کے لیے اندر آیا۔۔۔ دعاؤں کا جواب آ گیا تھا، لیکن پتا غلط تھا۔

شہنشاہ شاہ جہاں کی ساکت چتلیاں یک ٹک تاج محل کی بلند و بالا چھت کی طرف نگراں تھیں۔ عیسیٰ نے نمناک آنکھوں سے اپنے محروم شاہ کو خراج عقیدت پیش کیا۔ کھلی آنکھیں بند کیں اور شہزادی جہاں آرا کے کمرے کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

ooo

1076ھ (1666ء)

برسوں پر برس گزرتے رہے اور وقت اپنی دھول انسانوں کے چہروں پر ملتا رہا۔ لال قلعہ جس کی دیواروں سے کبھی روشنیاں پھوٹی تھیں، اب بے نور محسوس ہوتا تھا، جن کمروں اور غلام گردشوں میں زندگی قہقہے لگاتی تھی۔۔۔ اب وہاں ویرانیاں بال کھولے نوحہ کنائیں تھیں۔

شہنشاہ شاہ جہاں کو پتھر کا قیدی بنا دیا گیا۔ اُس کے لیے اب زندگی فضول سی شے کے علاوہ کچھ نہ رہ گئی تھی۔ اُس کی محبوبہ اور بیٹے اُس کا ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ صرف ایک عیسیٰ رہ گیا تھا، جو اُسے روزانہ آئین اکبری یا بابر نامہ یا جہانگیر نامہ سے اقتباسات سنایا کرتا تھا۔ کبھی کبھار وہ اپنے۔۔۔ شہنشاہ بیٹے کے خطوط بھی سناتا۔

”شہزادہ اورنگ زیب آپ سے معافی کے خواستگار ہیں جہاں پناہ!“ عیسیٰ آ کر شہنشاہ کو کہتا۔

”ہم سے!“ شاہ کے لہجے میں حیرت ہوتی۔ ”آٹھ برس بیت گئے اور ایک شہنشاہ اب تک ہم جیسے بوڑھے آدمی سے معافی کا خواستگار ہے۔“

”آپ نے اب تک انہیں معاف نہیں فرمایا جہاں پناہ!“

”ہم اُسے کیسے معاف کر سکتے ہیں؟ اُس نے ہمارے دو بیٹوں کی جان لی اور تیسرے کو قید خانے میں ڈال دیا۔ ایک باپ اُس کے جرم کس طرح فراموش کر دے۔ ملکہ ارجمند کے بیٹے اپنی اپنی قبروں میں اور اُس کا شوہر قید خانے میں ہے۔ اُس کے لیے کوئی معافی نہیں۔“

تاج محل بھاری قدموں کی آواز سے گونج اٹھا۔ رات کے اندھیرے میں ایک سایا بیکاد
تنہا مرکزی ہال کی طرف بڑھ رہا تھا۔ غلام گردش میں چلنے والے ہنڈولوں کی روشنی میں اُس
کے لباس پر جڑے ہیرے جواہرات چمک رہے تھے۔ اُس کے ساتھ کوئی غلام یا کوئی ساتھی
نہ تھا۔

سائے نے ہال میں داخل ہونے سے پہلے پاپوش اتارے اور نیچے پاؤں سامنے بنی
ہوئی دو قبروں کی طرف بڑھا۔ سب سے پہلے وہ ملکہ ممتاز محل کی قبر کے سامنے گھٹنوں کے بل
بیٹھا۔ اُس نے پہلے ٹھنڈے سنگ مرمر سے اپنا ماتھا اور لب مَس کیے اور پھر اُس نے شہنشاہ
شاہ جہاں کی قبر کے سامنے یہی کارروائی دہرائی۔ سایا بہت دیر وہاں بیٹھا دونوں قبروں کے
سامنے ہاتھ باندھے روتا رہا اور پھر اٹھ کر واپسی کے لیے چل دیا۔

دیواروں پر لگے ہوئے چراغوں نے اس بار سائے کو شناخت کر لیا تھا۔
وہ مغلوں کی عظیم قلمرو کا وانی شہنشاہ ابو محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر تھا۔ تھوڑی دیر
بعد ہی سایا پھر اندھیرے کا حصہ بن چکا تھا۔

ooo

1037ھ (1637ء)

ارجمند بانو

اپنے محبوب کی تخت نشینی کے پہلے ہی ماہ میں دوبارہ بیمار پڑ گئی۔ باہر جشن تاج پوشی منایا
جار ہا تھا اور میں کمرے میں بستر پر لیٹی اپنے رب سے صحت یابی کی دعائیں مانگ رہی تھی۔

روز صبح میں اٹھتی اور مسہری پر لیٹی درود یوار کو گھورتی رہتی، جانے کب اسی عالم میں
نیند آ جاتی، پھر کنیزیں آ کر مجھے جگا دیتیں اور معمولات دوبارہ شروع ہو جاتے مگر اس روز
مجھے کسی کنیز نے نہیں جگایا، بلکہ وہ ایک جانا پہچانا لُٹس تھا۔ میں نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔
شہنشاہ شاہ جہاں مجھ پر جھکے ہوئے تھے۔

”شاہی طبیب نے تمہیں مکمل آرام کی ہدایت کی ہے۔“ جہاں پناہ نے سرگوشی میں
کہا۔ ”کسی کو تمہیں پریشان کرنے کی اجازت نہیں۔“

مایوسی میرے چہرے پر پھیل گئی۔

”میں نے آپ کی بادشاہت کے لیے کتنا انتظار کیا اور اب جب یہ سب کچھ ملا تو
افسوس کہ میں اس سے لطف نہیں اٹھا سکتی۔ بلکہ مجھے دن رات اس کمرے میں قید رہنا پڑتا
ہے۔“

”تم جلد صحت یاب ہو جاؤ گی ملکہ!“

”نوماہ پوری زندگی کے برابر ہوتے ہیں جہاں پناہ؟“ میں نے دھیرے سے کہا۔

”کیا؟“ شہنشاہ نے حیرت سے پوچھا۔

طبیعت کچھ سنبھلی تو مجھے بھی احساس ہوا کہ میں اس دنیا میں رہتی ہوں۔ مجھے اب سب کچھ پہلے سے مختلف نظر آنے لگا تھا۔ مختلف چھت، مختلف آوازیں، مختلف۔۔۔ سرزمین، مختلف چہرے اور مختلف خوشبوئیں میرے دل و دماغ پر چھا رہی تھیں۔ گھنے جنگلوں اور لہو و دق صحراؤں میں گزارے ہوئے زندگی کے کڑے دن ختم ہو چکے تھے اور ہر جانب آرام و سکون کی روپہلی چاندنی پھیل گئی تھی۔

جیس پور، مندو، برہان پور اور جمنہ، گنگا اور تپتی کے کنارے گزرے ہوئے کشن دن ماضی کی گرد تلے دفن ہو چکے تھے اور اب ایک نیا اور تابناک مستقبل ہمارے ہاتھوں کی پہنچ میں تھا۔ کینروں نے مجھے غسل دیا۔ ملکہ کی پوشاک پہنائی اور خوشبوؤں میں غرق کر دیا، پھر یہ روزانہ ہونے لگا۔ کینروں اور خادماؤں کے پردے کے پردے میری جنبش ابرو کے منتظر رہتے۔ میں اس سے پہلے کبھی محل میں نہیں رہی تھی۔ اس لیے شروع شروع میں مجھے یہاں کے ماحول سے بڑی کوفت ہوئی۔ میرے آنے جانے کے اوقات پر نظر رکھی جاتی جو کچھ میرے منہ سے نکلتا، بازگشت کی مانند مجھ تک لوٹ آتا اور ہر وقت مجھے مختلف آداب کا خیال رکھنا پڑتا کیونکہ ایک مغل ملکہ کو بہر حال دوسری عورتوں سے ممتاز نظر آتا تھا۔

شہنشاہ جہانگیر کی لونڈیاں اب بھی اپنے بے شمار خدمت گاروں کے ہمراہ محل میں مقیم تھیں۔ حرم کی حفاظت ہنوز انہی تار عورتوں کی ذمہ داری تھی، لیکن میرے ساتھ ان کے رویے میں زمین آسمان کا فرق آ گیا تھا۔

معمول سے ہٹ کر میں باغ میں واقع گل آباد میں سوتی اگر میں تیموری نسل سے ہوتی تو بھی کبھی چھت کے نیچے نہ سو سکتی تھی۔ اپنی شہنشاہیت کے پہلے ہی مہینے، میرے محبوب نے محل میں رد و بدل شروع کر دیا۔ وہ ایک عظیم شہنشاہ کی عظیم یادگاریں چھوڑ کر جانا چاہتے تھے۔ دیوان عام کی لکڑی کی چھت ہٹا کر سرخ پتھر کی نئی چھت ڈالی گئی، جسے ستونوں کے سہارے کھڑا کیا گیا۔ محل کے دوسرے حصوں میں بھی جہاں پناہ کے۔۔۔ پسندیدہ سفید پتھر

”کچھ نہیں، جہاں پناہ!“ میں فوراً ٹال گئی۔ ”مجھے کوئی تبدیلی محسوس نہیں ہو رہی، مجھے لگتا ہے کہ میں اب بھی وہی پہلے والی شہزادی ہوں۔“

”نہیں۔“ شہنشاہ نے فوراً انکار میں سر ہلایا۔ ”تم اب شہزادی ارجمند بانو نہیں، بلکہ ہمارے دل، رُوح اور ہماری بادشاہت کی ملکہ ہو۔ تم ملکہ ممتاز محل ہو۔“

”یہ ایک خوب صورت نام ہے جہاں پناہ!“ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ”ممتاز محل، مگر میرے کانوں اور زبان کے لیے یہ اجنبی ہے۔ اسے دوسروں کو پکارنے دیں میرے محبوب! آپ کے لیے میں وہی رہنا چاہتی ہوں جو پہلے تھی۔۔۔ ارجمند۔۔۔ میں وہی عورت ہوں، جو آج سے پہلے تھی۔“

”ایسا ہی ہوگا جان خرم!“ جہاں پناہ نے میرے بال سہلائے۔ ”لیکن دنیا تمہیں آج سے ملکہ ممتاز محل کے نام سے پکارے اور یاد کرے گی۔“

ooo

تمہیری

آٹھویں مہینے مہابت خان بنگال سے لوٹ آیا۔ وہ اپنے ساتھ فرنگی قلعے کی لڑائی میں بچ جانے والے قیدی بھی لایا تھا، جو پابہ زنجیر تھے۔ گرمیوں کا موسم تھا اور حدت بے پناہ لیکن مجھے ان پابہ زنجیر لوگوں سے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ انہوں نے صرف میری بیماری کے دنوں میں ہی میرے ساتھ زیادتی نہ کی تھی بلکہ مجھے وہ دن اب بھی یاد تھا، جب دو فرنگیوں نے میرا نقاب نوچا تھا۔

قیدی دو ہزار کوس کا فاصلہ پابہ زنجیر طے کر کے آگرہ پہنچے تھے۔ مہابت خان نے انہیں باہر چھوڑا اور خود جہاں پناہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔

”میں نے جہاں پناہ کے حکم کی تعمیل میں ارجن لال نامی ڈاکو کو ڈھونڈ نکالا ہے۔“ اُس نے جہاں پناہ کو بتایا۔ ”اس نے جہاں پناہ کو اس ملک کا بلا شرکت غیرے مالک تسلیم کرتے ہوئے اپنی محبتوں اور نیک تمناؤں کا پیغام بھجوایا ہے۔“

جہاں پناہ خاموشی سے اُسے سن رہے تھے۔

”میں جہاں پناہ کے مجرم پادری کو بھی زندہ لے آیا ہوں، لیکن قلعے کا سالار اعلیٰ جنگ میں مارا گیا۔“

”اور کتنے افراد جنگ میں کام آئے؟“ جہاں پناہ نے دریافت کیا۔

”چند سو۔“ مہابت خان نے جواب دیا۔ ”بچنے والوں کو میں اپنے ہمراہ لے آیا ہوں۔ ان میں بعض عیسائی مبلغین بھی شامل ہیں، جنہیں میں پیچھے چھوڑ کر یہ خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا کہ وہ عیسائیت کا پرچار کریں۔“

قیدی محل سے باہر کھلے میدان میں کڑکتی دھوپ میں کھڑے تھے۔ اُن میں سے کوئی محل کی بلند یوں کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ انہیں صرف اپنی موت کا انتظار تھا۔

یعنی سنگ مرمر کی تنصیب کا کام شروع ہو گیا۔ دیوان خاص میں بھی انقلابی تبدیلیاں ہوئیں۔ شہنشاہ جہانگیر کے عہد میں یہاں روشنیاں نا کافی ہوتی تھیں، لیکن اب یہ رنگ برنگی روشنیوں سے جگمگا اٹھاتا تھا۔

جہاں پناہ سورج طلوع ہونے سے قبل بیدار ہوتے اور درپچہ دیدار تشریف لے جاتے اور زنجیر عدل ہلانے والوں کی داد رسی فرماتے۔ جس کے بعد وہ کچھ دیر میرے ساتھ رہتے اور پھر دیوانِ عام میں مختلف درخواستیں وصول کرتے اور اُن پر احکامات جاری فرماتے۔ ہلکا سا کھانا کھانے کے بعد وہ دیوانِ خاص میں اپنے امراء اور وزراء سے ملاقات کرتے اور سلطنت کے مختلف امور پر تبادلہ خیال کرتے۔

شام کا وقت وہ میری معیت میں گزارتے۔ کچھ دیر ہم میدان میں ہاتھیوں کی لڑائی ملاحظہ کرتے اور پھر گل آباد آ جاتے۔ وہاں درباری نغمہ خواں اور رقاص ہمارا جی بہلاتے۔ اس کے بعد رات کا کھانا نوش کیا جاتا، جس میں ہمارے بچے، دیگر رشتے دار اور دوست احباب بھی شریک ہوتے۔

ان مصروفیات سے جو وقت بچ رہتا وہ جہاں پناہ عمارتوں کی تعمیر کے معاملات میں صرف کرتے۔ انہوں نے دہلی ملتان، لاہور، میواڑ، بے پور حتیٰ کہ ترکی، اصفہان اور سمرقند سے بھی ماہرین تعمیرات کو آگرہ طلب کر لیا تھا۔ میری اپنی سرگرمیاں جہاں پناہ سے قطعی مختلف تھیں۔

اب میرے پاس بے حساب دولت تھی۔ محل کے مرکزی۔۔۔ دروازے کے قریب سونے کے سکوں سے بھری ہوئی ایک بوری ہر وقت موجود رہتی۔ میں روزانہ اس میں سے ضرورت مندوں کو دام تقسیم کرتی۔ شام ڈھلے ایک لاکھ سکوں کی بوری خالی ہو جاتی اور اگلی صبح مجھے پھر لبالب بھری ملتی۔

جہاں پناہ عمارتیں تعمیر کر رہے تھے اور میں یتیم خانے، مکتب یا شفا خانے قائم کر رہی تھی۔ ہر ہفتے میں مغل سپاہ کے جھرمٹ میں ان مکاتیب، یتیم خانوں اور شفا خانوں کے معائنے کو جاتی اور اُن کے انتظام و انصرام سے متعلق ضروری احکامات جاری کرتی۔

”ہم چاہیں تو ابھی تمہارا سرتن سے جدا کر سکتے ہیں کیونکہ تم نے جو سلوک ہمارے ساتھ کیا تھا اُس کی وجہ سے ہمیں یقین ہے کہ مرتے وقت جنت کے فرشتے تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کو تیار نہ ہوں گے۔“

”ایسا ضرور ہوگا جہاں پناہ؟“

”لیکن ابھی نہیں۔“ شہنشاہ نے جواب دیا۔ ”تمہیں دو سال قید کی سزا بھگتنا ہوگی، جس کے دوران روزانہ تم پر کوڑے برسائے جائیں گے۔ قید کے اختتام پر تمہیں مغلوں کی سلطنت کی سرحدوں سے دُور نکل جانا ہوگا۔ بہ صورت دیگر مغل سپاہ۔۔۔“

شہنشاہ نے جملہ ادھورا چھوڑ کر قیدیوں کو لے جانے کا اشارہ کر دیا۔

○○○

”انہیں ایک موقع دو مہابت خان!“ جہاں پناہ کی آواز ابھری۔ ”وہ اپنا مذہب ترک کر دیں یا مرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔“

وزیر نے قیدیوں کو شاہی فرمان پڑھ کر سنایا۔ مرد اور عورتیں حیران رہ گئے۔ اُن کے ذہن میں فوری طور پر یہ سوچ ابھری کہ عیسائی خدا انہیں قید ہونے سے نہ بچا سکا تو اُس کی راہ پر چلنے سے کیا فائدہ؟ چنانچہ تمام عیسائی دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے صرف عیسائی پادری نے شہنشاہ کی پیش کش قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

پادری کو جہاں پناہ کے حضور پیش کیا گیا۔

”کیا ہم تمہیں یاد ہیں؟“ شہنشاہ شاہ جہاں نے اُس سے دریافت کیا۔

”ہاں۔“ پادری نے ہر سکون انداز میں جواب دیا۔ ”مجھے یاد ہے کہ آپ کی بے حرمتی

کی۔۔۔“

”لیکن تمہاری نہیں کی گئی۔“ جہاں پناہ نے تیز لہجے میں اُس کا جملہ منقطع کر دیا۔ ”ہم نے تمہاری مقدس کتاب کا مطالعہ کیا ہے، جس میں یہ بات واضح طور پر درج ہے کہ انسان کو۔۔۔ ایک دوسرے کے کام آنا چاہیے۔ ہماری طرح تمہارا اعتقاد بھی بعد از موت، زندگی اور جنت پر ہے اور تم بھی اس بات پر یقین رکھتے ہو کہ انسان کو اُس کے اعمال کی جزا و سزا ملے گی۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ تم مرنے کے بعد جنت میں داخل کیے جاؤ گے؟“

”جی جہاں پناہ!“ پادری نے جواب دیا۔ ”میں نے ہمیشہ خدا کے احکامات کی تعمیل کی ہے اور اسی کی عبادت کی ہے۔ خدا یقیناً مجھے اُس کی جزا دے گا۔“

”تمہیں صرف اپنی جزاؤں سے غرض ہے۔“ شہنشاہ نے کہا۔ ”تم خدا سے محبت ضرور کرتے ہو، اُس کے انسانوں سے نہیں جبکہ تمہارے خدا نے بلا تخصیص تمام لوگوں سے محبت کرنے کا درس دیا ہے۔“

”صرف اُن سے جو اُس کے احکامات کی پابندی کریں۔“

”کیا تمہیں یقین ہے کہ تمہارا خدا تمہیں ہمارے ہاتھوں مرنے سے بچا لے گا۔“

شہنشاہ نے سوال کیا۔

”مجھے اپنے دل کی گہرائیوں سے یقین ہے۔“ پادری نے سر اٹھا کر جواب دیا۔

بچائے گئے تھے۔ اُس کی چھت اور ستونوں کو سونے اور ہیرے جواہرات سے مزین کیا گیا تھا، لیکن سفر کی سوتیلی بہنیں اپنی جگہ تھیں۔ شاہی طبیب میرے ساتھ سفر کر رہا تھا اور اُسے ہدایت تھی کہ کسی بھی ہنگامی صورت حال میں قافلے کو رکنے کے احکامات دے۔ اُس کے ان احکامات کو شاہی فرمان کا درجہ حاصل ہوتا۔

برہان پور تک کا سفر بخیر و خوبی گزر گیا۔ موسم گرما کے وسط میں تخلیق کے وقت میری حالت بگڑ گئی۔ نقاہت نے میرے پورے جسم پر غلبہ پالیا اور میری چیخوں سے پورا محل گونج اٹھا۔ کنیریں اور خادما میں وحشی ہر نیوں کی مانند ادھر ادھر دوڑ رہی تھیں۔

”جہاں پناہ کہاں ہیں؟“ میں نے درد سے بے چین ہو کر عیسیٰ سے دریافت کیا۔
”جہاں پناہ آسی گڑھ میں ہیں۔“

”فوری طور پر اُنہیں برہان پور بلواؤ۔“ میری آواز اور لہجے نے اُسے خوفزدہ کر دیا تھا۔ اُس نے فوراً باہر کی سمت دوڑ لگا دی۔

بے ہوشی اور نیم بے ہوشی کے عالم میں، میں نے قدسیہ کو جنم دیا اور پھر ہوش و حواس سے یکسر بیگانہ ہو گئی۔ جانے کتنی دیر یونہی گزر گئی۔ جب آنکھ کھلی تو عیسیٰ میرے پاس موجود تھا۔

”شہزادی کی آمد مبارک ہو آغاچی!“

”میرے محبوب کہاں ہیں؟“ میں نے عیسیٰ کا جملہ نظر انداز کر دیا۔ ویسے مجھے بیٹی کی پیدائش سے بے حد خوشی ہوئی تھی۔ ”میں بُری طرح تھک گئی ہوں عیسیٰ!“
”تم سو جاؤ آغاچی!! جہاں پناہ تشریف لارہے ہیں۔ جونہی اُن کی آمد ہوئی میں تمہیں جگالوں گا۔“

”نہیں، میں سونا نہیں چاہتی۔“ میں نے نحیف آواز میں کہا۔ ”عیسیٰ!“ میں نے رُک کر دوبارہ اُسے مخاطب کیا۔ ”تم بچپن سے میرے ساتھ رہے ہو، میں تمہاری کمی ہمیشہ محسوس کروں گی۔“

”لیکن میں جا تو نہیں رہا۔“ اُس نے حیرت سے کہا اور میرا ہاتھ چھوا۔ ”تم بالکل ٹھنڈی ہو رہی ہو آغاچی!“

جب شہنشاہ میرے پاس تشریف لائے میں اُس وقت جھروکے میں تھی۔ وہ خاصے پریشان دکھائی دے رہے تھے۔

”ہمیں افسوس ہے کہ مغلوں کی ساری قوت ان بے مصرف جنگوں کی نذر ہو رہی ہے۔“ جہاں پناہ نے بات شروع کی۔ ”ہمارا خیال تھا کہ اب امن اور سکون سے رہا جائے گا، لیکن دکن کے باغیوں نے سرحدوں پر شورش برپا کر رکھی ہے۔ اس لیے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ بہ نفس نفیس جنوب کی جانب کوچ کریں اور اپنے ہاتھوں اُن کا قلع قمع کریں۔“ اُنہوں نے میرا ہاتھ اپنی گرفت میں لے کر لبوں سے چھوا۔ ”کیا تم ہمارے ہمراہ چلنا پسند کرو گی ملکہ؟“

”حکیم نے مجھے سفر کرنے سے سختی کے ساتھ منع کیا ہے جہاں پناہ! اور میں جانتی ہوں کہ سفر خاصا کٹھن ہوگا۔“

”ہمیں دکن جا کر واپسی میں ایک برس لگ سکتا ہے اور ہم تم سے اتنی طویل جدائی برداشت نہیں کر پائیں گے۔“ شہنشاہ نے ایک طویل سانس لی۔ ”اور پھر اب ہم اپنے والد کے بد نصیب بیٹے نہیں، اس سلطنت کے شہنشاہ ہیں۔ دوران سفر تمہارا ہر ممکن خیال رکھا جائے گا۔“

”ٹھیک ہے جہاں پناہ! میرا منزل کو فرمان جاری کریں کہ میرے لیے ایک انتہائی آرام دہ رتھ تیار کیا جائے۔“

”ایسا ہی ہوگا جان خرم۔“

میرا منزل نے حکم کی فوری تعمیل کی اور ایسا رتھ تیار کیا جو ایک ملکہ کے شایان شان ہو سکتا تھا۔ اس کا حجم ایک بڑے کمرے کے برابر تھا اور اُس میں نرم گدیلے اور نفیس ایرانی قالین

کا جسم نہیں ہے جہاں پناہ۔۔۔ وہ ایک صحرا میں پڑا ہے۔۔۔ ایک بچہ کی طرح۔۔۔
وہ۔۔۔۔۔

”ہند سکون رہو جان! یہ محض ایک خواب ہے۔“ انہوں نے میرا ہاتھ مضبوطی سے قلم لیا۔ میں نے دور بہت دور سے اُن کی آواز سنی۔ وہ شاہی طبیب کو پکار رہے تھے، بھرپاؤں کی آواز آنے لگی، لیکن ایک لفظ بھی میری سمجھ میں نہ آ سکا نیند مجھ پر غلبہ پارہی تھی اور میں بدستور اُس سے لڑ۔۔۔ رہی تھی۔

”جان ارجمند!“ میرے حلق سے کراہی نکلی۔ ”میں جلد ہی سو جاؤں گی۔ اب فیہ میری برداشت سے باہر ہوتی جا رہی ہے۔“ شہنشاہ کا چہرہ میرے اور قریب آ گیا۔ ”میں سونے سے پہلے آپ سے ایک وعدہ لینا چاہتی ہوں جان ارجمند۔“
”جو ملکہ کا حکم ہو۔“

000

”مجھے بھی ٹھنڈک کا احساس ہو رہا ہے۔ کیا انہوں نے مجھے غسل دیا ہے۔“
”نہیں، آغاچی! طبیب کا خیال ہے کہ صبح تک تمہاری حالت برقرار رہے گی۔“
”اللہ کرے ایسا ہی ہو۔“ میں نے اپنی پلکیں کھولتے ہوئے جواب دیا، جو زبردستی بند ہوتی جا رہی تھیں۔ ”مجھ سے ایک وعدہ کرو عیسیٰ! تم ہمیشہ میرے محبوب کے ساتھ رہو گے۔“
”میں وعدہ کرتا ہوں، تمہارے ساتھ رہنے کا بھی آغاچی!“
”ہاں، میرے ساتھ رہنے کا بھی، لیکن ہمیشہ میرے محبوب کے ساتھ ہی رہنا۔“
میں نے محسوس کیا کہ وہ باہر جا رہا ہے۔
”مجھے تنہا چھوڑ کر مت جاؤ۔“ مجھے یوں لگ رہا تھا، جیسے بس پوری دنیا میں اکیلی رہ گئی ہوں۔

”جہاں پناہ تشریف لا رہے ہیں۔“
شہنشاہ بوکھلائے ہوئے اندر داخل ہوئے اور گھٹنوں کے بل میرے قریب بیٹھ گئے۔
آسی گڑھ سے آنے کے دوران۔۔۔ چہرے پر پڑی ہوئی گرد آب تک جھی ہوئی تھی۔ جونہی انہوں نے میرا ہاتھ قلم میں ہند سکون ہو گئی۔
”میں آپ کو دیکھ نہیں سکتی جہاں پناہ؟“
”روشنی کی جائے۔“ جہاں پناہ نے حکم دیا۔
میں نے چراغ کی بھڑکتی لو کو قریب آتے محسوس کیا۔۔۔ لیکن جہاں پناہ کا چہرہ اب بھی مجھے دور بہت دور محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے اُن کا چہرہ خود سے قریب کر لیا۔ دکھ اور کرب کے سائے چہرے پر اُٹھ آئے تھے۔ چراغ میرے سر پر جل رہا تھا، لیکن اندھیرے تھے کہ بڑھتے ہی جا رہے تھے۔

”میرے پاس رہیں جہاں پناہ؟“
”ہم تمہارے قریب ہیں جان خرم! تمہیں کیا ہو رہا ہے؟“ شہنشاہ نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”مجھے نیند آرہی ہے جہاں پناہ!“ میں نے سرگوشی کی۔ ”آپ میرے نزدیک رہیں۔“ میری آواز تھر تھرا اٹھی۔ ”مجھے ایک اجنبی چہرہ نظر آ رہا ہے جہاں پناہ۔۔۔ لیکن اُس

الشان اور بلند و بالاتاج محل۔۔۔ جس کے مرکزی دروازے پر کھڑے نقیب کی آواز مجھے
صاف سنائی دے رہی تھی۔۔۔

”باادب، بالملاحظہ، ہوشیار شہنشاہ جاہ و چشم، عارض عطار و رقم، ثریائے اقلیم محبت غنچہ
سمن زار سطوت، کوکب کیمیتی و فرہنگ، زینت اکیلل و اورنگ، ملکہ ذیشان، نازش تخت
ہندوستان، ملکہ ممتاز محل انجمن افروز ہوتی ہیں۔۔۔“

ooo

شاہ جہاں

میری آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر اُس کی گردن پر گر رہے تھے۔ اُس کے چہرے پر
ایک درد انگیز مسکراہٹ سمٹ آئی۔ اُس نے میرا چہرہ صاف کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ اپنے
ہاتھوں کو جنبش نہ دے سکی۔

”دوبارہ شادی مت کیجئے گا، میرے محبوب۔۔۔“ اُس نے ٹوٹتی ہوئی آواز میں مجھے
مخاطب کیا۔ ”مجھ سے وعدہ کریں جان ارجمند، ورنہ میرے بیٹے اُس کے بیٹوں سے لڑتے
رہیں گے اور پوری مغل سلطنت خون کے سمندر میں ڈوب جائے گی۔۔۔ انہیں ایک
دوسرے سے محبت کا درس دیجئے گا میرے محبوب۔۔۔ اُن سے یکساں سلوک کیجئے گا جہاں
پناہ۔۔۔ وعدہ کریں۔۔۔ جہاں۔۔۔“
”ہم وعدہ کرتے ہیں جانِ خرم!“

”اور وعدہ کریں۔۔۔“ وہ سانس لینے کوڑکی۔ اُسے اب اس میں بھی وقت ہو رہی
تھی۔ اس کوشش میں اُس کا سارا لہو اُس کے چہرے پر سمٹ آیا تھا۔ وہ اپنی نیند سے لڑنے کی
کوشش کر رہی تھی۔۔۔ وعدہ کریں جہاں پناہ آپ اپنی ارجمند کو کبھی نہیں بھولیں گے۔“
”کبھی نہیں جانِ خرم۔۔۔ کبھی۔۔۔“

الفاظ میرے حلق میں اٹک گئے۔ ارجمند کی گردن ایک جانب ڈھلک گئی۔ اُس کی
آنکھیں بند ہو گئیں اور جسم ساکت ہو گیا اور مجھے یوں لگ رہا تھا، جیسے دنیا ساکت ہو گئی ہو۔
ساری کائنات سے محبت کا وجود ختم ہو گیا ہو۔

اور پھر میں نے چشم تصور میں جہان کے کنارے تاج محل کو ابھرتے دیکھا۔۔۔ عظیم